www.KitaboSunnat.com
ذکرِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
آسمانی صحیفوں میں
تالیف وترجمہ: محمد یحییٰ خان

ISBN-969-479-396-3

نام کتاب: ذکر محمد ﷺ آسمانی صحیفوں میں

تالیف وترجمہ: محمد یحییٰ خان

ناشر: آصف جاوید

برائے: نگارشات پبلشرز

24- مزنگ روڈ' لاہور

PH:0092-42-7322892 FAX:7354205

فرسٹ فلور' حبیب ایجوکیشنل سنٹر' 38- مین اردو بازار' لاہور

PH:0092-42-7240593 FAX:7354205

مطبع: المطبعۃ العربیۃ' لاہور

سال اشاعت: 2005ء

قیمت: =/220 روپے

فہرست

عرض مؤلف

مسلم دنیا میں سب سے زیادہ لٹریچر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں چھپتا ہے چھپتا رہا ہے اور چھپتا رہے گا' کیونکہ قرآن میں کہا گیا ہے "وَ رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ" (ہم نے تیرے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا ہے۔) جب تک تحریر' یعنی لکھائی پڑھائی کا کلچر وجود میں نہیں آیا تھا' انسانوں کا باہمی میل جول' زبانی الفاظ (Words of Mouth) پر منحصر تھا' اور بول چال کے ذریعے ہوتا تھا' اس وقت بھی آپ کا ذکر دنیا کے ہر فرد کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ مثلاً صرف آذان ہی کو لے لیجئے۔ مسلمان دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے اور ہر ملک اور ہر خطے اور ہر شہر میں نماز کے اوقات آگے پیچھے' یعنی مختلف اوقات میں ہوتے ہیں' ہر آذان میں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدٌ رسول اللہ کے جو الفاظ دوہرائے جاتے ہیں وہ بھی مختلف اوقات میں اور مسلسل ادا ہوتے رہتے تھے۔ گویا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا تھا جس میں آپ کا آوازہ' بلند نہ ہو رہا ہوتا۔ اور جب لکھنے لکھانے کا سلسلہ چل نکلا تو اس وقت بھی ہر لکھنے والے مسلمان نے پہل اسی پُرعظمت نام سے کی۔

چنانچہ آپؐ کی شخصیت پر اتنی کتابیں وجود میں آئیں کہ ان کا کوئی عدد وشمار ہی نہیں۔ اور آپؐ کی زندگی ہر پہلو پر لکھا گیا ہے۔ دوسرے مذاہب کی کتابوں میں آپؐ کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے جو بے حد دلچسپ معلومات کا حامل ہے۔ میں نے ان معلومات کو اکٹھا کر کے ایک نئی کتاب وجود میں لانے کی تجویز نگارشات کے مینجنگ ڈائرکٹر جناب آصف جاوید صاحب کے سامنے رکھی تو انہیں بے حد پسند آئی۔ انہوں نے کہا "پھر دیر مت کیجئے" متعدد کتابیں فراہم کر دیں' جن میں بعض اتنی پرانی ہیں کہ ان کے سرورق بھی نہیں اور نہ ان کے مصنف کا کوئی نام پتہ چلتا ہے' البتہ جس کی شان میں سب نے لکھا ہے وہ ہر کسی کی آنکھ کا تارا

ہے' چنانچہ ہم نے ''صدف'' کی ٹائپ کا خیال رکھے بغیر ''گوہر'' چننا شروع کر دیئے اور یہ کتاب وجود میں آ گئی ہے۔

ان میں سے انگلش میں لکھی گئی ایک کتاب کا ' راد اس لحاظ سے اچھوتا ہے کہ اس کے مصنف نے قرآن کو شہد سے تشبیہہ دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ شہد کی مکھی سینکڑوں پھولوں کا رس (NECTAR) چوس کر' اسے اپنے پیٹ کے اندر نصب ریفائنری میں مختلف الائشوں سے پاک کر کے اپنے چھتے میں بنے ہوئے موم کے سانچوں کے اندر بھر دیتی ہے اور لاکھوں سالوں سے یہی کرتی آئی ہے' اسی طرح قرآن نے بھی حضرت آدم سے لے کر' نبی آخرالزماں کے مبعوث ہونے تک آنے والے تمام پیغمبروں پر نازل شدہ وحی کو مختلف انسانی خیالات کی آمیزشوں سے پاک کر کے آخری نبیؐ پر اتار دیا ہے۔ قرآن میں جو کچھ موجود ہے وہ سابق پیغمبروں کی تعلیمات کا نچوڑ ہے اس میں خدا نے کچھ نیا اضافہ بھی شامل کرا دیا ہے جو اس آخری قیامت تک بنی نوع انسان کے لئے ہدایت کا منبع ہوگا۔

سابق انبیاء کے ساتھ ان کی امتوں نے کیا سلوک کیا اور آسمانی کتاب میں کیا کچھ تھا اور اسے کیا شکل دے دی گئی' اس کی تفصیلات بھی بعض کتابوں میں موجود ہیں' ہم نے ان کا خلاصہ دے دیا ہے خدا کرے کہ یہ کتاب ہمارے قارئین کے لئے مفید ثابت ہو۔

مئولف ومترجم
محمد یحییٰ خان' ایم اے' ایل ایل بی
لاہور

حرف آغاز

بِسم اللّٰہ الرحمانِ الرحیم

(اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے)

قرآن مجید، حضرت محمد ﷺ کے نسب نامے سے شروع نہیں ہوتا اور نہ ہی ارض وسما کی تخلیق کے ذکر سے ہوتا ہے جنہیں چھ دن میں پیدا کیا گیا تھا۔ یہ چونکہ خدا کی کتاب ہے، اس لئے اسی کے نام سے اس کا آغاز ہونا مناسب ترین بات ہے۔ یعنی .... ''شروع اللہ کے نام سے، جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والی ہستی ہے''۔ اس کی صفاتِ رحمانیت اور رحیمیت اس کی بلندیٔ شان اور عظمت کی مظہر ہیں اور اس کے کامل ترین ہونے کی گواہی دیتی ہیں۔ اس کی رحمانیت ہی تخلیقِ ارض وسما کا سبب بنی اور اسی کی رحیمیّت کی بدولت ہمارے اعمال کے ساتھ نیکی کے پھول لگتے ہیں اور کھلتے ہیں۔ اس طرح ہم ایک طرف اس کی فیاضیوں اور ربوبیّت سے فیض یاب ہوتے ہیں اور دوسری جانب ہمیں اس کے بے پناہ لطف وکرم کا سایہ میّسر آجاتا ہے۔

قرآن کی پہلی آیت ہمیں بتاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق، رحیم وکریم ہستی ہے، نہ کہ یونانیوں کی منتقم مزاج دیوی ("Nemesis") ہے جو کہ انسانوں کو اپنے ہاتھ میں کھلونوں کی طرح پکڑے رکھتی ہے۔ اس خالق کی شفقت اور فیاضی کے لئے عربی کا لفظ ''الرحمان'' استعمال ہوا ہے، جس کے لئے انگریزی زبان میں کوئی متبادل لفظ نہیں ہے۔ اس کے معنی نہ صرف یہ ہیں کہ وہ بے پناہ محبت اور شفقت کا خزانہ ہے بلکہ یہ بھی ہیں کہ اس کے ہم پر بے حد وحساب احسانات ہیں اور وہ ہمارے اچھے اعمال کی بھی ہمیں بہترین جزا دے گا۔ اس نے

اپنی تمام مخلوقات کو وہ تمام چیزیں عطا کی ہیں جو ان کے وجود کی بقا اور ترقی و افزائش کے لئے ضروری ہوتی ہیں مثلاً جائے قرار (Space)، قوت، وقت، ہوا، زمین، دھوپ، پانی اور متعدد دیگر نعمتیں خواہ وہ زمین کے اندر ہیں یا اوپر یا فضا میں، سب انہی کی بھلائی کے لئے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے علم اور معلومات کی تلاش و جستجو کے دوران اپنے اس محسن اور ولئی نعمت کے احسانات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے جس نے ہمیں ان صلاحیتوں سے نوازا ہے جن کے ذریعے ہم علم حاصل کرتے ہیں اور کامیابیوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

عربی زبان میں خدا کا خاص نام "اللہ" ہے، اس کے لئے بھی انگریزی زبان میں کوئی متبادل نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں مجبوراً "God" کا لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اللہ، خالقِ کائنات (Deity) کے لئے موزوں ترین نام ہے اور "God" کی بہ نسبت کہیں زیادہ جامع اور خاص ہے۔ انگریزی زبان میں "God" کبھی کبھی بلکہ اکثر اس "عظیم ترین ہستی" کے علاوہ بھی کسی برتر وجود کے لئے بول دیا جاتا ہے۔ لیکن اللہ کا لفظ مدتِ مدید سے صرف ہستیٔ باری تعالیٰ کے لئے ہی استعمال ہوتا آرہا ہے جو قادرِ مطلق اور مقتدر ترین ہستی ہے۔ اسے "لَیسَ کَمِثلِهٖ شَیئٌ" کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے نہ تو کوئی جمع (Plural) کا صیغہ ہے اور نہ مونث کا صیغہ موجود ہے۔

عالمی شہرت یافتہ شخصیت آغا خان (مرحوم) سے ان کے ایک دوست نے پوچھا "کیا یہ درست ہے کہ انڈیا کے لوگ آپ کو خدا مانتے ہیں؟" انہوں نے مزاحاً جواب دیا "انڈیا کے لوگ گائے اور بچھڑے کو خدا مان کر ان کی پوجا کرنے لگتے ہیں، مجھے خدا مان لیا تو کیا ہو جاتا ہے۔" سینٹ پال لکھتا ہے" کچھ ہوتے ہیں جنہیں خدا (Gods) کہہ دیا جاتا ہے خواہ وہ آسمان پر ہوں یا زمین پر۔ (ایسے بہت سے ہوتے ہیں جنہیں خدائی منصب پر فائز مان لیا جاتا ہے)"۔ ہمیں بائیبل میں یہ حوالہ بھی ملتا ہے کہ راکیل (حضرت یعقوب کی چھوٹی بیوی) سے مسروقہ "خدا" (Gods) برآمد کر لئے گئے۔ بائیبل اور مسیحی علاقوں میں لفظ خدا (گاڈ) کا اس طرح استعمال اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ لفظ، صرف خدائے عز و جل کے لئے ہی مخصوص نہیں، دوسروں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اللہ چونکہ خدا کا اصل نام ہے، اس لئے اس کا کسی اور زبان میں ترجمہ نہیں کیا جاتا

چاہیے' ایسا کرنا بالکل ایک بیکار کوشش ہو گی۔ جس طرح شہروں اور افراد کے ناموں کا ترجمہ نہیں کیا جاتا' اسی طرح دنیا بھر کے مسلمان خواہ ان کی مقامی زبان جو بھی ہو' اپنے معبود حقیقی کو اللہ کہتے ہیں۔ اور اپنے تمام کام شروع کرنے سے پہلے ''بسم اللہ'' (میں شروع کرتا ہوں' اللہ کے نام سے) پڑھتے ہیں اور اسے باعثِ برکت اور ذریعۂ تائید ایزدی سمجھتے ہیں۔

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ ''اللہ'' کا انگریزی یا دنیا کی کسی اور زبان میں کوئی متبادل نہیں' مختلف زبانیں بولنے والے لوگوں نے اس مالکِ حقیقی کے مختلف نام رکھے ہوئے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی نام لفظ کے وہ معنی نہیں دیتا جو ''اللہ'' کا لفظ دیتا ہے۔ وہ نام یا تو عمومی (general) ہیں یا خدا کی کسی ایک صفت کا اظہار کرتے ہیں، صرف لفظ ''اللہ'' ہی' اس کی جملہ صفات کا مظہر ہے۔ یعنی وہ ایسی ذات ہے جو برتری کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز اور ہر لحاظ سے کامل اور بے عیب ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے ''وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا'' (اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے' اس کو اچھے ناموں سے ہی پکارو......سورۃ الاعراف' آیت 180)۔ پھر آگے آتا ہے ''اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ' لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔'' (وہ اللہ ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں اس کے لئے بہترین نام ہیں.....سورۃ طٰهٰ' آیت 8)۔ لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اللہ کے لئے دیگر تمام زبانوں میں جو نام بولے جاتے ہیں' وہ اس ذاتِ اقدس کی کسی ایک صفت کے مظہر ہوتے ہیں' سب صفات کو اپنے اندر نہیں سمو سکتے۔ اس کتاب میں ہم یہی بات ثابت کریں گے.........

خالق حقیقی کا موزوں ترین نام

یہودیت' عیسائیت' اسلام اور دیگر آسمانی مذاہب میں خدا کو حاکمِ اعلیٰ اور ہستیٔ برتر مانا جاتا ہے جو سلسلۂ علل کی پہلی کڑی (First cause)' قائم بالذات (Self-Existent) اور ہمہ مقتدر (All-Powerful) ہستی ہے۔ تاریخ کے کسی دور میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ بنی نوع انسان اس مافوق الفطرت تخلیق کار اور فرمانروائے کائنات کی موجودگی کے احساس سے خالی ہو۔ حتیٰ کہ وحشی ترین اقوام بھی خدا یا اعلیٰ ترین ہستی کا کچھ نہ کچھ تصور ضرور رکھتی تھیں' روئے زمین پر کوئی ایسی قوم اور کوئی ایسی زبان نہیں جو خدا کے نام سے بے خبر پائی جاتی ہو[1]۔

لیکن تاریخ مذاہب میں یہ حیرت کی بات ہے کہ قرآن واضح طور پر وحی کی عالمگیریت کو تسلیم کرتا ہے۔ مثلاً خدا نے حضرت آدمؑ سے فرمایا:

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

''پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اُس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا''[2]

پھر فرمایا:۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ

''ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج

---

(1) انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد vi آرٹیکل ''نیمز آف گاڈ''

(2) قرآن مجید' سورۃ البقرۃ آیت 38

سے ڈرانے والے تھے"(1)

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلاً اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ

"ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبر دار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو"(2)

اِنَّآ اَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ؕ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْر

"ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے' بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی ایسی امت نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو"(3)

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غَافِلُوْنَ

"اے محمد یہ (جو پیغمبر آتے رہے اور کتابیں نازل ہوتی رہیں تو) اس لئے کہ تمہارا پروردگار ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر دے اور وہاں کے رہنے والوں کو (کچھ بھی) خبر نہ ہو۔(4)

قرآن مجید میں یہ بات بار بار بتائی گئی ہے کہ ہر قوم میں نبیوں کا ظہور ہوتا رہا ہے' یہ عظیم حقیقت دنیا کے عقلمند ترین لوگوں کی نظروں سے بھی اوجھل رہی ہے مگر اس کا انکشاف ایک بے پڑھے لکھے (امّی) عرب پر ہوا جسے اس وقت تک یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ پہلے زمانوں میں کون کون سی قومیں ہوا کرتی تھیں اور کس کے پاس کونسی آسمانی کتاب تھی۔ یہ بلا شبہ جملہ انسانیت کے لئے خدا کا ایک بنیادی اصول تھا کہ ہدایت پہنچانے کا پورا پورا اہتمام کر دیا جائے۔ اور اس کے بعد اگر وہ نافرمانی کرے تب گرفت کی جائے۔ چنانچہ قرآن مجید نے یہ سادہ حقیقت یوں بیان فرمائی:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ

......(اور ہر امّت کی طرف پیغمبر بھیجا گیا جب ان کا پیغمبر آتا ہے تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر کچھ ظلم نہیں کیا جاتا......سورۃ یونس آیت 47)

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجاً

---

(1) قرآن مجید' سورۃ البقرۃ آیت 213 (2) سورۃ النحل' آیت 36

(3) سورۃ فاطر آیت 24 (4) سورۃ الانعام آیت 131

(ہم نے تم میں سے ایک دستور اور ایک طریقہ مقرر کیا ہے......سورۃ المائدہ آیت 48)

ہر کسی کے لئے ایک دستور اور ایک طریقہ مقرر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے ہر قوم کے لئے اس کی ضرورتوں کے مطابق قواعد مقرر کئے اور سب سے آخر میں اتارے گئے قرآن میں سب قوموں اور سب زمانوں کے لئے ایک ساتھ وحی بھیج دی گئی۔ نفسیاتی طور پر تمام انسانوں کا ذہن بھی ایک وحدت (UNITY) ہے۔ لہٰذا ان کی ضرورتیں بھی کم و بیش یکساں ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ جملہ موجودات ایک ہی قانون میں منسلک ہیں یا ایک ہی تخلیقی ارادے کا نتیجہ ہیں کیونکہ ان کا ایک ہی خالق ہے۔ جس نے نہ صرف تمام مخلوقات کو نشوونما پانے کے ذرائع عطا کئے ہیں بلکہ اس نے ہر ذی روح کے لئے اس کی پیدائش سے قبل ایک دائرہ کار یا استطاعت کی ایک حد مقرر کر دی ہے۔ ہر کوئی اس دائرہ یا استطاعت کے مطابق ایک تدریج کی ساتھ اپنے مقام تکمیل (Perfection) تک پہنچتا ہے۔ قرآن کے مطابق موت' انسان کی زندگی کا خاتمہ نہیں کر دیتی بلکہ اس کے لئے ایک اعلیٰ قسم کی زندگی کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ جہاں کے لئے جزا اور سزا کا ایک جامع قانون مقرر کر دیا گیا ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

(پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا......سورۃ الزلزال......آیات ۷'۸) پھر سب انسانوں سے کیا سلوک کیا جائے گا:

وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا

(اور اعمال نامہ سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتابِ زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ "ہائے ہماری کم بختی' یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ کی گئی ہو......سورۃ الکہف آیت 49)

جنوں اور انسانوں سے یکساں پوچھ گچھ ہوگی' جیسا کہ کہا گیا ہے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ

وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَومِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (اے جنوں اور انسانوں کی جماعت کیا تمہارے پاس تم میں سے پیغمبر نہیں آتے رہے جو میری آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر سناتے اور اس دن کے سامنے آموجود ہونے سے ڈراتے تھے۔ وہ کہیں گے (پروردگار) ہمیں اپنے گناہوں کا اقرار ہے۔ آج کی دنیا کی زندگی نے ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ مگر اس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔........سورۃ الانعام آیت 131)

انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (اے نبیؐ تم سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے........ سورۃ المؤمن آیت 78)

ماہر مذہبیات پروفیسر ایف میکس مُلر لکھتا ہے:

''مذہب کوئی نئی ایجاد نہیں ہے' یہ اگر اتنا پرانا نہیں جتنی کہ دنیا پرانی ہے تو کم از کم معلوم دنیا کے برابر ضرور ہے........یہاں کوئی جھوٹا خدا نہیں تھا اور نہ کوئی جھوٹا مذہب تھا۔ بجز اس صورت کے کہ تم ایک بچے کو جھوٹا مرد کہنے لگو۔ جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے میں یہ جانتا ہوں کہ تمام مذاہب کا ایک ہی مقصد تھا یہ سب اس ایک زنجیر کی کڑیاں ہیں جو آسمان اور زمین کو آپس میں ملاتی ہے اور جسے ایک ہی ہاتھ نے تھاما ہوا ہے اور ہمیشہ اسی نے تھاما ہوا تھا''[1]

آیئے اب ہم خدا کے بارے میں مختلف اقوام کے تصورات کا مطالعہ کریں:۔

(1) جنوبی امریکہ کے وحشی قبیلہ ''ابی پونیز'' (Abipones) کا خدا ''اہاریچی'' یا ''کیبٹ'' (Aharaigichi or keebet) ہے' ان کا عقیدہ ہے: ''اس نے ہمیں شجاعت عطا کی اور اہل سپین کو دولت دی۔''[2]

---

(1) F.Max Muller: "Hibbert Lectures" صفحہ 4 اور ایک مکتوب بنام M.k.Schermerhorn 1883

(2) ھیسٹنگز: انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن جلد اول ص 29

(2) آسام کی شمالی سرحد کے باشندے ایبرمیری (Abor Miri)[1] ایک عظیم ترین ہستی "جام" (Jam) کو سب کا باپ (خالق) مانتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہی سب انسانوں کے ساتھ انصاف کرے گا۔

(3) جنوبی آسٹریلیا کے قدیم باشندے[2] "اتناتو" (Atnatu) کو اپنا خدا مانتے ہیں جس کے معنی ایسی ہستی کے ہیں جس کے جسم میں سے فضلے کے "اخراج" کا کوئی راستہ نہیں یعنی وہ بے عیب ہے۔ جو خدا کھاتا پیتا ہوٗ اس کے بدن سے فضلے کا اخراج ضروری ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (کہو' کیا میں خدا کو چھوڑ کر کسی اور کو مددگار بنالوں کہ (وہی تو) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی (سب کو) کھانا دیتا ہے اور خود کسی سے کھانا نہیں لیتا۔......سورۃ الانعام آیت 14)

ان آسٹریلیوں کا یہ کہنا بھی ہے کہ "اتناتو" دنیا کے آغاز سے بھی پہلے کا ہے۔ یعنی ازلی ہے وہ بہت ہی پہلے آسمانوں میں ظہور پذیر ہوا' وہ از خود پیدا ہوا اور اپنا یہ نام رکھا۔ وہ بہت بڑا ہے تمام قبائل اسی کا قانون مانتے ہیں۔ اس کے نام کے معنی ہیں "بہت بڑا"۔

(4) جنوبی آسٹریلیا ہی کے بعض قدیم باشندے[3] "بیامی" (Baiami) کو خدا مانتے ہیں جس کے معنی "سب کا پیدا کرنے والا اور سب کا باپ" کے ہیں۔

(5) ابی سینیا (حبشہ)[4] کے باشندوں میں سے "ہیمائیٹ" نسل کے لوگ "واق" (Waq) کو پوجتے ہیں۔ اس کا تلفظ "واقو" بھی کیا جاتا ہے۔ اصل میں اس لفظ کے معنی "آسمان" ہیں (یا وہ ایسی ہستی ہے جو آسمانوں پر رہتی ہے)۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا صرف ایک ہی ذات ہے جو ہر جگہ حاضر اور موجود رہتا ہے۔

(6) بحیرہ ایجین کے ساحل کے قریب جزیروں کے باشندے جنہیں "ایجینز"[5]

(1) ہیسٹنگز: انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن جلد اول ص 29
(2) ایضاً صفحہ 33 جلد اول صفحہ 33 (3) ہیسٹنگز کی انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن
(4) ایضاً جلد اول صفحہ 56 (5) ہیسٹنگز: جلد اول صفحہ 147 جلد دوم صفحہ 246

کہا جاتا ہے' وہ "ریہا" (Rhea) کو خدا مانتے ہیں جو کہ "روحِ فطرت" ہے۔

(7) افریقی حبشی قبیلوں کا کہنا ہے کہ انہیں یہ سبق دیا گیا ہے کہ ان کے مالک کا نام "خدا" (God) ہے' ان کی زبان میں "godin" کا لفظ دیوی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ "godji" کا لفظ تین کے گاڈ کے لئے بولا جاتا ہے۔

(8) مشرقی افریقہ کے "اگاوز"[1] کہتے ہیں کہ ان کا بڑا خدا "دیبان" (Deban) یا "جار" (Jar) ہے جس کے معنی آسمان یا جنت کے ہیں۔

(9) خلیج سیام (تھائی لینڈ) سے آسام تک پھیلا ہوا تائی (TAI) خاندان کا قبیلہ ایہومز (Ahoms) "فو'را'تا'را" (Phu-Ra-Ta-Ra) کو اپنا خدا یعنی خالق اور مالک مانتا ہے۔[2]

(10) افریقی قبیلہ "اکرہ" جونگاما (Jongama) کو خدا مانتا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں خدائے بزرگ و برتر۔[3]

(11) افریقی قبیلہ "اکواپن" (Akwapin) کا عقیدہ ہے کہ اسے "جینک کوپانگ" نے پیدا کیا ہے اور وہی اس کا نگہبان ہے۔[4]

(12) سائبیریا سے جاپان تک ایک تاریخی نسل' اینس (Ainus) آباد ہوا کرتی تھی' ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کا خدا "کاموئی" (Kamui) ہے' یہ دراصل ایک خدا پر ایمان رکھتے تھے۔ "کاموئی" کے معنی ہوتے ہیں آسمان۔ جس کا کوئی جمع کا صیغہ نہیں ہے۔

(13) جنوبی بھارت کے "ایانار" (Aiyanar) ' "ہری ہارا" یا وشنوشیوا (Hari Hara or Vishnushiva) کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ ایک "دریودین" دیوتا ہے جسے تمام آریائی نسلیں خدا مانتی ہیں۔[5]

(14) شمالی بھارت کی ایک نسل "الخ نامی" (Alakh Namis) ایک غیر مرئی ہستی "الخ نام" کی پوجا کرتی ہے۔[6]

---

(1) ہیسٹنگز' جلد ششم صفحہ 488 (2) ہیسٹنگز: انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن' جلد اول صفحہ 147 (3) ایف میکس مُلر: Hibbert lectures No:2 (4) ایضاً

(5) ہیسٹنگز: جلد اول صفحہ 257۔ (6) ہیسٹنگز: انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن جلد صفحہ 276

(15) جزیرہ نمائے بلقان (یوگوسلاویہ' بلغاریہ' البانیہ وغیرہ) کے البانی اپنے خدا کو ہجنی (Hyjni) کہتے ہیں جس کے معنی ہوتے ہیں آسمانی خدا۔[1]

(16) الاسکا کے ایلوشن جزائر کے باشندے ایلوٹس (Aleuts) کوگا (Kuga) کی پوجا کرتے ہیں جس کے معنی ایسی ہستی کے ہیں جو پیدا کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔[2]

(17) شمالی امریکہ کی معروف نسل الجیک کا قبیلہ الگوکوئنز (Algoquins) کا کہنا ہے کہ وہ کلوسکیپ (Kuloskap) پر ایمان رکھتا ہے۔ جس کے معنی ہوتے ہیں ایسا خدا جو دھوکہ دے سکتا ہے' جھوٹ بول سکتا ہے اور زخمی بھی کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ واقعی ایسا ہی کرتا ہے' بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کو دھوکہ دیتا ہے' جس کے لئے اسے جھوٹ بولنا پڑتا ہے' وہ دشمنوں کو گمراہ کرتا ہے اور بالآخر زخمی کر دیتا ہے۔ وہ خالق ہے اور انسان کا دوست اور مربی ہے۔[3]

(18) جزائر انڈیمان (خلیج بنگال) کے پست قد وحشی قبائل جو اگرچہ بالکل ننگے رہتے ہیں "پولوگا" (Puluga) کو اپنا ربِّ اعلیٰ مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ہر حرکت اور ہر تبدیلی کا سبب (Cause) ہے۔ گناہوں پر ناراض ہوتا ہے اور اچھے کاموں پر خوش ہو جاتا ہے۔ اس نے استادِ اول "تومو" (TOMO) کو ہدایات دیں تاکہ وہ بندوں کو ان ہدایات سے آگاہ کرے۔[4]

(19) برما کے "انامیز" (Annamese) اپنے خدا کو "ڈاک کوک" (DOC-CUOC) یعنی ایک پاؤں والا خدا کہتے ہیں۔ اور اس کی حمد گاتے ہوئے یہ کہتے ہیں:

"وہ دنیا میں رونما ہونے والے ہر واقعے کو دیکھ سکتا ہے"۔[5]

(20) عرب شروع سے ہی خدا کو "اللہ" کہتے تھے۔ جو کاملیت کی تمام صفات سے متصف ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔

لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔ (اس کے سب سے اچھے نام ہیں۔ سورۃ الحشر آیت 24)

(1) پروفیسر ناربرٹ جوک البانین ڈکشنری مطبوعہ کیمبرج۔ صفحہ 305۔
(2) ہیسٹنگز: جلد اول
(3) ہیسٹنگز صفحہ 320۔
(4) ہیسٹنگز: انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن صفحہ 468
(5) ایضاً صفحہ 539

وہ ایک واجب الوجود ہستی ہے۔ لفظ اللہ' سوائے اس حقیقی اور سچے خدا کے' کسی کے لئے بھی استعمال نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ عربوں نے اپنے کسی بھی بت یا کسی با عزت و مقتدر شخص کے لئے یہ نام استعمال نہیں کیا۔ اس کے لئے کوئی مونث یا جمع کا صیغہ موجود نہیں ہے۔ یہ کسی مصدر (Root) کا مشتق نہیں ہے۔ اور نہ ہی دنیا کی کسی بھی زبان میں اس کا کوئی متبادل موجود ہے۔ چنانچہ اس علیم وخبیر اللہ کی طرف سے یہ چیلنج دیا گیا ہے:

هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا

(کیا ہے کوئی ہستی تمہارے علم میں' اس کے ہم نام ......سورۃ مریم آیت 65)

(21) برازیل (جنوبی امریکہ) کے اراوک قبائل' "جورو پری" یا "جورو پرائی" (Jurupraí) کو پوجتے ہیں۔ اس کے لفظی معنی دریا کا دہانہ ہوتے ہیں۔ "جورو پرائی" ایک ایسی کنواری ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا جس کی کوئی جنس (Sex) نہیں تھی۔

(22) مشرق افریقہ کا سیاہ فام قبیلہ "اشانتس" ....ٹانڈو کو خدا مانتا ہے۔ اس ٹانڈو کی' بوبودیسی سے دشمنی ہے کیونکہ اشانتی کے لوگ پہلے بوبودیسی کے پجاریوں سے برسرپیکار رہ چکے تھے۔

(23) آرمیبیا کے لوگوں کا سب سے بڑا خدا "آرامازد" ہے جو سب چھوٹے خداؤں (دیوتاؤں) کا باپ ہے' ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا آرامازد ہے۔[1]

(24) شام کے لوگ[2] "بال" (Baal) یا "بیل" (Bel) کو خدا مانتے تھے' ان کا عقیدہ تھا کہ "بال" یا "بیل" ہر چیز کا مالک اور صانع ہے۔ اسرائیلی بھی اسی کو پوجتے تھے۔ جیسا کہ بائبل میں لکھا ہے کہ ...."ان کے باپ نے میرا نام بھلا کر بال کو خدا بنالیا ہے"[3]

(25) اہل بابل' "انو" (Anu) کی عبادت کرتے تھے جس کے معنی ہوتے ہیں آسمانوں کا خدا۔ یہ سمیرین خدا تھا۔[4]

---

(1) ہیسٹنگز انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن جلد اول صفحہ 795

(2) Concise Dictionary of Assyrian Language-Berlin :W.MUSS ARNOLT

(3) یرمیاہ 23:27 (4) ہیسٹنگز: جلد دوم صفحہ 310۔

(26) بلغاریہ کے لوگ بورا (Bora) کی پوجا کرتے ہیں' جس کی کئی شکلیں ہیں "جمع" اور "مونث"۔ بورا کے معنی' پوجا کے لئے سب سے بڑی ہستی۔ (1)

(27) افریقیوں کے بنٹو قبیلے نے اپنے خدا کا نام' امبے" (Ambe) یا "نیامبے" (Nyambe) رکھا ہوا ہے جس کے معنی' خدائے حقیقی کے ہیں۔ (2)

(28) سپین کے قدیم باشندے "باسق" (Basques)' جان گائیکو (Jaun-goiko) کی پوجا کرتے تھے جس کے معنی ہوتے ہیں' بلندیوں کا آقا"(3) بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کے معنی "چاند کا آقا" کے ہیں۔

(29) برما کے بدھ مت کے پیروکار' "ناٹ" (Nat) کی پوجا کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ مافوق الفطرت' ہستی ہے۔ (4)

(30) نیپال کے بدھ مت کے پیروکار "ادی بدھا" (Adi buddha) کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ خدائے واحد کے پیروکار ہیں۔ ادی بدھا کے معنی ہوتے ہیں "ازلی معبود"۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا واجب الوجود ہے۔ وہ اسے "سوایمبو" یا سوایمبولوک ناتھ کہتے ہیں جس کے معنی ہوتے ہیں ساری دنیا کا محافظ۔ اسے وہ "خالص روشنی" بھی کہتے ہیں۔ اس کا مندر کھٹمنڈو میں ہے۔ (5)

(31) بدھوں کے بعض فرقے ایولوچت ایشورا (Aulochit Eshvra) کی پوجا کرتے ہیں۔ ایولوچت ایشورا کی مختلف تعبیریں ہیں۔ تبت کے لوگ اس سے مراد وہ' ہستی لیتے ہیں جو بدھ اور مخلوقات' دونوں کو شفقت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ (6)

(32) مشرقی منگولوں کی شاخ بُریٹس (Buraits) اپنے خدا کو "ٹینگری" (Tangri) کہتے تھے۔ (ٹینگا کے معنی ہیں آسمان اور ٹینگری کے معنی آسمانوں پر رہنے والا کے ہیں)۔ (7)

---

(1) کانسٹنٹائن سٹیفن تووا...... "بلغارین ڈکشنری' صوفیہ۔ (2) سر ہنری' ایچ جانسن: بنٹولینگوئج' آکسفورڈ۔ (3) ھیسٹنگز: جلد "م' صفحہ 436۔ (4) ھیسٹنگز: انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن جلد سوم' صفحہ 22 (5) ھیسٹنگز: جلد اول صفحہ 94 (6) سارت چندراڈ ڈکشنری صفحہ 806 (7) ھیسٹنگز: جلد سوم صفحہ 2

(33) حبشیوں کے قبیلہ "بوروس" (Burus) میں خدائے برتر کو "اوپ قیباسنولت" کہا جاتا ہے جس کے معنی خالق کے ہیں۔ اس کا بھیجا ہوا رسول "نبیا تا" تھا جو انڈونیشیا میں اترا تھا۔[1]

(34) کنعانی "ایل" (El) کو خدا مانتے تھے۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں طاقت۔ ان کا دوسرا خدا "ایڈو" (Ado) تھا جس سے اسرائیلیوں نے "ادونائی" (Adonai) کا لفظ اخذ کیا یہ "یہوواہ" (JEHOVAH) کا متبادل لفظ ہے۔ عہد نامہ عتیق میں یہ لفظ اللہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔[2]

(35) جنوبی امریکہ کے کیرب (Caribs) "تامو" (Tamu) کی پوجا کرتے ہیں جس کے معنی "دادا" یا آسمانوں کا قدیم اللہ ہے[3]

(36) کلدانی (Chaldeans) خدا کو "اللہ" کہتے تھے۔ یہ خدا کا بہت قدیم سامی نام ہے جس کے معنی ہوتے ہیں بہت اونچا۔[4]

(37) پیرو (جنوبی امریکہ) کے "چیب چاز" اپنے خدا کو "چمیزا پگوا" (Chimizapagua) کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہوتے ہیں پیدا کرنے والا۔ ان کے پیغمبر کا نام "باچیا" (Bachia) تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں جو کچھ بھی آتا ہے اسی پیغمبر کا بتایا ہوا ہے۔[5]

(38) چلی (جنوبی امریکہ) کے لوگ اپنے مشکل وقت پر "پیلّان" (Pillan) خدا سے مدد مانگتے ہیں۔ جس کے لفظی معنی عظیم ترین روح کے ہیں۔[6]

(39) چینی "شانگ تی" (Shang-Te) کو خدا مانتے ہیں۔ قدیم کتابوں میں "شانگ تی" اعلیٰ ترین ہستی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ خاص خاص مقامات کے جنوں کے لئے "شین" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً دریاؤں کے خدا کو "ہوشن" اور پہاڑیوں کے خدا کو "شان شین" کہا جاتا ہے لیکن یہ سب "تین" (Teen) سے پست درجے کے خدا ہیں۔

---

(1) ہیسٹنگز: جلد ہفتم صفحہ 248 (2) ہیسٹنگز انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن جلد سوم صفحہ 178 (3) ہیسٹنگز: جلد دوم صفحہ 836
(4) ڈاکٹر جولیس فورسٹ: Hebrew and chaldee lexion, London
(5) ہیسٹنگز: جلد سوم صفحہ 515 (6) ایضاً صفحہ 547

''تین'' سے مراد ''آسمان'' یا ''بلند تر'' ہستی ہے جو کہ خود مختار اور حاکم اعلیٰ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''شانگ تی'' کو بھی غیر سنجیدگی سے نہیں لیا جانا چاہیے کیونکہ ہم اس سے خدا اور اس کا عرش مراد لیتے ہیں۔[1]

(40) چینی فلسفی کنفیوشس کو اگرچہ مشرک سمجھا جاتا تھا' وہ ''شین'' (Shen) کو خدائے بزرگ و برتر مانتا تھا جو متمکن عرش العظیم ہے۔ اس کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ تمام جنات اور دیو ''شین'' کے تابع ہیں' کوئی بھی جنّ اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔[2]

(41) افریقہ کے قبطی اپنے خدا کو ''نوٹے'' (Notte) کہتے ہیں' جو واحد جمع' مذکر اور مونث کے صیغوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[3]

(42) شمالی اور مغربی یورپ کی ہند آریائی قوم کا ایک ممتاز گروہ ''سیلٹ'' یا ''کیلٹ'' (Celt) اپنے خداؤں کے لئے ''ڈیو'' (Dew) یا ''زیو'' (Dhew) سے ملتے جلتے الفاظ استعمال کرتا تھا جن کے لئے جمع کا لفظ ''ڈے ووہ'' (Dewow) مروّج تھا۔[4]

(43) بحیرہ روم کے جزیرہ کریٹ کے لوگ اپنی حاجات کے لئے ''تھیوس'' (آسمان) سے مدد مانگتے ہیں۔

(44) ڈنمارک اور ناروے کے باشندے ''گاڈ'' (God) کو ''گڈ'' (Gud) کہتے ہیں جس کی جمع گڈر (Gudder) ہے۔ جبکہ دیوی کے لئے گڈین اور گجی (Gudinne اور Gudji) بولا جاتا ہے۔

(45) شمالی میکسیکو کے قدیم باشندوں میں ''ڈینز'' (Denes) اہم ترین گروپ ہے ان کے رب اعلیٰ کا نام ''یوتورسوئیٹ سا'' (Yuttoere Soetit Sa) ہے جس کے معنی ہیں۔ ''وہ ذات جو عرش معلّی پر بیٹھی ہوئی ہے''۔ وہ اسی کو سب کا خالق اور کائنات کا اصل حکمران مانتے ہیں۔[5]

---

(1) Chinese Dictionary: Hubert Gillee: ہیسٹنگز انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن جلد سوم صفحہ 550

(2) ہیسٹنگز: جلد سوم صفحہ 547 (3) A coptic Dictionary Oxford :W.E Crum

(4) Cornish-English Dictionary :W.P Fred (5) ہیسٹنگز: جلد چہارم صفحہ 639

(46) خرطوم (سوڈان) سے 300 میل دور افریقہ کا ایک خود مختار قبیلہ ڈنکا (Dinca) آباد ہے۔ یہ ایک بڑا مذہبی گروہ ہے اور ایک بزرگ و برتر خدا کو مانتا ہے جس کا نام ''ڈنگجٹ'' (Dengdit) بتاتے ہیں۔ اس کے لفظی معنی ''زبردست بارش'' کے ہیں۔ اس سے ان کی مراد وہ خدا ہے جس نے دنیا بنائی اور وہ بارشوں اور ہواؤں کو کنٹرول کرتا ہے۔[1]

(47) ہالینڈ کے میں سب سے اعلیٰ خدا کو "God" اور "Godheid" کہا جاتا ہے جس کی مونث "Godin" ہے جبکہ اس کی جمع "Goden" (e کے ساتھ) ہے۔[2]

(48) کیمرون کے ساحل سے کچھ دور خلیج گنی کے جزیرہ ''فرنانڈوپو'' کے باشندے ''ایڈیان'' (Ediyans) اپنی اعلیٰ ترین ہستی کو ''روپی'' (Rupi) کہتے ہیں۔[3]

(49) قدیم مصری اپنے خدا کو ''نیدر'' (Nether) کہتے تھے۔ جس کے معنی ''خدا'' یا دیوتا کے ہیں۔ اس کی مونث کو نیٹریٹ (Netrit) کہا جاتا تھا۔

(50) مصری خطِ تصویر (Hieroglyphic) میں لکھا ہوا خدا کا نام خم (Khem) ہے۔ فرعونِ مصر کو ''خم'' کہا جاتا تھا کیونکہ اس کا اصل نام اتنا مقدس سمجھا جاتا تھا کہ اسے الفاظ میں ادا کرنا جرم تھا۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب رگ وید میں بھی خدا کا دیوتائی نام......''کا'' لیا گیا ہے۔ اس طرح ''خم'' اور ''کا'' کی تجسیم کر کے دونوں بطور خدا لائق پرستش قرار پائے ہیں۔

(51) ایکی (Eiki) قبیلہ اپنے خدا کو ''تونگالوا'' (Tongaloa) کہتا تھا۔ جس کا مطلب ''مالک'' ہوتا ہے۔[4]

(52) انگریزی میں معبود کو ''گاڈ'' کہا جاتا ہے' جس کا جمع کا صیغہ گاڈز (gods) اور اس کی مونث ''گاڈیس'' (goddess) ہے۔ اس کا ہم الگ ذکر کریں گے۔

(53) اسکیمو (لفظی معنے کچا گوشت کھانے والے) امریکہ کے قطب شمالی میں آباد ہیں' ان کی زبان میں خدا کا نام ''تورنا گارسک'' (Torna-garsuk) ہے جس کے معنی ''روحِ عظیم'' ہیں۔[5]

---

(1) ھیسٹنگز: انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن جلد چہارم صفحہ 707 (2) Netherlandsch Dictionary, London

(3) Hibbert Lecture: F.Max Muller ''لیکچر نمبر 2

(4) ھیسٹنگز: جلد بارہ صفحہ 376 (5) Eskimo Language Dictionary

(54) ایسٹونیا کے باشندے اپنے خدا کو "جُمَل" (Jumal) کہتے ہیں۔ جبکہ اس کی مؤنث کو "جمالنا" کہا جاتا ہے۔[1]

(55) جنوبی بحرالکاہل کے جزائر فیجی باشندوں نے خدا کا نام "کالو ویو" (Kalou-vu) رکھا ہوا ہے جس کے معنی "اعلیٰ ترین ہستی" کے ہیں۔ اس سے مراد حیرت انگیز کمالات کا مالک بھی ہے۔[2]

(56) فیجی کے "رکیرا کی" قبیلے کا کہنا ہے کہ خدا کا نام "ڈینگی" (Dengi) ہے۔ جس کے معنی ہیں "انتہائی قابل احترام معبود"۔ وہ اسے انسان کا خالق مانتے ہیں۔ جزائر فیجی کے اصل باشندے بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔[3]

(57) فن لینڈ کے باشندے "فنز" خدا کو جُمالا یا جُمالئر کہتے ہیں جبکہ "جُمالاتان" ان کی دیوی ہے۔ "جُمالینن" انتہائی خوبصورت چیز کو کہا جاتا ہے۔

(58) اہل فرانس اپنے خدا کو "Dieu" کہتے ہیں جس کے معنی "خدا" یا "بُت" کے ہیں۔ اس کی مونث کو "deese" کہا جاتا ہے۔[4]

(59) فارموسا کے لوگ اپنے دیوتا "تماجسا نک" کی پوجا کرتے ہیں۔ اور اس کی اہلیہ کا نام "تکارپادا" (Tekarpada) ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جب بادل گرجتے ہیں تو اس وقت یہ دیوی، اپنے شوہر کو کوس رہی ہوتی ہے کہ زمین کی طرف اتنی بارش کیوں بھیجی گئی ہے۔[5]

(60) سکاٹ لینڈ، آئرلینڈ اور فرانس کی زبان "گالک" میں خدا کا نام "Dia" ہے جس کا تلفظ "جیا" ہے۔ اس کی جمع "Dee" اور دیوی کا نام جیجالو (Jeejallu) ہے۔ جس کے معنی "بُت" کے ہیں۔ "جی مین" چاند دیوتا کو کہا جاتا ہے۔

(61) خدا کا جرمن نام "Gott" ہے۔ جبکہ "der gott" ایک بُت ہے اور "gotten" ایک دیوی ہے۔

(1) Estonian Dictionary :J.Silvet Tartu (2) ہیسٹنگز: جلد ششم صفحہ 14

(3) ایضاً (4) "Anglais-Francais" Paris :Jules Guiraud

(5) ہیسٹنگز: جلد ششم صفحہ 84 "فارموسا"

(62) مشرقی افریقہ کے گولڈ کوسٹ میں نیگرو قبیلے خدا کو "بوبوویسی" (Bobowissi) کہتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ "بوبوویسی" نے دنیا کے کاموں کے لئے چھوٹے چھوٹے دیوتا مقرر کر رکھے ہیں۔ اور وہ انہی کے ذریعے تمام معاملات کو کنٹرول کرتا ہے۔[1]

(63) خدا کا یونانی نام "تھیوس" (Theos) ہے۔ جبکہ "تھیون" کے معنی ہیں "خدا کی مدد سے"

(64) گوئٹے مالا کے کوپچی انڈین خدا کی کتاب "پوپول ووہ" پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس میں خدا کا نام "ہوراکن" (Hurakan) بتایا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ خدا کی صرف ایک ٹانگ ہے بندوں کی طرح دو ٹانگیں نہیں ہیں۔ یہی خدا ساری دنیا کا خالق ہے۔[2]

(65) شمالی نائیجیریا کے "ہاسا" (Hausa) قبائل کہتے ہیں کہ ان کا خدا "اللہ" ہے لیکن ان کی زبان میں "اللہ" کی جمع "الّلولی" (Alloli) ہے جو کہ دنیاوی (Heathen) خدا ہیں۔

(66) بحرالکاہل کے جزائر ہوائی کے لوگ "اکوا" (Akua) کی عبادت کرتے ہیں جس کے معنی ہوتے ہیں "عظیم دیوتا"۔[3]

(67) یہودی یعنی اسرائیلی خدا کا نام "یہوواہ" (Yehovah) بتاتے ہیں۔ اس پر تفصیلی بحث آئے گی۔

(68) ہندو ہندوستان کے قدیم ترین باشندے ہیں بنگال میں خدا کو "ہری" (معاف کرنے والا) کہتے ہیں۔ دیگر ریاستوں یا صوبوں میں "رام" کی پوجا کی جاتی ہے جس کے معنی "خوش باش" کے ہیں۔ ان کی مذہبی کتابوں میں خدا کا سب سے بڑا نام "ادم" ہے جس کے معنی محافظ یا سرپرست کے ہیں۔

(69) ہنگری میں خدا کا نام "استن" (Istan) ہے جبکہ "اسٹینو" (Istenno) دیوی ہے۔

---

(1) ہیسٹنگز: جلد نہم صفحہ 277 (2) ہیسٹنگز جلد دہم صفحہ 115

(3) Hawaii Language Dictionary :Henry P.Judd

(70) آئس لینڈ کے لوگ خدا کو گاڈ (Godd) اور گڈ (Gud) کہتے ہیں۔ جبکہ دیوی کا نام "گجی" (Gudje) ہے۔

(71) پیرو (جنوبی امریکہ) کے "انکاز" (Incas) خدا کو "ویرا کوچا" (Viracocha) کہتے ہیں۔ اس کے لفظی معنی "خلا میں رہنے والا" ہیں۔ وہ اس کو عظیم ترین خالق کہتے ہیں۔[1]

(72) انڈونیشیا کا ایک قبیلہ "مولا کاز" (Moluccas) "اپولیرو" (Upu-lero) کو خدا مانتا ہے۔ جو خالق ہے اور اسی بنا پر اسے لائقِ عبادت سمجھا جاتا ہے۔[2]

(73) آئر لینڈ کے لوگ خدا کو "ڈایا" (Dia) کہتے ہیں جو آسمانوں میں رہتا ہے۔

(74) اطالوی زبان میں خدا کا نام "ڈائیو" (Dio) ہے جس کے معنی آسمان پر رہنے والا ہے۔ اس کی مونث کو ڈایا (Dia) کہا جاتا ہے۔[3]

(75) جاپانی خدا کو "کامی" (Kami) کہتے ہیں۔ اس کے معنی "اوپر" یا "آسمان" کے ہیں۔ "کامی" قابل احترام حکمرانوں اور روحوں کو بھی کہا جاتا ہے۔[4]

(76) جاوا کے باشندوں میں سے بعض "دانگیا نگ" (Dangyang) کو اپنا خدا مانتے ہیں' دانگیا نگ کے لفظی معنی "مافوق الفطری قوت" کے ہوتے ہیں۔[5]

(77) بھارت کے دراوڑوں کا ایک قبیلہ "کول" ہے۔ ان کے ہاں جنت' جہنم یا گناہ کا کوئی تصورت نہیں' ان کے پروہت نہیں ہوتے اور نہ ہی بُت ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خدا کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہیں اور اسے "کو" (Ko) کہتے ہیں۔ اس کی یاد میں وہ مندر یا خدا کا گھر (Koil) تعمیر کرتے ہیں۔ لفظ "کو" آریاؤں کے "کادیوا" (Ka deva) سے لیا گیا ہے۔[6]

(78) کوریا کے باشندے بھی خدا رکھتے ہیں' جسے وہ "گاڈا" (Goda) کہتے ہیں مگر یہ مونث (goddess) ہے۔[7]

---

(1) ہیسٹنگز جلد اول صفحہ 470 (2) ہیسٹنگز جلد ہفتم صفحہ 248 (3) انگلش اٹالین ڈکشنری۔ پیرس (4) نیو جاپانی انگلش ڈکشنری' ہارورڈ یونیورسٹی (5) ہیسٹنگز: جلد ہفتم صفحہ 248 (6) ایضاً جلد پنجم صفحہ 1 (7) کورین انگلش ڈکشنری

(79) مغربی بحرالکاہل میں نیوزی لینڈ کے شمال میں ایک مجموعہ جزائر ہے اسے ''ٹونگن'' (دوستانہ جزائر)) کہتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں کے دو گروہ ہیں' ان میں سے ایک گروہ ''ٹونگا لوآ'' (Tonga-loa) کو خدا مانتا ہے جس کے لفظی معنی ''بڑا'' کے ہیں۔[1]

(80) ان کا دوسرا گروہ ''ماوئی'' (Ma ui) کی پوجا کرتا ہے' اس کا اصل تلفظ ''موئی'' (Mowy) ہے جس کے معنی ''باپ'' کے ہیں۔[2]

(81) لاطینی زبان بولنے والوں کا دعویٰ ہے کہ سترہویں صدی تک ان کی زبان ''لاطیم'' (Latium) پورے مغربی یورپ کی علمی اور سفارتی زبان تھی۔ اس نے کئی زبانیں نکلیں۔ اس زبان میں خدا کا نام ''ڈیس'' (Deus) ہے۔ اس کے معنی آسمان کے ہوتے ہیں۔ اس کا جمع کا صیغہ ''ڈی''......(di) ہے۔ قدیم ادب میں یہ بکثرت استعمال ہوتا رہا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق ''ڈیس'' کی جڑ سنسکرت کا لفظ ''Di'' یا "Div" ہے' جس کے معنی ''روشن'' یا ''چمکدار'' کے ہیں۔[3]

(82) جنوبی بھارت کے لوگ ''لنگایات'' (Lingayat)' ایک خدا ''شیوا'' کو مانتے ہیں جو تخلیق اور تباہ کاری کی قوتوں کا مالک ہے۔[4]

(83) لتھوانیا کے باشندوں کی ٹیوٹا نک (Teutonic) نسل کے لوگوں کے خدا کا نام ''ڈیواس'' (Dievas) ہے اور اس کی مونث کو ''ڈیوی'' (Dievi) کہا جاتا ہے۔[5]

(84) افریقہ کے مشرقی ساحل کے جزیرہ مڈغاسکر کے لوگ ''زاناہری'' (Zanahary) کی عبادت کرتے ہیں اس نام کے لفظی معنی ''سب چیزوں کا خالق'' کے ہیں۔ اور وہ ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔[6]

(85) ملائشیا کے قدیم باشندے ''توہان'' (Tuhan) کو اپنا خدا مانتے ہیں جس کے لفظی معنی ''آقا'' کے ہیں۔[7]

---

(1) ہیسٹنگز: جلد 12 صفحہ 379۔ وہ روحانی پاکیزگی کے لیے بچوں کی ختنہ بھی کراتے ہیں۔
(2) ایضاً جلد 12 صفحہ 376 (3) ہارپر زلیٹن ڈکشنری اور انگلش لیٹن ڈکشنری مطبوعہ نیویارک
(4) ہیسٹنگز: جلد ہشتم صفحہ 69 (5) Lithunian English Dictionary:Lubha
(6) ہیسٹنگز: جلد ہشتم صفحہ 230 (7) Maori-polynesian Dictionary

(86) مغربی ایران اور جنوبی بابل میں اب بھی موجود پارسیوں کا ایک فرقہ ''مینڈ ینز'' (Mandaeans) کہلاتا ہے' اس کی اپنی زبان' اپنا منفرد مذہب اور مقدس لٹریچر ہے۔ یہ سامی (Semitic) نسل کی ایک شاخ ہے۔ ان کا ضابطہ اخلاق یہ ہے: ''میں ان سب لوگوں سے' جو خدا کا نام دھیان سے سنتے ہیں' کہتا ہوں کہ تم سانس لینے' آنے جانے' کھانے پینے اور سونے جاگنے میں روشنی کے بادشاہ کا نام لیا کرو''۔ وہ اپنے خدا کو اللہ تہیں' ''الاھا'' کہتے ہیں۔ المسعودی کہتا ہے کہ یہ لوگ ''صابئین'' ہیں جن کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ البقرہ کی آیت 62 میں آیا ہے۔ یہ عبادت کرتے ہوئے اپنا رُخ شمال یا قطبی ستارے کی طرف کر لیتے ہیں۔ [1]

(87) مشرقی استوائی افریقہ کا ایک سیاہ فام قبیلہ ''میسائس'' (Masais)' زمین سے سیدھا اوپر آسمان سے نازل ہونے والی ایک ''قوت'' پر یقین رکھتا ہے۔ یہ لوگ بڑی عاجزی سے اس ''قوت'' سے دعا مانگتے ہیں۔ اس کو وہ ''این آئی'' (En-Ai) کا نام دیتے ہیں۔ یہ بارشوں کا سیاہ خدا ہے جو بندوں سے نہایت شفقت کا سلوک کرتا ہے۔ مگر بظاہر ان سے دور رہتا ہے۔ [2]

(88) جنوبی بحرالکاہل میں جزائر فیجی کے قریب رہنے والے میلانیشین (Melanesians) لوگ یہ ایمان رکھتے ہیں کہ وہ جملہ افعال ''مانا'' (Mana) کی موجودگی اور اس کے زیر اثر انجام دیتے ہیں۔ ''مانا'' ایک عظیم ترین قوت ہے جو انسانوں سے کہیں زیادہ بڑی ہے اور حقیقی ہے۔ [3]

(89) تبت' برما اور آسام میں پائی جانے والی ایک نسل ''مائیکرز'' (Mikers) کے افراد' ''ارنان'' (Arnan) کو اپنا معبود مانتے ہیں اور اس کو انتہائی طاقتور اور خوفناک سمجھ کر پوجتے ہیں۔ اس کی خوشنودی کے طلب گار اور اس کے خوف سے لرزاں رہتے ہیں۔ [4]

(90) منگول اپنے خدا کو ''خورموسدہ'' (Khormosda) کہتے ہیں۔ اور بتوں اور جھوٹے خداؤں کے لئے جارلک (Jarlik) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ [5]

---

(1) ھیسٹنگز: جلد چہارم صفحہ 384 (2) ھیسٹنگز: جلد ہشتم صفحہ 481

(3) ایضاً صفحہ 530 (4) میکس مُلر کے لیکچرز بعنوان ''مذہب کی ابتدا اور اس کا فروغ''

(5) منگولین انگلش ڈکشنری۔ کوپن ہیگن

(91) مغربی سائبیریا اور ہنگری کی نسل مارڈوینز (Mordvins) کے دو قبیلے "ارزا" (Erza) اور "موکشا" (Moksha) ہیں۔ اول الذکر قبیلہ آسمان کو پوجتا ہے اور اس نے اس کا نام "ویرے پاز" vere-pas رکھا ہوا ہے جس کے معنی ہیں' وہ خدا جو اوپر ہے۔ (1)

(92) شمالی بھارت کا قبیلہ "منڈاس" کئی خداؤں (دیوتاؤں) کی عبادت کرتا ہے لیکن سب دیوتاؤں کے لئے وقف عبادت گاہ (Pantheon) پر بہت اونچا "سنگبونگا" بنا ہوا ہے جو سورج یا سورج کے اندر رہنے والی روحوں کی علامت ہے' ان سے رحم و کرم کی امید رکھی جاتی ہے۔ (2)

(93) شمالی عرب کے "نبطی" (Nabaetians) "دوشیرہ" کی پوجا کرتے تھے اس کی بیوی (دیوی) کا نام اللات (دیوتاؤں کی ماں) تھا۔ دوشیرہ کے معنی (قوتوں کا مالک) ہوتے ہیں۔ (3)

(94) بدھیل کھنڈ (بھارت) کے ناگا قبائل ایک بے نام خدا کی پوجا کرتے ہیں۔

(95) امریکن انڈین قبیلہ "ناشز" (Nachez) "کویوکوشیل" کی پوجا کرتا ہے۔ جس کے معنی ہوتے ہیں عظیم روح۔ یہ تمام چھوٹی روحوں کا آقا ہے۔ چھوٹی روحیں اس کے حکم کے تحت کام کرتی ہیں۔ (4)

(96) ناروے کے لوگ خدا کو "گاڈ" کی بجائے گُڈ (Gud) کہتے ہیں۔ اور دیوی کو گُڈرین (guderen) پکارتے ہیں۔ دیویوں کی جمع "گُڈر" ہے۔ جبکہ سب چھوٹے دیوتاؤں اور دیویوں کو "خدائے عظیم" (Fa-der-denstaerkegud) کے تابع مانا جاتا ہے۔ (5)

(97) وسطی افریقہ کے قدیم باشندوں "نیوباز" کا سب سے بڑا خدا "اوٹیوز" (Otiose) ہے جبکہ ان کے بعض قبیلے "کالو" (Kalo) کو خدا مانتے ہیں جس نے تمام چیزیں تخلیق کیں' آسمان اس کا "گھر" ہے جہاں سورج اور چاند ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ (6)

(98) نیا سالینڈ کے باشندے "نیانجاز" مولنگو (Mulungu) کو خدا مانتے ہیں۔

---

(1) ھیسٹنگز: جلد ہشتم صفحہ 844 (2) ایضاً جلد ہشتم صفحہ 844

(3) ایضاً جلد نہم صفحہ 2 (4) ھیسٹنگز: جلد نہم صفحہ 190

(5) نارویجین لینگویج ڈکشنری مطبوعہ کوپن ھیگن (6) ھیسٹنگز جلد نہم صفحہ 403

''مولنگو'' کے معنی ''عظیم تر'' کے ہوتے ہیں۔[1]

(99) گھانا کے اشانتی قبائل جو ایک جنگجو قوم سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے خدا کا نام ''سکائی'' (آسمان) رکھا ہوا ہے۔ ''سکائی'' ان کے عقیدے کے مطابق تمام چیزوں کا خالق ہے' ہر جگہ حاضر و ناظر اور علیم و خبیر ہے وہ انسانوں کے ذاتی خیالات بھی خوب جانتا ہے' اس نے نہ صرف سب کو پیدا کیا ہے بلکہ سب کو نیکی کا راستہ بھی دکھاتا ہے۔[2]

(100) ایک پرانی جرمن قوم اپنے خدا کو ''ڈی آئیٹ'' (Deit) کہتی تھی اور آسمان کو ''ڈیور'' (Deiyor) کہتی تھی۔[3]

(101) کاکیشیا کے پہاڑی علاقوں قفقاز میں ایک مذہب ''اوسیٹک'' (Ossetic) پایا جاتا ہے۔ جس میں خدا کو ''ختساؤ'' (Khutsau) کہا جاتا ہے۔ ختساؤ کو خداؤں کا خدا مانا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ''محمدؐ'' سورج یا ''خریفرٹ'' (Khorifyrt) کے بیٹے ہیں۔ یہ لوگ مسلمان نہیں بلکہ پارسی ہیں۔[4]

(102) سائبیریا کے باشندے ''اوسٹیاکس'' (Ostyaks)' اپنے خدا کو ''ایس'' (Ess) کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''اسے کسی نے نہیں دیکھا کیونکہ وہ آسمان پر رہتا ہے۔[5]

(103) اہل فارس' خدا کو ''خدا'' (بمعنی واجب الوجود) مانتے ہیں۔ اس کی جمع ''خدایان'' ہے۔ بادشاہ یا شہزادے کے لئے ''خداوند'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔[6]

(104) جنوبی امریکہ کے ملک پیرو کے لوگ اپنے خدا کو ''پنچیا چاچک'' (Panchyachachak) کہتے ہیں جو ان کے عقیدے کے مطابق دیوتاؤں کو دنیاوی امور کے بارے میں ہدایت دیتا رہتا ہے۔[7]

(105) بابل کی قدیم قوم' فنیقی (Phoenicians) اپنے خدا کو ایلن (Allon) یعنی قابل پرستش کہتی تھی۔[8]

---

(1) ایضاً جلد نہم صفحہ 419 (2) F.Max Muller: ''Hibbert Lectures'' صفحہ 107......

(3) ھیسٹنگز: جلد 12 صفحہ 248 (4) ھیسٹنگز: جلد نہم صفحہ 573......

(5) ایضاً صفحہ 578 (6) Persian-English Dictionary

(7) ھیسٹنگز: جلد نہم صفحہ 803 (8) ایضاً صفحہ 890

(106) پولینڈ کے لوگ خدا کو "بوگ" (Bog) کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں خزانوں کا مالک۔ "بوگینی" ان کی دیوی ہے۔ پولش زبان میں خداؤں کے لئے جمع کا صیغہ "بوزیک" (Bozek) یا "بوستوو" (Bostvo) استعمال کیا جاتا ہے۔[1]

(107) بحرالکاہل کی "پولی نیشائی" نسلوں میں متعدد قبیلے ہیں' ان میں خدا کے لئے مشترک نام ..... "اتوآ" ہے جس کے معنی دیوتا یا آقا کے ہیں لیکن "اتوآ کیکیتو" (Atua-kikito) دشمنِ خدا یعنی شیطان کے لئے بولا جاتا ہے۔[2]

(108)' (109)' (110)' (111) پولی نیشائی نسلیں بالترتیب "سموا" "تاہتینز" "منگر یونز" اور "ٹونگنز" بھی خدا کو "اتووا" ہی کہتی ہیں۔

(112) پرتگال کے لوگ خدا کو "ڈی اس" (Deus) کہتے ہیں جس کے معنی "آسمان" کے ہیں۔ اس کی مونث کو "ڈیوسا" (Deusa) کہا جاتا ہے۔

(113) رومانیہ کے باشندے خدا کو "ڈومیزو" کہتے ہیں جس کے معنی "آسمان" کے ہیں' جبکہ دیوی کو "ڈومیزیتا" کہا جاتا ہے۔

(114) اہل روس خدا کے لئے "بوک" (Boc) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جس کے معنی 'دولت کا مالک" اور "خوشحال ترین" ہیں۔ "بوچھا" (Bochha)' دیوی کو کہتے ہیں۔[3]

(115) امریکہ کی ریاست فلوریڈا کے جنوبی حصے میں آباد لوگ "سیمینول" (Seminols)' بادلوں سے اوپر رہنے والی اعلیٰ ہستی کو خدا کہتے ہیں۔ جو زندگی دینے اور واپس لینے والا ہے۔ اس کا نام "E-shock-etom-e-see" لیا جاتا ہے۔[4]

(116) ایک روسی قبیلہ "سموائڈ" (Samoyed)' خدائے برتر کی عبادت کرتا ہے جس کو وہ "نومکم' پوائے" (Numkim-pui)....... کہتا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں' وہ ہستی جو اوپر سے سب کو دیکھ رہی ہے۔[5]

---

(1) انگلش پولش ڈکشنری (2) ماؤری پولی نیشن ڈکشنری۔
(3) رشین انگلش ڈکشنری (4) ھیسٹنگز: جلد دوم صفحہ 376
(5) ھیسٹنگز: جلد دوم صفحہ 174

(117) بھارت کے بھاگلپور ڈویژن میں ''سنتل'' (Santals) باشندے ''ٹھاکر'' کی عبادت کرتے ہیں اور اسے اپنا مالک مانتے ہیں اور ہر پانچ سال بعد اس کے نام پر بکریوں کی قربانی دیتے ہیں۔[1]

(118) قدیم مصری باشندے ''سکربس'' (scrabs) کا خدا ''خیپرا'' یا ''خیپری'' تھا۔ جس کے معنی ہوتے ہیں ''خود سے پیدا ہونے والا''[2] یہ نام ''خطِ تصویر'' (Hieroglyphic) سے تعلق رکھتا ہے۔

(119) شمالی بحیرہ اسود کے قریب دریائے ڈانیٹی کی وادیوں میں گھومنے والے خانہ بدوش سائتھینز آگ کی پوجا کرتے ہیں لیکن بت تراشی اور بت پرستی نہیں کرتے۔ بائبل میں ان کے کئی حوالے آتے ہیں۔ بعض لوگ انہیں ''یاجوج ماجوج'' سمجھتے ہیں۔[3]

(120) قدیم عربوں کی سامی نسل (جو خود حضرت نوحؑ کے بیٹے سمجھتے تھے) کے لوگ خدا کو ''اشتورث'' یا ''اشتر'' کہتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خدا انہیں بچے، کھجوریں، اونٹ بکریاں اور بھیڑیں دیتا ہے۔[4]

(121) دریائے نیل کے مغربی کنارے پر آباد لوگ شلک (Shilluk) یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خدا ہوا کی طرح دکھائی نہ دینے والی ہستی ہے جس کا نام ''جوک'' (Juok) ہے۔ یہ لوگ ''نیاکانگ'' (Niakang) کو اپنا پیغمبر مانتے تھے۔[5]

(122) جاپان کا شاہی مذہب ''شنتوازم'' ہے جس میں خدا اعلیٰ ترین مکینِ آسمان ہے، اس کا نام ''تین کامی'' (Teen kami) ہے۔[6]

(123) سائبیریا (روس) کے باشندوں نے خدا کا نام کٹگی یا کٹگ (Kutqi or Kutg) رکھا ہوا ہے۔[7]

(124) انڈونیشیا کا قبیلہ ''سیاؤ'' .... ''داؤتا'' (Dauta) کو خدا مانتا ہے۔[8]

(125) امریکی انڈینز ''سیوو آن'' (Siouans) ..... ''واکونڈا'' کو مافوق الفطرت

(1) ایضاً صفحہ 193 (2) ایضاً صفحہ 224 (3) ایضاً صفحہ 277
(4) ہیسٹنگز: جلد دوم صفحہ 382 (5) ایضاً صفحہ 459
(6) ایضاً 463 (7) ایضاً 496 (8) ایضاً جلد ہفتم صفحہ 248

ہستی سمجھتے ہیں۔[1]

(126) روس' سربیا اور بلغاریہ کے جو لوگ سلاوک زبان بولتے ہیں' وہ اس زبان میں خدا کو "بوگ" (Bog) کہتے ہیں جس کے معنی ہیں دولت[2]۔

(127) صومالی لینڈ (افریقہ) کے لوگ خدا کو "ابا" (Abba) بمعنی باپ یا محافظ کہتے ہیں۔[3]

(128) ہسپینی باشندے خدا کو "ڈیوس" ......(DIOS) کہہ کر پکارتے ہیں۔

(129) سمیریا (قدیم بابل) کے لوگ خدا کو "ایلو" (ILLU) کہتے تھے۔

(130) افریقہ کے ساحلی باشندے خدا کو "مینگومولا" کہتے تھے۔ "کانا منگو" خدائی صفات کے حامل انسان کو کہا جاتا تھا۔ "منگو" ایسی ہستی کو کہا جاتا تھا جو کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو اور اچانک ظہور پذیر ہو سکے۔

(131) سویڈش زبان میں خدا کا نام "گڈ" (Gud) ہے اور گڈینا (Gudinna) ایک دیوی ہے۔

(132) قدیم شام اور آرمینیا کے باشندوں کے خدا کا نام "حداد" (Hadad) تھا۔ عبرانی زبان میں اس کا مفہوم طاقتور یا بے پناہ قوت کا مالک ہے۔ یہ سب سے بڑا خدا سمجھا جاتا تھا جو ان کے عقیدے کے مطابق بجلی کی کڑک کا دیوتا تھا اور بارش بھی برساتا تھا۔[4]

(133) جنوبی افریقہ کا قبیلہ "تاتی" (Tati) "تھورا" کو خدا مانتا ہے۔

(134) طوطانیوں (Teutonics) میں خدا کو "گتھ" (Guth) کہا جاتا تھا جو ان کے عقیدے کے مطابق انسانی روپ دھار کر انسانوں سے ملنے آ جاتا تھا۔

(135) تبت کے لوگ خدا کو "Sapayanrasgzigs" کہتے ہیں جس کے معنی ایک ایسی ہستی ہے جو ہر طرف نظر رکھتی ہے۔ یا وہ ایسا آقا ہے جو "بدھا" اور دیگر مخلوقات کو بھی رحم و کرم کی نظر سے دیکھتا ہے۔[5]

---

(1) ھیسٹنگز: جلد دوم صفحہ 576 (2) Serbo-croatian Language Dictionary

(3) ھیسٹنگز: جلد ششم۔ دیکھئے ایسٹ افریقہ۔ (4) ھیسٹنگز: جلد 12' صفحہ 166

(5) ایضاً ایضاً صفحہ 332

(136) نلگیری ہلز (انڈیا) کا ٹوڈا قبیلہ خدائے واحد پر یقین رکھتا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ خدا نے اس قبیلے کو بھی پیدا کیا اور اس کی روزی کے لیے بھینس بھی پیدا کی تاکہ یہ اس کا دودھ پی کر زندہ رہ سکیں۔[1]

(137) ٹونگن قبیلہ خدا کو ''ایلو'' (Allo) کہتا ہے۔

(138) مشرقی چین کے وحشی قبیلہ ''ٹنگس'' (Tungus) کا خدا ''ہاوک'' (دھوپ) ہے اور وہ دھوپ کی پوجا کرنے کے لیے گھروں سے باہر نکل جاتے ہیں۔[2]

(139) اسلام قبول کرنے سے پہلے تُرک ''یلجن'' (YULGEN) کو سب سے بڑا خدا مانتے تھے۔ اس کے لفظی معنے ساتویں آسمان پر رہنے والی ہستی ہے۔[3]

(140) ایک اور ترک قبیلہ ''تانری'' (Tanri) کو خدا مانتا تھا۔ تانری کے معنی ہوتے ہیں ''سنہری خدا''۔[4]

(141) کاکیشیا کے قبیلہ ''ٹشز'' (Tushes) کا خدا ''خاتی'' (Khati) ہے جو آسمان پر رہتا ہے۔[5]

(142) یوگنڈا (افریقہ) کے لوگ اپنے خدا کو ''کوکاسا'' (Kokasa) کہتے ہیں جس کے معنی ہوتے ہیں رحم کرنے والا اور مہربان۔[6]

(143) ویلش لوگ خدا کو ''ڈو'' (Duw) اور دیوی کو ''ڈووس'' (Duwis) کہتے ہیں۔[7]

(144) شمالی امریکہ کے میدانی علاقے کے انڈینز ''ویکونڈا'' (Wakonda) کو خدا مانتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ زندگی کے تمام واقعات ویکونڈا کی ہدایت کے تحت متشکل ہو رہے ہیں۔[8]

---

(1) ایضاً ایضاً صفحہ 354 (2) ھیسٹنگز: جلد 12، صفحہ 476......

(3) ایضاً ایضاً 482 (4) Turkish-English Dictionary Oxford

(5) ھیسٹنگز: جلد 12 صفحہ 484 (6) ایضاً عنوان ''یوگنڈا''

(7) Welish-English Dictionary

(8) ھیسٹنگز جلد دہم صفحہ 54

(145) یڈش زبان استعمال کرنے والے جرمن اور یہودی ''نایئت'' (Naet) کو خدا مانتے ہیں جبکہ دیوی کو ''ناؤتھیٹ'' (Naotheat) کہتے ہیں۔[1]

(146) افریقی ''غلاموں کے ساحل'' کے نیگرو قبائل ''یروبا'' جو لوئر نائیجر اور داہومی کے درمیان رہتے ہیں ''اولوئن'' (Oloen) کو خدا مانتے ہیں جس کے معنے ہوتے ہیں آسمان کا مالک۔[2]

(147) چیک (سابق چیکوسلواویکیہ) جو بوہیمیا اور موراویہ کی زبان ''شیک'' (Shek) بولتے ہیں خدا کو ''بوہ'' (Buh) کہتے ہیں اور دیوی کے لیے ''بوہین'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

(148) زرتشت جو اصل میں ایران النسل ہیں' اپنے ملک کے کئی افراد کو رسول مانتے ہیں۔ ان میں سے ''زوروسٹر'' سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ان کے خدا کا نام ''آہورہ مزدا'' یا ''آرمزد'' ہے' جس کے معنی روشنی کے ہیں۔[3]

(149) نٹال (افریقہ) کے اصل باشندے ''زولوس'' جو سب سے بڑا ''بنتو'' قبیلہ شمار ہوتے ہیں' ان میں سے زیادہ تر عیسائی ہیں یہ نہایت بلند قامت اور جسمانی قوت کے لحاظ سے بہت مضبوط ہوتے ہیں' ان کے خدا کا نام ''انکل کولو'' (Unkullkulu) ہے۔ اس کے معنے ہوتے ہیں بہت قدیم۔[4]

(150)-(155) بعض قبائل بے نام خدا کی پوجا کرتے ہیں' اس کے لیے وہ آٹھ الفاظ استعمال کرتے ہیں' مثلاً دارامولم' پاوی' تیراوا' ہوکچل' تیتوالی' بہنار' بوگلے اور گینا ویسیناسی۔ ان سب ناموں کے تین معنے ہوتے ہیں' ''ہمارا باپ'' ''باپ کی روح'' اور ''دادا''[5]

❁ ❁ ❁

(1) یڈش انگلش ڈکشنری۔ (2) F.Max Muller ہبرٹ لیکچرز۔
(3) ھیسٹنگز: جلد 12' صفحہ 864 (4) ایضاً جلد 2 صفحہ 364
(5) ایضاً جلد 9 صفحات 178 تا 180۔ بعنوان ''بے نام خدا''

مختلف قوموں کا تصور خدا

مختلف اقوام خدا کو کن ناموں سے پکارتی رہی ہیں اور آج اس کے بارے میں کیا تصور رکھتی ہیں؟ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کائنات سے لے کر آج تک انسان اس بزرگ و برتر ہستی کے بارے میں کافی سوچ بچار کرتا رہا ہے۔ اور اس کا تصور اس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزین ہے۔ روئے زمین پر پائی جانے والی ہر قوم نے خدا کے لیے اپنا الگ نام رکھا ہوا ہے خواہ وہ قوم بلند ترین تہذیب و تمدن کی علمبردار ہے یا سب سے نچلے درجے کی تہذیب کی مالک ہے جیسا کہ کہا گیا ہے:

Ethiop gods have Ethiop lips.

Bronze cheeks and wooly hair;

The Grecian gods are like Greeks.

As Keen-eyed, old and fair.

ترجمہ:۔

حبشہ کے دیوتاؤں کے ہونٹ ہیں حبشیوں جیسے۔
رخسار کانسی جیسے اور بال ہیں اُون جیسے۔
یونانیوں کے دیوتا ہیں یونانیوں جیسے۔
تیز نظریں' مہارت کا مظہر' ان کا روشن چہرہ۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنوں میں حقیقی خدا کا بھی کچھ تصور موجود رہا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن نے حبشہ کے پیغمبر حضرت لقمان کی تعلیمات کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے بظاہر اپنے بیٹے کو نصیحتیں کیں جو اپنی قوم کو پہنچانا مقصود تھیں ظاہر ہے کہ قوم نے ان

پند و نصائح کو کسی حد تک قبول ہی کیا ہوگا۔

خدا یعنی اس بزرگ اور بالاتر ہستی کے 155 ناموں میں سے چند ایک کو چھوڑ کر' باقی وہ بہترین نام ہیں جو اقوام عالم نے خدا کے لئے موزوں سمجھے اور اسے بہترین نام سے پکارتی رہی اور اس سے مدد مانگتی رہی۔ بعض قوموں نے ایک الٰہ (معبود) کے ساتھ اس کے کئی مددگار اور شرکاء بھی فرض کئے ہوئے تھے اور اس کی مادہ' دیویاں بھی تجویز کر رکھی تھیں اور بیٹے بیٹیاں بی۔ تاہم یہ ایک ہی ''جڑ'' یا ''بنیاد'' (Root) سے ماخوذ تھیں۔ اور وہ جڑ ہی کو 'بالادست' اور ''اعلیٰ و ارفع'' سمجھتی تھیں۔

خدا کے ان 155 ناموں کے تجزیے سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

(1) چالیس (40) سے زائد زبانوں میں اس اعلیٰ و ارفع ہستی کو ''مکینِ عرش'' کہا جاتا ہے۔

(2) تقریباً 26 زبانوں میں اسے ''گاڈ''.......(God) کہا جاتا ہے۔

(3) 18 قومیں اسے ''آقا''.......(Master) پکارتی ہیں۔

(4) 15 زبانوں میں اسے نور (Light)' مقدس ترین آسمانی ہستی' یا سورج (Sun) کہا جاتا ہے۔

(5) چودہ قومیں اسے اپنا خالق کہہ کر پکارتی ہیں۔

(6) چھ اقوام اُسے رحیم و کریم کہتی ہیں۔

(7) پانچ زبانوں میں اُسے جلیل القدر (Glorious) کہا جاتا ہے۔

(8) پانچ بڑے بڑے گروہ اور قبائل اُسے خدائے علیم و خبیر اور علام الغیوب (Omniscient) کہتے ہیں۔

(9) چار قومیں اُسے ''عظیم باپ'' کہتی ہیں۔

(10) سات قبیلے اُسے 'اعلیٰ روح'' پکارتے ہیں۔

(11) تین اقوام اُسے قادر مطلق کہتی ہیں۔

(12) بعض اقوام اس کو ہر جگہ حاضر و ناظر' داناو بینا' ربّ العالمین کہتی ہیں۔ اور چند اقوام اُسے بے نام (Nameless) خدا کہتی ہیں۔ ہندو اُسے ''کا دیوا'' کہتے ہیں اور قومِ

فرعون اس کو "کھیم" (Khem) کہتی تھی۔

"ہمارا آسمانی باپ"

بوسٹن میں ایک مذہبی اجلاس کے دوران ایک عیسائی پادری نے انجیل میں سے چند اقتباسات پڑھ کر سنائے اور دعویٰ کیا کہ دنیا کے کسی مذہب کی مقدس کتابیں ان تعلیمات کا مقابلہ نہیں کرسکتیں' اس پر رالف والڈو ایمرسن کھڑا ہو گیا اور کہا کہ "فاضل مقرر کے ریمارکس سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس نے کتنی تنگ نظری سے انجیل کا مطالعہ کیا ہے" خدا کی ہستی کا کوئی ایک بھی ایسا پہلو نہیں کہ جس پر تہذیب یافتہ کہلوانے والی قومیں ایمان رکھتی ہوں اور وحشی ترین اقوام اور حبشی قبیلے اس پہلو پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔ چالیس اقوام یہ ایمان رکھتی ہیں کہ خدا آسمانوں میں رہتا ہے اور وہ اُسے "ہمارا آسمانی باپ" کہتی ہیں۔

مذہبی کتابوں میں "آسمان" "HEAVEN" ایک بڑا دلچسپ اور معلومات افزا موضوع ہے۔ عہد وسطیٰ کی انگلش میں اسے "Heuen" (Heofen) کہتے تھے۔ اس سے زمین کے اوپر کا خلا مراد لیا جاتا تھا' خاص طور پر قوس کی طرح کا وہ گھیرا، یا قبہ جس میں سورج' چاند اور ستارے دکھائی دیتے ہیں' آسمان سمجھا جاتا تھا۔ ابتدائی علمِ کونیات (COSMOLOGY) میں زمین کے گرد کے خلا کو "سلسلہ ہائے سماوات" میں تقسیم کر دیا گیا تھا (ان کی تعداد سات سے گیارہ تک فرض کر لی گئی تھی۔) بعض روحوں یا دیوتاؤں کا ٹھکانہ ان میں سے پہلا آسمان سمجھا جاتا تھا اور بعض کا دوسرا یا تیسرا آسمان ٹھکانہ سمجھ لیا گیا تھا۔ الہامی ادب اور یہودی فقہائے قرون وسطیٰ کی تحریروں میں اس موضوع پر خاصا مواد موجود ہے۔ عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید سے ان کے خیالات کی کافی تائید ہوتی ہے۔

ذیل میں ہم ان عہد ناموں اور چینی مذہبی کتابوں میں خدا اور اس کے مقام سے متعلق تصورات دے رہے ہیں۔

توریت اور انجیل

(1) خدا نیچے کوہِ سینائی کی چوٹی پر آیا۔ (Exod.,19:20,21)

(2) خدا آسمانوں میں ہے۔ (Deut. 4:39)

(3) خدا کے رہنے کی جگہ آسمان ہیں۔ (1.Ki.8:30, 32,36,39)

(4) اے ہمارے آباؤ اجداد کے خدا، کیا تو آسمانوں میں خدا نہیں ہے۔ (2 chr.20:6)

(5) خدا کا تخت آسمان میں ہے۔ (Psa 11:4)

(6) لیکن آسمان میں خدا ہے۔ (Dan.2:28)

(7) اپنے خدا کی عظمت بیان کرو جو آسمان میں ہے۔ (Matt. 5:16)

(8) یہ کہ تم اپنے اس باپ کے بچے ہو جو آسمان میں ہے۔ (Matt, 5:45)

(9) لہٰذا تو کامل بننے کی کوشش کر۔ اس کے باوجود کہ تمہارا خدا وہ ہے جو آسمان میں ہے۔ (Matt., 5:48)

(10) لہٰذا دعا کر، اس خدا سے جو آسمان میں ہے۔ (Matt., 6:9)

(11) یہ گہرے بادل اس کے لیے ایک پردہ ہیں تاکہ وہ نہ دیکھے اور آسمان میں چلتا رہے۔ (Job, 22:14)

(12) خدا آسمان پر ہے اور تُو زمین پر۔ اس لیے تمہارے الفاظ کم ہونے چاہئیں۔ (Ecc. 5:2)

(13) زمین پر کسی شخص کو اپنا باپ مت کہو تمہارا باپ تو وہ ہے جو آسمان میں ہے۔ (Matt., 23:9)

(14) کوئی شخص آسمان پر نہیں چڑھا لیکن وہ آسمان سے اترا' حتیٰ کہ انسان کا بیٹا بھی' جو آسمانوں میں ہے۔ (John, 3:13)

عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید میں خدا آسمان میں ہے' یا وہ وہاں رہتا ہے۔ چینی مذہبی کتابوں کے مطابق بھی خدائے بزرگ و برتر' اوپر یا آسمان میں ہے۔ ان کتابوں میں ''خدا'' اور آسمان میں کوئی فرق نہیں کیا گیا (shu-king, 3:12,14; the Hsiou-king,o)

مثلاً:

(1) تائی ''Ti'' (خدا) آسمان میں ہے....... (Yi-king, appendix 1:3)

(2) تائی ''Ti'' (خدا) کے مقرر کردہ بادشاہ اور خدا آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ (Shu-king 2:4; 1:4:8:1)

(3) آسمان تھنگ ''Thung'' (خوفناک بادشاہوں) کو اس لیے مقرر کرتا ہے کہ وہ بدمعاشوں کو سزائیں دیں۔ (ایضاً.......4:2،2)

(4) نیک بادشاہ' خدا (آسمان) کا دوست ہے۔ (ایضاً 4:5،3)

(5) آسمان' بدمعاش بادشاہ پر لعنت بھیجتا ہے۔ (ایضاً 5:2،5;5:19،3)

(6) بادشاہ، آسمان کا بڑا بیٹا اور اس کا نائب ہے۔ (ایضاً 5:12،2)

(7) نیک بادشاہ آسمان میں چلا جاتا ہے اور خدا کے بائیں اور دائیں جگہ پاتا ہے۔ (شوکنگ' Decade Iode)

(8) آسمان نیک بادشاہ سے کلام کرتا ہے (ایضاً، ایضاً)

(9) بادشاہ آسمان کے سامنے قربانیاں اور نذریں پیش کرتے ہیں۔ (ایضاً 2:1)

(10) روحانی فرمانروا' بلند آسمانوں میں ہے۔ (ایضاً 5:1،1)

(11) تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ بلند آسمانوں کے مکین کی عبادت کرو۔ (ایضاً Li-king4:2،3،8)

(12) گرمیوں میں بارشیں لانے کے لیے آسمان کی خدمت میں قربانیاں پیش کرو۔ (ایضاً 4:2،8)

چینیوں کا کہنا ہے کہ ''شانگ۔تی'' کا نام لاپرواہی سے نہیں لیا جانا چاہیے وہ بہت

بڑی ہستی ہے' اس لیے اس کا نام اس کی ''جائے قیام'' یعنی آسمان کے حوالے سے لیا جانا چاہیے۔ وہ ''آسمان''، ''آسمانوں کے آسمان'' یا ''آسمان اعلیٰ'' کا ''مکین'' ہے۔ دنیا کی تقریباً بیس اقوام' بشمول یہود' عیسائی چینی' ابی سینیا کے حبشی' افریقہ کے سیاہ فام' منگولیا کے بوریت' باشندگانِ یونان' فرانس' سپین جرمنی اور آئرلینڈ' یہی ایمان رکھتے ہیں کہ خدا آسمان میں رہتا ہے۔

عہد نامہ قدیم و جدید میں آسمان کو موت کے بعد نجات پانے والوں کی روحوں کی قیام گاہ بھی بتایا گیا ہے۔ سورج چاند اور ستاروں کو بھی آسمان میں معلق سمجھا جاتا ہے۔ ہندو خدا کو ''دایس پتر'' (DYUS PITAR)' یعنی ''ہمارا باپ۔ آسمان'' اور اپنی الہامی کتابوں کو ''آکاش بانی'' کہتے ہیں۔

اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نام اس بزرگ و برتر ہستی (Divine being) کا ذاتی یا خصوصی نام نہیں ہے۔ بلکہ ان سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ایسی ہستی ہے جو اوپر رہتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کو قرآن میں یہ بتایا گیا ہے:

(i) وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّی فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ.

(اور اے نبیؐ میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے' میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں (یہ بات تم انہیں سنا دو) شاید کہ وہ راہِ راست پالیں......سورۃ البقرہ آیت 186)

(ii) اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ......(یقیناً میرا ربّ قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے......سورۃ ھُود' آیت 61)

(iii) وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ (اور ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں......سورۃ قٓ' آیت 61)

خدا

''آسمان'' کے بعد دوسرا اہم نام ''خدا'' ہے جس سے کہ ربِّ کائنات کو یاد کیا جاتا ہے یا پکارا جاتا ہے۔ پرانی انگلش' پرانی فریزشین (ہالینڈ کی زبان) اور پرانی سیکسن زبان میں ''God'' (چھوٹے g کے ساتھ) بہت عام ہے۔ پرانی جرمن اور عہدِ متوسط کی جرمن زبان میں ''Got''، جدید جرمن میں ''Gott''۔ گاتھک میں ''Guth'' پرانی نارسک میں ''Godh'' اور ''Guth'' کے الفاظ خدا کے لیے بولے جاتے ہیں۔ طوطانی (Teutonic) زبانوں میں لفظ ''God'' بطور اصطلاح بولا جاتا تھا جس سے مراد دیوی دیوتا لیے جاتے تھے جو انسانی صورت وسیرت سے متصف ہو کر دنیا میں آتے تھے۔ یا ایسے انسان تھے جنہیں خدائی قوتوں کے مظہر سمجھا جاتا تھا یا وہ خدا تھے جو بقول ان کے' بندوں کے حالات دیکھنے کے لیے انسانی روپ دھار کر دنیا میں اتر آئے تھے۔ طوطانی قوم نے جب عیسائیت قبول کر لی تو لفظ ''خدا'' کے مفہوم میں مسیحی الوہیت بھی شامل کر لی گئی۔ زمانۂ الحاد (Heathen period) میں یہ بے جنس (نہ مذکر نہ مؤنث) تھا لیکن زمانۂ مسیحیت میں مذکر شکل اختیار کر گیا۔ تمام یورپی زبانوں میں لفظ ''گاڈ'' (چھوٹے g کے ساتھ) چھوٹے خداؤں اور نیم دیوتاؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ''زوس'' (zeus)' جوپیٹر' آرس (Ares)' اپالو' ڈیانس' تائیکی (Tyche)' پان (Pan)' نائیک (Nike) اور موارائی (Moirai) بالترتیب جنگ' محبت' شراب' جیت' ریوڑوں کی نگہبانی' فتح اور قسمت کے دیوتا اور دیوی مانے جاتے ہیں۔

''خدا''......''god'' کی اصطلاح کی یوں تشریح کی گئی ہے:

(1) ایک ایسی ہستی جو بنی نوع انسان کی بہ نسبت زیادہ صفات اور قوتیں رکھتی ہو۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ مافوق الفطرت مظاہر کی قدرت رکھتا یا رکھتی ہو اور کسی معاشرے میں وہ قابلِ قبول حیثیت کا مالک (کی مالکہ) ہو جس کی بنا پر اسے قابلِ عبادت قرار دیدیا گیا ہو۔ تمام خداؤں یا دیوتاؤں کو قابلِ عبادت نہیں سمجھا جاتا' خواہ وہ اعلیٰ ترین خصوصیات ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔

(2) کوئی بھی چیز (خواہ مصنوعی طور پر بنائی گئی ہو' نقش کاری کی گئی ہو یا وہ جانور یا

درخت ہو) جس کے بارے میں گمان ہو کہ یہ کسی مافوق الفطرت ہستی سے نسبت رکھتی ہے' یہاں اس نے قیام کیا تھا یا اس نے اسے چھوا تھا۔

(3) بزرگ و برتر ہستی' دائمی و مستقل حیثیت کی حامل' روح' خالق یا کائنات کی مالک۔

(4) حکمران' غالب اور بے پناہ قوتوں کا مالک۔اور

(5) ''خدا'' (god) اس معنی میں بھی استعمال کیا گیا کہ وہ تھیٹر کی گیلری میں بیٹھا تھا۔ ''منظر کی تبدیلیوں کے درمیانی وقفے میں ایک نوجوان خدا نے ناظرین کو گانا سنا کر محظوظ کیا'' (Thackeray, Satan God of this world)

بائیبل میں خدا کی حیثیت

(1) خدا نے موسیٰ سے کہا "اور وہ (ہارون) تیری طرف سے لوگوں سے باتیں کرے گا اور وہ تیرا منہ بنے گا اور تو اس کے لیے گویا خدا ہوگا ○ اور تو اس لاٹھی کو اپنے ہاتھ میں لیے جا اور اسی سے ان معجزوں کو دکھانا۔" (خروج 16:4)

(2) "پھر خدا نے موسیٰ سے کہا۔ دیکھ میں نے تجھے فرعون کے لیے گویا خدا ٹھہرایا اور تیرا بھائی ہارون تیرا پیغمبر ہوگا" (خروج 1:7)

(3) "اور بنی اسرائیل نے بعل بریت (Baalberith) کو اپنا خدا بنا لیا (قضاۃ "Judges"...... 33:8)

(4) خدا نے شیطان کا یوں حوالہ دیا: "یعنی ان بے ایمانوں کے واسطے جن کی عقلوں کو اس جہان کے خدا (شیطان) نے اندھا کر دیا ہے تاکہ مسیح جو خدا کی صورت ہے' اس کے جلال کی خوشخبری کی روشنی ان پر نہ پڑے۔ (کرنتھیون دوم...... 4:4)

(5) دوسری قوموں کے خداؤں کو عجیب وغریب خدا قرار دیا گیا:
"فقط خداوند ہی نے ان کی رہبری کی اور اس کے ساتھ کوئی اجنبی خدا نہ تھا"...... استثناء" "Deut" 12:32): "تیرے درمیان کوئی اجنبی (غیر) خدا نہ ہو اور تو کسی اجنبی خدا (غیر معبود) خدا کو سجدہ نہ کرنا" (زبور" "Psalms" 9:81): "ایک اجنبی خدا کے ساتھ' جسے وہ تسلیم کرے گا" سیموئل" "Daniel" 39:11)

(6) "تمہارا خداوند' خداؤں کا خدا ہے"......('Dan. 47:2)

(7) "تیری بادشاہت میں ایک ایسا آدمی ہے جس کے اندر مقدس خداؤں کی روح ہے" ('Dan. 11:5)

(8) ''وہی روشنی' سمجھ اور عقل جیسی کہ خداؤں کی ہے' اس میں پائی گئی''.......(11:5 'Dan.)

(9) ''لیکن تو میرے خداؤں (بتوں) کو کیوں چرا لایا ہے؟''.......(کتاب پیدائش 30:31)

مختصر یہ کہ ''خدا'' (god) خداوندِ قدوس کا ذاتی نام نہیں ہے اس سے بُت' شبیہہ' شخص' شیطان (خدائے دنیا)' کوئی معزز شخص حیوانی خدا' اور کوئی جھوٹا معبود بھی مراد لیا گیا ہے۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تکرار کرتے ہوئے کہا......'' تو ایک عام آدمی ہو کر بھی خود کو خداوند سمجھتا ہے؟'' حضرت عیسیٰؑ نے انہیں جواب دیتے ہوئے کہا' کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا تم خدا ہو' جبکہ اس نے انہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا (اور کتابِ مقدس کا باطل ہونا ممکن نہیں)۔ تم اس شخص سے' جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا کہتے ہو' کہ تو کفر بکتا ہے' اس لیے کہ میں نے کہا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں۔ اگر میں اپنے باپ کے کام نہیں کرتا تو میرا یقین نہ کرو'' (یوحنا 33:10 تا 37)

خدا کا نام بطور ''روشنی''

قدیم ذہنوں کے لیے روشنی ایک مقدس چیز تھی اور مذہبی کتابوں نے اسے خدا سے وابستہ کر دیا۔ ویدوں میں دیوپتر (آسمانی باپ)' ''سُر یاہ'' (سورج) اور ''اگنی'' (آگ) کو دیوتا سمجھ کر پوجا جاتا ہے۔ ''اگنی'' زمین کا دیوتا اور ''سُر یاہ'' آسمان کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ پھر ایک اور تقسیم یہ تھی کہ اگنی برہمنوں کا دیوتا تھا۔ اندرا' کھشتریوں کا اور وشوا دیوا' تاجروں اور کسانوں (ویشیا) کا دیوتا تھا۔ بائبل میں آتا ہے ''تو نور کو پوشاک کی طرح پہنتا ہے اور آسمانوں کو سائبان کی طرح تانتا ہے''.......(زبور 2:104) ''خدا نور ہے اور اس میں اندھیرا بالکل نہیں ہے'' (یوحنا کی انجیل 5:1) زبور کے باب 4 آیت 6 میں آتا ہے ''اے خداوند تو اپنے چہرے کا نور ہم پر جلوہ گر فرما''...... یوحنا کی انجیل کے باب 1' کی آیات 4 اور 5 میں آتا ہے۔ ''اس میں زندگی تھی اور وہ زندگی آدمیوں کا نور تھی۔ اور نور تاریکی میں چمکتا ہے اور تاریکی

نے اسے قبول نہ کیا۔"

عبرانی زبان میں روشنی (نور) کو"ایش" اور"اُر" (ESH-Ur) کہتے ہیں۔ جبکہ اس کے اصلی معنی"آگ" کے ہیں۔ قدیم انسان کو آگ کے سوا کوئی ایسی مادی چیز نظر نہ آئی جسے وہ خدائی کا درجہ دے سکتا۔ چنانچہ زرتشتوں کی مذہبی کتابوں میں اسے قابل پرستش قرار دے دیا گیا۔"اور خداوند ان کو دن کو راستہ دکھانے کے لیے بادل کے ستون میں اور رات کی روشنی دینے کے لیے آگ کے ستون میں ہو کر ان کے آگے آگے چلا کرتا تھا تاکہ وہ دن اور رات' دونوں میں چل سکیں" (خروج 21:31) اور آگے خروج ہی میں باب 40' آیت 38 میں آتا ہے:"کیونکہ خداوند کا بادل اسرائیل کے سارے گھرانے کے سامنے اور ان کے سارے سفر میں دن کے وقت تو مسکن کے اوپر ٹھہرا رہتا اور رات کو اس میں آگ رہتی تھی۔ اس طرح"گنتی" (Numbers) میں 15:9؛ 34:10؛ 14:14؛"استثناء" (Deuteronomy) میں 33:1' نحمیاہ (Nehemiah) میں 12:9؛ 19"زبور" (Psalms) میں 1:78؛ 7:99؛ 39:105؛ عیسیاہ (Isaiah) میں 5:4؛ کورنتھیوں کے نام پہلا عام خط (Icor) میں (1:10) میں بھی خدا کے لیے نور اور آگ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

خدا کی فطرت کے اظہار کے لیے ان دو انسانی پہلوؤں کو یسعیاہ (Isaiah) کو یکجا کر دیا گیا ہے' مثلاً باب 10' آیت 17 میں آتا ہے......"بلکہ اسرائیل کا نور ہی آگ بن جائے گا اور اس کا قدوس ایک شعلہ ہوگا اور وہ اس کے خس و خار کو ایک دن میں جلا کر بھسم کر دے گا۔"کون ہم میں سے اس مہلک آگ میں رہ سکتا ہے اور کون ہم میں سے ابدی شعلوں کے درمیان بس سکتا ہے" یہ الفاظ یسعیاہ کی صحیح تعبیر ہیں ان کا کتابِ خروج کے باب 3' آیت 2 سے موازنہ کیجیے۔"اور خداوند کا فرشتہ ایک جھاڑی میں سے آگ کے شعلہ میں اس پر ظاہر ہوا۔ اس نے نگاہ کی اور کیا دیکھتا ہے کہ ایک جھاڑی میں آگ لگی ہوئی ہے پر وہ جھاڑی بھسم نہیں ہوتی۔ تب موسیٰ نے کہا میں اب ذرا کترا کر اس بڑے منظر کو دیکھوں کہ یہ جھاڑی جل کیوں نہیں جاتی۔......خدا کی آگ یقیناً دائمی ہوتی ہے۔"

تاہم عہد نامہ عتیق کے مطابق آگ صرف ذریعۂ تباہ کاری ہی نہیں یہ صیقل گر (Refiner) کے ہاتھ میں یہ خالص دھات کو میل (Dross) سے الگ کرنے کا آلہ بھی بن

جاتی ہے......"دیکھ! میں نے تجھے صاف کیا لیکن چاندی کی مانند نہیں۔ میں نے مصیبت کی کٹھالی میں تجھے صاف کیا" (یسعیاہ باب 48: آیت 10)

اور روشنی کیا ہے؟

بہت سی چیزیں جو فی الحال حقیر اور بے وقعت دکھائی دیتی ہیں' وہ تمہارا مذاق اڑانے کے بعد سنگین نوعیت اختیار کر جائیں گی۔ تقریباً سبھی مذہبی کتابوں میں خدا کو "روشنی" کہا گیا ہے۔ لیکن روشنی کیا ہے؟ یہ "دکھائی دینے" کے لیے ایک "لازمی شرط" کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا ذکر تاریکی کے مقابلے میں کیا جاتا ہے۔ انجیل میں آتا ہے: "اور خدا نے کہا: روشنی ہو جا؛ اور روشنی ہوگئی۔" (کتاب پیدائش باب 1' آیت 3)۔ عبرانی میں "روشنی" کا ہم معنی لفظ "آگ" ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آگ شعور کی ایک مادی شکل (Object of perception) ہے۔ شعلے روشنی دیتے ہیں۔ ہم سورج کی روشنی دیکھتے ہیں۔

یہ انرجی کی ایک قسم ہے جو ہمارے اعضائے بصارت پر اثر انداز ہو کر انہیں "دیکھنے کا کام" انجام دینے کے قابل بناتی ہے۔ نظریۂ تموّج نور (Wave theory) کے مطابق روشنی کی ترسیل برقناطیسی امواج کی طرح ہوتی ہے۔ یہ روشن اشیا سے منعکس ہو کر ہماری آنکھوں تک پہنچتی ہیں۔ روشنی کی رفتارِ ترسیل 186,300 میل فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ کتاب پیدائش کے باب 1' آیت 1 تا 5 میں آتا ہے۔ "خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا۔ اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی اور خدا نے کہا روشنی ہو جا' روشنی ہوگئی اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے' جس پر اس نے اسے تاریکی سے جدا کر دیا۔ خدا نے روشنی کو دن قرار دیا اور تاریکی کو رات کہا۔ اور شام ہوئی اور صبح ہوئی' سو پہلا دن مکمل ہو گیا۔" یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ روشنی سے پہلے اندھیرا تخلیق کیا گیا تھا۔

روشنی تمام رنگوں کا مجموعہ ہوتی ہے اور اس میں بیسیوں ہلکے رنگ' مدھم علامتیں' بے شمار حرکات اور اثرات پائے جاتے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کو تاریکی اور روشنی دونوں کا خالق بتایا گیا ہے جبکہ بعض مذاہب میں تاریکی اور روشنی کے الگ الگ خدا بتائے گئے ہیں۔

تاریکی' روشنی کی عدم موجودگی (Absence) کا نام ہے۔ کیونکہ اس میں رنگ نہیں ہوتے لیکن اسے روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ہم اندھیرے کمرے میں ماچس کی تیلی جلائیں تو اس کی ہلکی سی روشنی میں بھی اندھیرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ ایک طرف کہا گیا ہے کہ خدا روشنی ہے اور دوسری جانب بتایا گیا ہے کہ خدا گہری تاریکی میں رہتا ہے۔ (خروج 21:20؛ استثناء 22:5؛ زبور 13:6؛ 2:97؛ ۔ "2 تواریخ" (II.chr.) 1:6)

کرسٹوفر مورلے لکھتا ہے: زمین کو عطا شدہ تحائف میں سے سب سے پہلا اور سب سے بڑا تحفہ تاریکی تھی۔ اور یہ روشنی (نور) سے پہلے وارد ہوئی۔ جیسا کہ انجیل کی کتاب پیدائش میں بتایا جا چکا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تاریکی انسان کو فطری اور ہمہ گیر (universal) دکھائی دیتی ہے۔ اس کے لیے نہ کسی وضاحت کی ضرورت ہے اور نہ سبب بتانے کی حاجت۔ بس یہ ہمارا ایک دعویٰ ہے۔ ہمارے ذہن میں روشنی ایک ایسا تطہیری (cleansing) عمل ہے جو تاریکی کو دفع کرتا ہے' مگر اس کے لیے کسی منبع (Origin) کی ضرورت پڑتی ہے یعنی لیمپ وغیرہ' درکار ہوتا ہے جو چمکتا رہے اور روشنی بکھیرتا رہے۔ عظیم ترین مشعل "سورج" سے لے کر چمکتے ہوئے پیٹ والے جگنو تک' ہم سب کو روشنی کے مظاہر سمجھتے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی قریب القیاس ماخذ سے تابانی حاصل کی ہے۔ ہم روشنی کا خیال ذہن میں لائے بغیر تاریکی کا تصور کر سکتے ہیں لیکن تاریکی کے بغیر روشنی کا تصور نہیں کر سکتے۔ شہروں کی گلیاں رات کو انسان کی صناعی کا شاندار کارنامہ دکھائی دیتی ہیں۔ اس نے فطرت کے دیگر عطیات کی طرح تاریکی کو بھی ایک عطیہ سمجھا اور اسے اپنی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا۔ دکانوں اور گھروں میں روشنیوں کے متنوع نمونے بنائے اور راتوں کو ان کی مدد سے خوب صورت سے خوبصورت تر بنا دیا۔ جو لوگ تاریکی کو شیطان کی تخلیق سمجھتے ہیں یا تاریکی کے الگ خدا کا تصور رکھتے ہیں وہ محرومانِ عقل و دانش ہیں۔ وہ شیطان کو خوش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں' جیسا کہ ایک بوڑھی عورت رات کو دو موم بتیاں جلایا کرتی تھی' ایک' سینٹ مائیکل کی خوشنودی کے لیے اور دوسری شیطان کو خوش کرنے کے لیے۔ تا کہ مرنے کے بعد خواہ وہ جنت میں جائے یا دوزخ میں' اسے وہاں ایک دوست میسّر آ جائے۔

روشنی' بعض چیزوں کو مرئی (ظاہر) بنا دیتی ہے اور بعض کو غیر مرئی (پوشیدہ) کر

دیتی ہے۔ ہم دن کے وقت روشنیوں کی وہ دنیا نہیں دیکھ سکتے جو اندھیرے میں شان و شوکت سے سامنے آجاتی ہے۔ بلند پایہ خیالات' روشنی کی بہ نسبت تاریکی میں زیادہ سُوجھتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا تھا۔ ''اے فیض رساں تاریکی تیرا آنا مبارک' آؤ اپنی خوشبودار مرہم' اپنے ساتھ لاؤ' دن کی روشنی نے میری آنکھیں دکھا دی ہیں' آؤ اپنے نرم نرم قدیم بڑھاتی ہوئی' اپنے سرمئی لباس میں میرے قریب آؤ۔ خشخاش کے بیجوں کے زیر اثر آنے والی گہری نیند کا سا سکون مہیا کرو''

قرآن کے نزدیک روشنی کی دو قسمیں ہیں' مادی یا طبعی روشنی اور روحانی روشنی۔ خدا کی اولین ''تخلیق'' جو کہ ہفتے کے چند دنوں کے اندر تخلیق ہوئی ''استدلال کی روشنی'' (Light of reason) تھی۔ یہ اس کا اہم ترین کام تھا۔ یہ اہل ایمان کے لیے راستے کی روشنی ہے' ذیل کی قرآنی آیات اس ضمن میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

(i) اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے......سورۃ النور آیت 35)

(ii) یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَیَاْبَی اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں ہے۔ خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو.......(سورۃ التوبہ آیت 32)

(iii) یٰٓاَهْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ.......
(اے اہل کتاب' ہمارا رسول تمہارے پاس آگیا ہے جو کتاب الٰہی کی بہت سی ان باتوں کو تمہارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک حق نما کتاب.......سورۃ المآئدۃ آیت 15)

یہاں اللہ کی طرف سے بھیجی گئی دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ روشنی اور ایک واضح کتاب۔ روشنی سے مراد نبی اکرمؐ ہیں اور کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔ آنحضرتؐ زمین پر

بھیجی گئی سب سے بڑی روشنی ہیں۔اس لیے انہیں سراجِ منیر کہا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا۔ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا

اے نبیؐ، ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اللہ کی اجازت سے، اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر.......سورۃ الاحزاب آیات 46,45)

توحیدِ باری تعالیٰ

توحیدِ باری تعالیٰ' ایک ایسا نقطہ ہے جس پر اسلام نے سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ توحید انسانی تہذیب کو نہ صرف منظم کرتی ہے بلکہ ایک رُخ اور سمت بھی عطا کرتی ہے۔ یہ نہ ہو تو انسانیت منتشر ہو جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ توحید ہی انسانی تہذیب کی حقیقی بنیاد ہے تو غلط نہ ہوگا۔ لیکن اس سے مراد کسی ایک قوم یا کسی ایک ملک کی تہذیب نہیں بلکہ پوری انسانیت کی تہذیب ہے۔ خدا صرف ایک ہے۔ دنیائے انسانیت میں بے پناہ اختلافات' لامتناہی تفرقہ بازی اور متنوع گروہ بندیاں ہیں لیکن سب کا خالق ایک ہے۔ سائنسدانوں کا یہ مسلّمہ مفروضہ ہے کہ ہم ایک "Universe" میں رہتے ہیں "Multiverse" میں نہیں رہتے۔ گھاس کا ایک تنکا اگانے کے لیے بھی پوری کائنات کا تعاون درکار ہوتا ہے جسے روزمرہ کی زبان میں یوں کہا جاتا ہے کہ "خدا کی مرضی کے بغیر ایک پتہ تک نہیں ہلتا" قرآن مجید کے مطابق باری تعالیٰ کی وحدانیت کے اس تصور کی دنیا کے ہر پیغمبر نے شہادت دی ہے۔ اور یہی اصول (Doctrine) تمام مذاہب کی حقیقی بنیاد ہے۔ عہد نامہ عتیق میں باری تعالیٰ کا ایک خاص نام اور بیسیوں صفاتی نام بتائے گئے ہیں۔ لیکن یہودیوں کے تصورِ خدا کو "HENOTHEISM" کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں ......"ہمارا خدا ایک ہے" .... "میرے آگے تو اوروں کو معبود نہ ماننا" .... (خروج 3:20؛ استثناء 5:7؛ 6:14) ...."اور غیر معبودوں کی پیروی نہ کرو" (یرمیاہ 6:25؛ 15:35) ۔عہد نامہ عتیق کی ان آیات پر غور کرنے کے بعد اہل علم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ آیات دوسرے خداؤں کے موجود ہونے کی نفی نہیں کرتیں بلکہ اس امر کا اعتراف کرتی ہیں کہ دوسری قوموں کے دوسرے خدا ہیں۔ انہوں نے اعلیٰ ترین خدا کو اپنا باپ مان لیا اور خود کو اس کے بیٹے کہنا شروع کر دیا۔ اس تصور نے ایک اور مسخ شدہ

اصول کو جنم دے دیا کہ بیٹا باپ کی شبیہہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اسرائیلیوں نے دعویٰ کیا کہ وہ خدا کے مولودِ اوّل (پہلوٹھی کے) ہیں اور یہ کہ ان کی شبیہہ خدا کی ہتھیلی پر بنی ہوئی ہے۔ ہندو خود کو ''ایشور پترا ہا'' کہتے ہیں اور آریائی خدا کے بیٹے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اسلام نے ان تصورات کو غلط قرار دے کر اس کی جڑ ہی کاٹ دی' جو دنیا پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ اسلام نے توحید کا تصور پیش کیا ہے جو یہ ہے کہ ایک حقیقی خدا کے سوا کوئی بھی نہیں ہے جسے خدا کہا جا سکے۔ اور وہی کائنات کا خالق و مالک اور ربّ ہے جو دنیا بھر کی اقوام کا بادشاہ اور حکمرانِ حقیقی ہے۔

تثلیث کی اصطلاح

توحید باری تعالیٰ تمام آسمانی مذاہب کی مشترک بنیاد ہے لیکن عیسائیت کے بعد کے معماروں نے اسے مسترد کر دیا۔ یہ عقیدہ بالآخر مذہب کی عمارت ثابت ہو کر رہے گا۔ توحید خداوندی کے ثبوت کے بعد نظریہ تثلیث پر بحث شروع کرنا کارِ عبث ہے۔ عیسائیوں کی تثلیث یا اقانیم ثلاثہ (TRINITY) محض ایک ذہنی فریب ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ خدا کے ''باپ'' ہونے' خدا کے ''بیٹا'' ہونے اور خدا کے ''روح القدس'' ہونے کو متی (6:3؛ 27:1) یوحنا (28:20)' اعمال (34:5) اور رسولوں کے خطوط سے اگرچہ علیحدہ علیحدہ مستنبط (Deduce) نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے درست ہونے کی' ان سے مجموعی شہادت لی جا سکتی ہے تاہم عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی ایسا قول نہیں جس سے خدا کی تثلیث کا مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہو۔

ہیسٹنگز کے انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں بتایا گیا ہے کہ ''عقیدہ تثلیث کا بہترین اظہار ان لفظوں میں کیا جا سکتا ہے ''باپ خدا ہے' بیٹا خدا ہے او رروح القدس خدا ہے تاہم وہ تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا ہیں۔ چنانچہ کیتھولک مذہب نے ہمیں یہ کہنے سے منع کیا ہے کہ تین خدا' یا تین آقا ہو سکتے ہیں'۔ اس عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک ہستی (Being) ہے جسے صحیح مذہبی معنوں میں ''خداوند'' (God.......بڑے G کے ساتھ) پکارا جا سکتا ہے یعنی تثلیث من حیث المجموع ایک ہے لیکن تینوں افراد میں سے ہر ایک کو ڈھیلے ڈھالے مفہوم میں خدا (god' چھوٹے g کے ساتھ) کہا جا سکتا ہے۔ یہ اس عقیدے کا سادہ اور مربوط ترین اظہار ہے۔ لیکن اس ''متناقض بالذات قول'' (PARADOX) سے آسانی سے جان نہیں چھوٹ سکتی۔ صاف بات یہ ہے کہ رہنمایانِ کلیسا تے اس کا اظہار کرتے

ہوئے یہ بالکل محسوس نہیں کیا کہ وہ خدا کی حیثیت کو کم کر رہے ہیں۔ انہیں چاہیے تھا کہ خدا کو ایک غیر متناقض ہستی کے طور پر پیش کر کے الجھن کو صاف کر دیتے مگر ایسا نہ کر سکے۔ سینٹ تھامس ایکوینس نے کہا کہ 'باپ اتنا ہی بڑا ہے جتنی پوری تثلیث مل کر بنتی ہے۔' تثلیث کے اس تصور کو یونانی' لاطینی اور پروٹسٹنٹ علما نے بہتر بنانے کے لیے اپنی مساعی جاری رکھیں۔ تثلیث کے تینوں ارکان کی الوہیت اپنی اپنی جگہ مکمل درجہ رکھتی ہے۔ باپ اور اس کے بیٹے کا جوہر (Essence) اور عظمت (Dignity) یکساں ہے لیکن اس میں باپ اس ''تعلق کا عطا کنندہ'' (giver) اور بیٹا اس ''تعلق کا گیرندہ'' (Receiver) ہے۔ چوتھی اور پانچویں صدیوں کے مسیحی مصنفین نے باپ اور بیٹے کے اس تعلق کو ''شعلہ اور اس کی روشنی'' سے ''چشمہ اور ندی'' سے اور 'مُہر (Seal) اور اس کے نقش (Impress)'' سے تشبیہ دے کر معمے کو حل کرنے کی کوشش کی کی۔ سینٹ آگسٹن نے کہا کہ آگ کو باپ اور روشنی کو اس کا بیٹا سمجھو' دیکھو ہم نے دو ''ہم اصل (coevals) دریافت کر لیے ہیں۔ یہ اندازہ کرنا آسان ہے کہ کس نے کس کو پیدا کیا اور کون کس کا آقا ہے''۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ''خدائی (godhead) کی تکمیل کے لیے بیٹا ہونا بے حد ضروری ہے۔ بیٹا باپ سے خارج نہیں اور نہ وہ کہیں باہر سے وارد ہوتا ہے۔ وہ باپ ہی کا جسد اور جوہر ہوتا ہے۔'' مزید دلیل یہ لائی گئی کہ ''اگر بیٹا دائم نہ ہوتا تو باپ بھی ہمیشہ باپ نہ رہتا اور پدریت ناقص رہ جاتی''۔ تاہم عیسائیوں کا عقیدہ ہے تثلیث کے تینوں ارکان ابدی اور لافانی ہیں۔ تینوں سچے خدا ہیں' ہر جگہ موجود اور حاضر و ناظر رہتے ہیں۔ تینوں قادرِ مطلق ہیں' ان دیکھی چیزوں کو جانتے ہیں' بندوں کو پاکیزگی عطا کرنے اور گناہوں کو معاف کرنے کا بھی اختیار رکھتے ہیں۔

بدقسمتی سے ان حضرات نے توحید باری تعالیٰ پر حسابی اعداد کے حوالہ سے غور کیا ہے۔ اسلام کے نقطہ نظر سے توحید' خدا کی اکائی (Unit) نہیں ہے لیکن تثلیث کا مطلب خدا کی تین اکائیاں ہیں (جیسا کہ یونائیٹڈ کنگڈم ''U.K'' یا یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ ''USA'')۔ یہ درست ہے کہ وحدتِ خداوندی کا ریاضیاتی اعداد سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن نے خدا کی تعریف ''ھُوَ اللّٰہ احد'' کے الفاظ سے کی ہے یعنی کہ خدا اپنی صفات اور کاموں میں کسی کو اپنا شریک یا ساجھی نہیں بناتا' کوئی دوسری ہستی اس کی صفات میں شریک نہیں ہے اور نہ ہی اس کے

کاموں میں مداخلت کر سکتی ہے۔

ریاضی میں' جو کہ ایک قطعی اور جچی تلی (Exact and Precise) سائنس ہے' "ایک" کا عدد نہ اس سے "کم" کے لیے استعمال ہوتا ہے اور نہ اس سے "زیادہ" کے لیے صحیح سمجھا جاتا ہے۔ "ایک" کے معنی نہ "1+1+1" اور نہ "1/3" ہیں۔ تین یا اس سے زائد کسی بھی صورت میں "ایک" کے مساوی نہیں ہو سکتے۔ ماسوائے "ایک" کے' تمام اعداد کے نام اس میں "ایک ایک" کے اضافے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ہم جس عدد کو "تین" کہتے ہیں' وہ درحقیقت "ایک" کے تین بار جمع ہونے سے بنتا ہے اور بس۔ یہ "اعدادِ وصفی" (Cardinal numbers) میں سے سب سے کم درجے کا عدد ہے' اس میں "ایک" اور جمع ہو جائے تو یہ "2" بن جاتا ہے۔

"ایک" اور "تین" کے درمیان تعلق "جمع" (Addition) اور "منفی" (Subtraction) کا ہے۔ لیکن حق تعالیٰ "جمع" اور "منفی" سے بالاتر اور ماوریٰ ہے۔ علمبردارانِ تثلیث "تین ہستیوں" پر ایمان کا اظہار کرنے کے باوجود انہیں مساوی اور صفات میں یکساں سمجھتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے "تین" اور "ایک" ریاضیاتی طور پر برابر نہیں ہوتے، اسی طرح یہ ہستیاں صفات اور افعال کے لحاظ سے آپس میں برابر اور بلاتفاوت (Without difference) نہیں ہیں۔ اگر باپ ہر لحاظ سے بیٹے کے برابر اور مشابہ ہو تو ان میں سے ایک کو باپ اور دوسرے کو بیٹا کہنا غلط اور نادرست ہو گا۔ باپ خالق ہوتا ہے اور بیٹا اس کی تخلیق ہوتا ہے۔ اور روح القدس' دونوں کی ما حاصل (Product) ہے۔

پہلی ہستی' یعنی باپ خالق ہونے کے ساتھ تباہ کنندہ بھی ہے۔ دوسری ہستی یعنی بیٹا نجات دہندہ اور آزادی دہندہ ہے اور تیسری ہستی یعنی روح القدس' بحال کنندہ حیات (Restorer of life) ہے۔ ان میں سے ہر ہستی واضح طور پر اپنی اپنی مخصوص صفات رکھتی ہے جو دوسری دو ہستیوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اور انہی خصوصی صفات کی بنا پر' ان "تینوں" کے درمیان فوقیت کا ایک نظام سامنے آتا ہے۔ ان میں اولیت "خدا" یعنی باپ کو حاصل ہے' پھر "دوسرے خدا" یعنی بیٹے کی باری آتی ہے اور سب سے آخر میں اُس "خدا" کا نمبر آتا ہے جسے "روح القدس" کہا جاتا ہے۔ ان کا مرتبہ بھی اسی ترتیب سے متعین ہوتا ہے۔ اس سے

مختلف ترتیب سے ان کا نام لینا بہت بڑا کفر ہے۔ کوئی بھی شخص یہ کہنے کا مجاز نہیں کہ روح القدس ہستی اول ہے' باپ' ہستی دوم اور بیٹا ہستی سوم ہے۔ اور یہ بھی نہیں کہنا چاہیے کہ ''بنام روح القدس' اور بیٹا اور باپ''

دوسری ہستی' پہلی ہستی کا ''کلام'' ہے۔ وہ انسانی تجسیم (incarnation) ہے جس نے صلیب پر موت قبول کی تا کہ اپنے باپ کے انصاف کا ایک تقاضا پورا کرے اور حیات بعد از ممات (Resurrection)' تیسری ہستی کی آمد پر پایۂ تکمیل کو پہنچے گی۔ یہ ایک مسلمہ سچائی ہے کہ خدا ہر کہیں موجود ہے۔ اس صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ تینوں ہستیاں بیک وقت تمام جگہوں پر موجود ہوتی ہیں؟ جہاں کہیں بھی ان میں سے کوئی ایک ہوگی' دوسری دو موجود نہیں ہوں گی۔

پھر سوال یہ ہے کہ اس دنیا میں جتنے کام انجام پاتے ہیں' کیا ان کی تکمیل کے لیے یہ تینوں مل کر عمل کرتی ہیں؟ یا کیا ان میں سے ہر ایک کی تخلیق الگ الگ ممیز ہوتی ہے؟ یہ دونوں شرائط منطقی طور پر غلط اور بے معنی قرار پاتی ہیں۔ اگر تینوں مل کر ایک کام انجام دیتی ہیں تو پھر ان کی قوت عمل ناقص اور غیر کامل ہے۔ کیونکہ وہ ان کے مل کر کوشش کرنے سے ہی کامل بنتی ہے۔ اگر ان کی تخلیق واضح طور پر الگ الگ ہوئی ہے تو ان کے مابین برابری اور مشابہت ناممکن ہے لہٰذا تینوں کی تینوں کو ایک ''کل'' کے اندر نہیں سمیٹا جا سکتا۔

عقیدۂ تثلیث کے مطابق ذاتِ باری تعالیٰ باپ' بیٹے اور روح القدس کا ممزوج (Amalgam) ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو وہ (خدا) اس ممزوج کے متشکل ہونے سے پہلے کیا ہوتا تھا؟

جہاں تک اس جُملے کا تعلق ہے کہ ''میں اور باپ ایک ہیں'' اس کے معنی یہ ہوں گے کہ بیٹا ہر لحاظ سے باپ' جیسا اور اس کا مماثل ہے جیسا کہ مٹر کے دو دانے ہوتے ہیں لیکن باپ علّت (سبب) ہے اور بیٹا معلول (نتیجہ) ہے۔ اور اس جُملے کے مطابق علّت و معلول' ایک ہیں' یہ غیر منطقی اور بعید القیاس بات ہے کیونکہ علت اور معلول ایک نہیں ہو سکتے۔ اگر باپ اور بیٹا بالکل ایک اور بالکل مشابہ ہوں تو پھر کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ باپ اپنے بیٹے سے پیدا ہوا؟ جہاں تک روح القدس کا تعلق ہے وہ باپ اور بیٹے کے اتصال کا نتیجہ ہے۔ اگر ان کا

اتصال نہ ہوتا تو اس کا وجود نہ ہوتا۔ اگر اس کا ظہور ان کے اتصال کے بغیر ممکن تھا تو اتصال جو کہ مبینہ طور پر روح القدس کے وجود پر منتج ہوا' بے فائدہ اور بے اثر تھا۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ باپ کا وجود بیٹے پر منحصر نہیں تھا لیکن بیٹے نے اپنے ظہور کے لیے باپ پر یقیناً انحصار کیا۔ ایک ضرورتمند اور دست نگر شخص قائم بالذات (Self-exitent) نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا بیٹا خدا نہیں تھا۔

بیٹا' انسانیت اور ربوبیّت کی تلغیم کاری (Amalagamation) ہے لیکن خدا' یعنی باپ نہ ایسی متضاد ماہیتوں (Anti-beings) کی تلغیم کاری تھا اور نہ کبھی ایسا ممکن ہو سکے گا۔ لہٰذا باپ اور بیٹا نہ ایک جیسے ہیں اور نہ ہی ایک ہی ''ربوبیّت کے مثیل'' (Species of one Godhead) ہیں۔

تثلیث کی حمایت میں واحد حوالہ یوحنا کی انجیل کا پہلا مکتوب (Epistle) ہے جس کے باب 5' آیات 7 اور 8 میں یہ آتا ہے...... ''آسمان میں تین ہستیاں ہیں جن کے پاس کارگزاریوں کی روئداد ہے' خدا' کلام' اور 'روح القدس'۔ یہ تینوں ایک ہیں۔ اور زمین پر جو گواہ ہیں وہ بھی تین ہیں' روح' پانی اور خون' یہ تینوں ایک کے اندر متصل ہیں۔''

ان دو آیات میں ''باپ' کلام اور روح القدس' یہ تینوں ایک ہیں۔ اور وہ بھی تین ہیں جو زمین میں گواہی دیتے ہیں۔'' یہ دونوں آیات پندرھویں صدی میں' شامل کی گئی ہیں۔ یونانی ایڈیشن میں اس پر ایک فٹ نوٹ لکھا گیا ہے جسے لُوتھر نے اپنے جرمن ایڈیشن میں حذف کر دیا تھا۔

عقائد اور امن عالم

جنگ عظیم نے مسیحی دنیا پر سائنسی علوم کی اہمیت پوری طرح واضح کر دی تھی۔ اور اسے یہ احساس دلایا تھا کہ آئندہ اگر جنگ کی نوبت آئی تو وہ سائنسدانوں کی تباہ کن کامیابیوں کا نتیجہ ہوگی۔ یہ جنگ چونکہ ایک ہمہ گیر تباہی ہوگی اس لیے خفیہ طور پر نئے نئے تباہ کن ہتھیار جمع کیے جا رہے ہیں۔ عیسائیوں کو اس بات پر ایمان لانے کو کہا گیا ہے کہ ان کے تمام گناہ' خواہ وہ کتنے ہی بھیانک ہوں پیشگی طور پر معاف کیے جا چکے ہیں جنہیں حضرت عیسیٰؑ کے خون سے دھو ڈالا گیا ہے۔

ایسا ہونا بہت افسوسناک امر ہے۔ عیسائیوں کا تصور خدا بنی نوع انسان کے لیے بالکل فائدہ مند نہیں ہے' نہ سماجی طور پر اور نہ اخلاقی اور ذہنی طور پر۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا سب سے ناراض ہے کیونکہ وہ گنہگار (Sinners) ہیں۔ اس کے باوجود وہ بطور باپ ان سے محبت کرتا ہے۔ لہٰذا انسانوں کے بچائے جانے کے لیے ضروری ہے کہ تباہی سے پہلے پہلے اس کے انصاف اور اس کے رحم کے تمام تقاضے پورے ہو جائیں۔ اس امر کا اطمینان حاصل کرنے کے لیے وہ انسانی شکل میں بذات خود نیچے زمین پر آیا اور صلیب پر چڑھ کر موت سے ہمکنار ہو گیا۔ اس طرح اس نے انسانوں کے گناہوں کی قیمت چکائی اور ان کا کفارہ بن گیا۔ معافی' کفارے یا تلافی کے اس اصول کی خود مسیح علیہ السلام نے تردید کی ہے۔ اور ان کی یہ دعا تھی' ''اور جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے تو بھی ہمارے قرض معاف کر' اور ہمیں آزمائش میں نہ ڈال بلکہ برائی سے بچا'' (کیونکہ بادشاہی اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرے ہی ہیں۔ آمین)۔ متی باب 6' آیات 12، 13۔

جب انسان اپنے مقروض کو معاف کر دیتا ہے اور اس سے کوئی معاوضہ بھی نہیں لیتا'

خدا بھی اسی طرح گناہگاروں کو معاف کر دیتا ہے اور ان سے کوئی معاوضہ یا تاوان نہیں مانگتا۔ حضرت مسیح نے خدا اور گناہگار انسان کے تعلق کے لیے ایک باپ کی طرف سے اپنے فضول خرچ و نافرمان بیٹے کو واپس لینے پر ہر وقت آمادہ رہنے کی جو تمثیل بیان کی ہے وہ بے حد اثر انگیز اور سچی ہے۔ اس میں تاوان' معاوضے اور مصالحت کنندہ کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی' غلط کار بچہ پھر آ کر باپ کے بازوؤں میں سمٹ جاتا ہے۔

قرآن مجید نے کفارے کی اس شکل کو انصاف کے سراسر منافی قرار دیا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے:

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى

(یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے......سورۃ النجم آیات 39,38)

اس آیت میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ہر شخص جو پیدا ہوتا ہے وہ ایک بوجھ اٹھائے دنیا میں وارد ہوتا ہے' یہ اس لیے نہیں کہ وہ گنہگار ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی زندگی کا آغاز چند ذمہ داریوں کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کا جو مطالعہ کرتا ہے اس سے اس میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوتا ہے' یہ احساس اسے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے پر ابھارتا ہے۔ زیادہ معاملات میں وہ صرف سزا کے خوف سے گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

رائے عامہ کا دباؤ اور قانونی سزاؤں کا خوف جرائم کی حوصلہ شکنی کا باعث بنتے ہیں' جب یہ دباؤ کم ہو جائے اور سزا کا خوف نہ رہے تو جرائم پھر سر اٹھانے لگتے ہیں۔ غیر مسیحی مذاہب والے لوگ اگلے جہان کے عذاب کے خوف سے اس دنیا میں جرائم کرنے سے باز رہتے ہیں' لیکن کفارے (Atonement) کے عقیدے والے لوگوں کے لیے یہ خوف کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عیسائی پادری برملا اعلان کرتے ہیں: ''خدا انسانوں سے بہت ناراض ہے کیونکہ وہ گنہگار ہیں'' یسوع مسیح نے عیسائیوں کے گناہ خود مصلوب ہو کر ختم کرا دیے ہیں۔ اس طرح آخرت کی سزا سے بے خوف ہو جانے والے لوگوں نے جی بھر کر گناہ کرنا شروع کر دیے۔ حرام کاری' برہنگی' شراب نوشی' قمار بازی اور دھوکہ دہی وغیرہ میں عیسائی ممالک' دنیا میں سب

سے آگے ہیں۔ امریکہ میں 1988ء سے 1961ء تک کے اخبارات ہر سال نقب زنی، قتل اور دیگر جرائم کی طویل فہرستیں شائع کرتے رہے جن کی تعداد سال بہ سال اضافہ ہی ہوتا رہا کمی نہ ہوسکی۔ اخبار ''سان فرانسسکو ایگزامیز'' نے منگل 24/ نومبر کی اشاعت میں ''نیویارک کی 20ویں سٹریٹ ہونے والے گناہ'' کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جس میں کہا گیا تھا...... ''گزشتہ سال اس سٹریٹ میں نقب زنی کی 33,806وارداتیں ہوئیں' اس طرح چار وارداتیں فی گھنٹہ ہوتی رہیں۔ یہ اعداد و شمار صرف ایک سٹریٹ کے ہیں جبکہ نیویارک میں ایسی سینکڑوں سٹریٹس ہیں۔

ان بڑے جرائم کے علاوہ عیسائیت کا ایک اور مہلک پھل بھی ہے جو اپنی جڑیں تیزی سے پھیلا رہا ہے۔ دنیا میں خطرناک جراثیمی اور ایٹمی اسلحے کی بنیاد عیسائیوں کی سرزمین میں پڑی۔ پھر ہائیڈروجن بم تک نوبت پہنچی جو ایٹم بم سے ہزار گناہ زیادہ خطرناک ہے۔ اچھے گڈریوں کی بھیڑ کو خوفناک بھیڑیے کی شکل میں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے' مہلک اسلحے کی بڑے پیمانے پر تیاریاں اور دنیا میں اسے آزمانے کے لیے نت نئے بہانے تراشنا' آخرت کے خوف سے بے نیازی کا نتیجہ ہے۔ کیا یہ بے خوفی کفارے (Atonement) کے عقیدے سے پیدا نہیں ہوئی؟

امریکہ کے بڑے شہروں میں تو ہر سٹریٹ میں کئی گرجے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر گرجا میں پادریوں کی خاصی تعداد مامور ہوتی ہے۔ جس طرح کسی کتاب کو اس کے صرف کور سے نہیں جانچا جاسکتا اسی طرح کسی پادری کو اس کے کپڑوں سے نہیں شناخت کیا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثریت ''گناہوں کے پادریوں'' پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کا سبب سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جتنے لوگ حضرت مسیحؑ پر ایمان لائے ان کے گناہوں کا تاوان اور کفارہ آپؑ کے مصلوب ہونے سے ادا ہو چکا ہے۔ اس لیے اب گناہگاروں اب ان کے لیے کوئی سزا باقی نہیں ہے۔ گناہ خواہ کتنے سنگین اور کتنے ہی زیادہ ہوں خونِ مسیح نے دھو ڈالے ہیں۔ یہ تعداد جتنی زیادہ ہوگی خون کی قدر و قیمت اتنی ہی بڑھے گی۔ اگر گناہ کم ہوں گے خون کی قیمت برائے نام رہ جائے گی۔ لہٰذا گناہگاروں کو خوشخبری ہو۔ جیسا کہ کہا گیا ہے: ''مگر جہاں گناہ زیادہ ہوا وہاں فضل اس سے نہایت زیادہ ہوا'' ...... ''رومیوں کے نام

خط" (20:5)

آمد مسیحؑ سے قبل جو قانون چلا آرہا تھا اس نے گنہگاروں کی تعداد کم کر دی تھی' کیونکہ ارتکاب جرم کرنے والا شخص قانون سے ڈرتا تھا اور نقصان پورا کرنے کا خوف دامنگیر رہتا تھا۔ جب انہیں پتہ چل گیا کہ خدا نے لوگوں کے گناہ دھو دیئے ہیں تو ان سے دل میں سے احساس گناہ جاتا رہا' وہ اس یقین سے سرشار ہو گئے کہ ہم جتنے بھی گناہ کریں گے وہ سینکڑوں سال پہلے معاف ہو چکے ہیں' انہیں بخشوانے کے لیے ایک عظیم قربانی دی جا چکی ہے' اس سے وہ نہایت دیدہ دلیری سے ارتکاب گناہ کرنے لگے۔

یہ قانون اور انصاف کی تاریخ کا عجیب ترین سانحہ ہے کہ تمام گناہ ان کے ارتکاب سے بھی پہلے معاف شدہ سمجھ لیے گئے۔ لیکن جو چیز کسی عدالتِ انصاف میں نہیں دیکھی جا سکی وہ چرچ کے ذخیرے میں بہ افراط مل رہی تھی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

"ہم کو اس میں اس کے خون کے وسیلہ سے مخلصی یعنی قصوروں کی معافی اس کے فضل کی دولت کی طرح حاصل ہے۔" (افسیون۔ باب 1 آیت 7)

عیسائیوں کا خیال ہے کہ آدم نے جو گناہ کیا' وہ اس کے سب بیٹوں یا جملہ انسانیت نے اس سے بطور وراثت پایا ہے لیکن بائبل میں واضح طور پر آیا ہے کہ:

"جو جان گناہ کرتی ہے وہی مرے گی۔ بیٹا باپ کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور نہ باپ بیٹے کے گناہ کا بوجھ۔ صادق کی صداقت اس کے لیے ہو گی اور شریر کی شرارت' شریر کے لیے۔ لیکن اگر شریر اپنے تمام گناہوں سے جو اس نے کیے ہیں باز آ جائے اور میرے سب آئین پر چل کر جو جائز ہے اور روا ہے' کرے تو وہ یقیناً زندہ رہے گا۔ وہ نہ مرے گا" (حزقی ایل' باب 18' آیات 20 اور 21)

خداوند تعالیٰ نے مزید فرمایا:۔

"باپ دادا نے کچے انگور کھائے اور اولاد کے دانت کھٹے ہوئے"
(حزقی ایل' باب 18' آیت 2)

ایک بار پھر کہا گیا:۔

"اکثر شریر اپنی شرارت سے' جو وہ کرتا ہے' باز آئے اور وہ کام کرے جو جائز اور روا ہے تو وہ اپنی جان کو زندہ رکھے گا۔ اس لیے کہ اس نے سوچا اور اپنے سب گناہوں سے جو کرتا تھا باز آیا تو وہ یقیناً زندہ رہے گا"(حزقی ایل باب 18' آیات 28.27)

نہ صرف حضرت عیسیٰؑ بلکہ حضرت نوحؑ ' حضرت دانیالؑ اورحضرت ایوبؑ بھی راست باز تھے۔ خداوند تعالیٰ نے ان کے حوالے سے بھی بندوں پر صداقت کی اہمیت واضح کرتے ہوئے حزقی ایل کے باب 14' آیت 13 اور 14 میں کہا:۔

"اے آدم زاد جب کوئی ملک سخت خطا کر کے میرا گنہگار ہو اور میں اس پر اپنا ہاتھ چلاؤں اور اس کی روٹی کا عصا (ذریعہ) توڑ ڈالوں اور اس میں قحط بھیج دوں اور اس کے انسان اور حیوان کو ہلاک کر دوں' تو اگرچہ یہ تین اشخاص نوح' دانیال اور ایوب اس میں موجود ہوں تو بھی خداوند خدا فرماتا ہے کہ وہ اپنی صداقت سے فقط اپنی ہی جان بچا سکیں گے"

لیکن کفارے اور فدیئے کا یہ عقیدہ انسان کو دیدہ دلیری سے گناہوں پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جارجیا کے ایک نوجوان نے اپنے ہائی سکول کی تعلیم مکمل کرنے کی تقریب کی رات کی روئداد یوں بیان کی:۔

ہم نے اپنی پارٹی کا آغاز شراب وشباب سے کیا' اور ایک نائٹ کلب سے دوسرے نائٹ کلب میں پہنچتے رہے۔ پھر ہم جھیل کے کنارے ایک کاٹیج میں گئے جو ہم لڑکوں میں سے ایک لڑکے کے والدین کی ملکیت تھی۔ ہم ایک دائرے میں بیٹھ گئے' گپ شپ کرتے رہے' ریکارڈ بجاتے رہے اور شراب نوشی میں مصروف رہے۔ تھوڑی دیر بعد ہم جوڑا جوڑا ہو کر پانی کے کنارے ٹہلنے لگے' پھر کچھ لڑکے لڑکیاں جنگل میں یا سائیڈ روم میں گھس گئے۔ ہم نے محسوس کیا کہ گریجویشن کے بعد تو ہم بالغ ہو چکے ہیں اور وہ حرکتیں کیوں نہ کریں جو سب بالغ لوگ کیا کرتے ہیں' آج ہم نے ثابت کر دیا کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔

نئی نسل کو یہ راہ کس نے دکھائی؟ اس کا جواب ریڈرز ڈائجسٹ کے مئی 1961ء کے شمارے میں پڑھیے:

اگر نوجوان نسل نائٹ کلبوں میں غل غپاڑہ کرتی ہے اور شبانہ محفلوں میں شراب اور جنس کے تجربات کرتی ہے' بلاشبہ اس کے ذمہ دار وہ والدین ہیں جو خود بھی اس طرح کے گلچھڑے اڑاتے ہوئے بلوغت کے دور میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے پچھلے جون میں ملک بھر کا سروے کیا تھا' نیویارک' شکاگو' ڈیلس' اور لاس اینجلس میں عیش پسند والدین اپنے بچوں کو جوا کھیلنے کی ترغیب دیتے ہیں اور ''نائیٹ آن دی ٹاؤن'' میں 50 سے 75 ڈالر تک ہار جانے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ بعض کمیونٹیز میں شعور سے محروم والدین پرائیویٹ ہاؤس پارٹیز میں الکحل ملے مشروبات دھڑلے سے پیتے اور پلاتے ہیں اور پھر اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی نئی نسل اس راہ پر کیسے چل پڑی ہے؟ ہر سال ایک نئی کلاس پچھلی کلاس کی عیاشیوں کا ریکارڈ توڑ کر اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے اور غل غپاڑے کی شدت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ میں نے گریجویشن کی راتیں منانے والوں کو کئی جگہ آپے سے باہر ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور والدین کی یہ گھسی پٹی دلیل بھی بار بار سنی ہے...... ''میں اپنے بچوں کو کس طرح سکول سے سیدھے گھر لوٹ آنے کے لیے کہوں جبکہ ہر کوئی رات بھر باہر رہتا ہے اور صبح ناشتے کے وقت گھر واپس آتا ہے''۔

جان ایڈگر ہوور لکھتا ہے:

''یہ قوم اندھا دھند ایک خطرناک داخلی بحران کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ایک ایسے چوراستے (Crossroads) پر پہنچ چکے ہیں جس کی طرف ہم نے دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں سفر شروع کیا تھا؛ اور یہ کہ اگر ہم اس بحران کی جان لیوا نوعیت کو پہچاننے اور اس سے بچنے کے لیے فوری اقدامات کرنے میں ناکام رہے تو ہمیں اس کی قیمت اپنی جمہوریہ سے ہاتھ دھو لینے کی صورت میں ادا کرنا پڑے گی۔

''یہ بحران اس صورت میں سامنے آ رہا ہے جسے بعض لوگ نوجوانوں کی بے راہ روی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور میں اسے نوجوانوں کی مجرمانہ ذہنیت سے تعبیر کرتا ہوں کیونکہ جُرم جُرم ہوتا ہے خواہ اسے کوئی بھی کرے۔ چنانچہ میں ان کی حرکتوں کو تہذیبی غارتگری' بدتمیزی' ہوس کاری اور وحشیانہ طرز زندگی قرار دیتا ہوں جو گستاخ اور بے حیا لڑکوں کے گروہوں کی صورت میں منہ پھاڑے کھڑی ہے۔ آج چوری اور نقب زنی کی جتنی وارداتیں ہو رہی ہیں ان میں سے نصف کا ارتکاب تو یہ نوخیز گروہ کر رہے ہیں اور اس سے حوصلہ پا کر وہ بتدریج ان سے بھی زیادہ سنگین جرائم مجرمانہ حملوں' ڈکیتی' زنا بالجبر اور قتل وغیرہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔''......ریڈرز ڈائجسٹ اپریل 1960 (امریکن ایڈیشن)۔

فاضل مضمون نگار فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن (ایف بی آئی) کے ڈائریکٹر تھے۔ اور ان کی یہ تحقیقاتی رپورٹ اس ملعون درخت کے پھول اور پھل ہیں جس پر حضرت عیسیٰؑ مبینہ طور پر مصلوب ہوئے تھے۔ کیا اخلاقی اقدار کی یہ تباہی گناہ پیشگی معاف ہو جانے کے عقیدے کا شاخسانہ نہیں ہیں؟

زندگی کا آغاز' قرآن کی زبان میں' ایک جرثومے سے ہوتا ہے' جو بڑھتے بڑھتے اور مختلف تبدیلیوں میں سے گزرتے ہوئے ایک جیتے جاگتے انسان کی صورت میں جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ یہ جرثومہ متعدد پیچیدہ منزلوں میں سے گزرنے کے باوجود اپنی انفرادیت (Individuality) کو برقرار رکھتا ہے۔ ان منزلوں کے دوران اس کی خصوصیات میں ایسی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں جن کے بارے میں پیشگی کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس دنیا میں انسان کی زندگی بے مقصد اور بے مصرف نہیں ہے۔ اور مقصد ایک اعلیٰ و ارفع زندگی پانا' ہوتا ہے۔ ابتدائی دور کے وحشیوں سے لے کر آج کی نام نہاد مہذب قوموں تک' سب میں صحیح اور غلط کے بارے میں کچھ تصورات موجود رہے ہیں اور سب یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہر ذی روح آج کی دنیا میں جو کچھ بو رہا ہے کل وہی اس نے کاٹنا ہے۔ گناہ انسان کو ورثے میں نہیں ملا اور نہ ہی آدم کی ''نافرمانی'' اس کی پیشانی پر ایک بدنما داغ بن کر چپک گئی ہے۔ اگر وہ گناہ کے لیے ناقابل اصلاح پیدائشی رجحان کے ساتھ پیدا ہوا ہوتا تو خالق ایک مقدس و متبرک ہستی

ہونے سے زیادہ ایک سفاک ہستی ہوتا۔ ایسا خدا نہ تو رحیم ہوتا اور نہ منصف مزاج ہوتا۔

یہ عقیدہ کہ انسان فطرتاً ہی بدطینت اور بے ایمان ہے' یا اس نے اپنے ابتدائی آباؤ اجداد سے ہی گناہ بطور ورثہ پایا ہے' ان لوگوں کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے جو انسان کے آزاد اور مختار ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان غیر مرئی زنجیروں کو توڑنے میں ناکام ہو چکے ہیں جنہوں نے انہیں جکڑ رکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ پال کے ان لفظوں کو دہرا رہے ہیں جو اس نے تارسس (Tarsus) سے آنے والے ایک شخص سے کہتے تھے:۔

"کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مجھ میں یعنی میرے جسم میں کوئی نیکی بسی ہوئی نہیں البتہ ارادہ تو مجھ میں موجود ہے مگر نیک کام مجھ سے نہیں بن پڑتے۔ چنانچہ جس نیکی کا ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا مگر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا' اسے کر لیتا ہوں"۔......(رومیوں کے نام پولس رسول کے خط۔ باب 7' آیات 19,18)

انسان ایک سماجی حیوان ہے' اس لیے اسے معاشرے کا ایک مفید اور کارآمد رکن ہونا چاہیے جس کے لیے شرط اول یہ ہے کہ وہ اخلاق کی بلند قدروں اور قانون سازوں کے بنائے ہوئے قوانین کی پابندی کرے۔ اگر انسان فطرتاً ہی بدمعاش اور بدچلن ہیں تو پھر انہیں ان قدروں اور ان قوانین کے مطابق چلنے کی کیا ضرورت ہے؟

آیئے اب پھر اصل موضوع کی طرف چلیں۔ خدا کے عربی نام "اللہ" کے علاوہ متعدد صفاتی نام بھی ہیں جن کی تعداد 99 ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو پہلے اس کی صفات یا اس کے کاموں کے حوالے سے پکارا جاتا تھا' پھر اس کے ذاتی نام سے پکارنا شروع کر دیا گیا۔ لوگ کسی نام کے بکثرت استعمال کی وجہ سے اس کے معنی بھول جاتے ہیں چنانچہ بہت سی آسمانی کتابوں اور زبانوں کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ خدا کے اصل نام "اللہ" کے سوا (جو کہ عربی نام ہے) اس کا کوئی اور نام نہیں ہے۔

یہودیوں کی مقدس کتب میں خدا کا نام؟

کیا ''یاہویہ'' (''Yahveh'') خدا کا نام ہے؟

اس سوال کا جواب خواہ آپ کے لیے کتنا ہی صدمہ انگیز ہو' واضح طور پر ''ہاں'' نہیں ہے۔ خدا جو' ہر چیز کا خالق ہے اور ساری کائنات کا حکمران اعلیٰ ہے' یہودیوں نے اس کا ایک ایسا عام سا نام رکھا جس کا انگریزی ترجمہ ''جیہوواہ'' بنتا ہے۔ جبکہ قدیم انگلش میں اسے ''God'' کہا جاتا تھا۔ امریکن انگلش میں اس کا جو ترجمہ بنتا تھا وہ اتنا مقدس و محترم تھا کہ اسے عموماً زبان پر نہیں لایا جاتا تھا۔ اس کی جگہ دو دوسرے الفاظ وضع کر لیے گئے۔ ''ایڈونائی'' (Adonai یعنی ''Lord'') اور ''ایلوھم'' (Elohim....... یعنی ''گاڈ'')۔ یہ دونوں نام دراصل خدا کی صفات کے مظہر ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ خدا کا نام ''جیہوواہ'' ہے' حضرت موسیٰ کو اس نام سے ''ہورب'' کے مقام پر مطلع کیا گیا تھا' یہ اسرائیل کے خدا کا نام ہے۔ وہ اس کا تلفظ ''یاہویہ'' (Yahweh) کرتے تھے۔ لیکن یہود کے علما خدا کا نام لینا سوء ادب سمجھتے ہوئے اسے ''ایڈونائی'' (لارڈ) لکھتے تھے اور اسے زبان سے کہنا بھی جائز سمجھتے تھے۔ سولہویں صدی سے پہلے تک صورت حال یہ تھی کہ ''جیہوواہ'' کا لفظ احتراماً زبان پر نہیں لایا جاتا تھا۔ یہودیوں میں خدا کا یہ متبادل نام اس وقت زیر بحث آیا جب اس کا صحیح تلفظ بڑی حد تک بگڑ چکا تھا۔ یہ بات کسی کے لیے باعث حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ مشرقی ممالک میں کسی کو اس کے ذاتی نام سے نہ پکارنا عام چیز ہے' بلکہ عموماً لوگوں کو ان کے پیشہ ورانہ نام یا کسی امتیازی خصوصیت کے حوالے سے کوئی ایسا نام دے دیا جاتا ہے جس سے اسے پکارنا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

اگر یہ رواج ایسی سرزمین میں ہو جہاں ذاتی نام بھی مروّج ہوں تو اس شخصیت کو

ذاتی نام سے پکارنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھا جاتا تھا بہرحال ان علاقوں میں خدا کے صفاتی نام کو ہی اس کا ذاتی نام قرار دیدیا گیا' اس کا ایک مزید سبب یہ بھی تھا کہ ابھی تک خدا کا کوئی ذاتی نام نہیں رکھا گیا تھا۔ اگر چہ ایک خاص نام کو ''اعلیٰ ترین'' سمجھا جاتا تھا۔ دعاؤں میں اسے زیادہ تر دیگر صفاتی ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ متذکرہ اعلیٰ ترین نام اتنا زیادہ مقدس خیال کیا جاتا تھا کہ اسے صرف خاص خاص لوگ ہی اپنی زبان سے کہہ سکتے تھے اور وہ بھی خصوصی مواقع پر مقامات پر۔ عام لوگ اس قاعدے کی خلاف ورزی کر بیٹھتے تو ان کی سزا یہ تھی کہ ان کی زبانیں کاٹ دی جاتیں یا ان کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا جاتا یا ان کا سینہ چیر کر دل باہر نکال دیا جاتا تھا' جیسا کہ ہندوؤں میں تھا۔ (بحوالہ: گوتم سمرتی؛ 12 '1؛ پر ومیمنسہ 1 '3 '38؛ 33.1.6)

یہودیت اور عیسائیت میں خدا کا اعلیٰ ترین نام ''جیہوواہ'' (Jehovah) ہے۔ جو ''کتاب پیدائش'' میں 156 بار اور پوری انجیل میں 6000 بار آتا ہے۔ لیکن یہودی اور عیسائی علما اس بات پر متفق ہیں کہ اس کا صحیح تلفظ یقینی طور پر کسی کو بھی معلوم نہیں۔ جب انجیل پہلی بار عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی اس میں نشاناتِ اعراب (Vowel-points) نہیں تھے۔ عربی رسم الخط میں بھی یہی معاملہ تھا کیونکہ اہل زبان کو ان کی ضرورت نہیں تھی لیکن جب غیر عرب عجمیوں کو قرآن پڑھنا پڑا تو پتہ چلا کہ وہ اعراب کے بغیر عبارت کو صحیح طور پر پڑھ ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ ان کی آسانی کے لیے اعراب (زیر' زبر' پیش) لگا دیے گئے۔ اسی طرح یہودی سکالرز نے بھی عبرانی رسم الخط کے لیے ''واویل'' (a,e,i,o,u) وضع کر لیے۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں عبرانی زبان یہودیوں میں متروک ہو چکی تھی اس لیے مرتبینِ انجیل کے مابین بہت سے لفظوں کی صحیح آوازوں اور موزون واویلوں کے بارے میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ اس طرح خدا کا نام لکھنے میں ایک دشواری یہ بھی پیدا ہو گئی کہ وہ ایسی کتاب میں یہ کیسے لکھیں جس کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ''فقیہہ اعظم'' (Chief Rabbi) کے سوا کوئی بھی شخص یہ نام اپنی زبان پر لانے کا مجاز نہیں ہے۔ چنانچہ مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ پورا ''Yehovah'' لکھنے کی بجائے صرف چار حروف (بغیر واویلز کے) ......''YHVH'' لکھ دیے گئے۔ ان سے پہلے یا حاشیے پر ''Adonai'' کی اصطلاح لکھ دی گئی جس کے معنی یہ تھے

کہ "Yehovah" کی بجائے "YHVH" بمعہ adonai کے واویل پوائنٹس پڑھا جانا چاہیے۔ پورے بائبل میں یہ لفظ "Adonai" یا "Elohim" کے بغیر ایک بار بھی نہیں لکھا گیا۔ چنانچہ قاری بائبل پڑھتے پڑھتے جب "Adonai" کی اصطلاح پر پہنچتا تو فوراً سمجھ جاتا کہ "اگلا" لفظ نہیں پڑھنا چاہیے۔ یہ ممانعت کوئی معمولی بات نہیں تھی' خدا کا نام لینے کی جرأت کرنے والے کی سزا' موت تھی۔ حتیٰ کہ یہودی سکالرز اور متبحر علما بھی جو بائبل کے متون کے اصل یا نقل کی شناخت میں مہارت رکھتے ہیں' خدا کا نام نہیں لیتے اور اس کی جگہ "Adonai" لکھ دیتے ہیں۔ (Commentary on the Torah by the chief Rabbi, Oxford Universty Press Exodus.VI:2, 6, etc)

یہودی اور عیسائی عالموں نے "جیہوواہ" نام پر بحث کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ بحث کا پہلا حصہ اس کے تلفظ کے بارے میں تھا۔ 1520ء سے یہ "جیہوواہ" (Jehovah) لکھا جاتا رہا ہے مگر "جیہوویہ" (Jehoveh) پڑھا جاتا رہا ہے۔ اور آجکل عام طور پر یہی زیادہ مقبول ہے۔ اس سے قبل کے مختلف تاریخی ادوار میں یہ (1) جاؤ "Jao" (2) جاؤتھ "Jaoth" (3) جاؤُ "Jau" (4) جوب "Job" (5) جا "Ja" (6) جاہ "Jah" (7) جیہو "Jeho" (8) جے یہہ "Jehyeh" بولا جاتا رہا۔ اہل سمیریا اسے (9) جابے "Jabe" اور (10) جاہووا "Jahova" بولتے تھے۔ جوئل "Joel" پیغمبر کا نام ہے جس کے معنی "جو" (Jo) "خدا" کے ہیں۔

جیہوواہ (Jehovah) کی اہمیت

بحث کا دوسرا حصہ "جیہوواہ" کے "معنی" ہیں۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ یہ حالتِ فاعلی (Nominative case) ہے' اور بعض اسے فعلِ مطلق (Absolute verb) کہتے ہیں۔ اس کے معنوں میں بھی بڑا فرق ہے۔ اول الذکر صورت میں اس کا ترجمہ خالق یا رب (پالنے والا) ہے۔ لیکن یہ معنی تصوراتی یا قیاسی ہیں تاوقتیکہ ان کی کوئی معقول وضاحت نہ کر دی جائے۔ اور یہ کتاب خروج 3:14 اور 6:2 میں کہی گئی بات کے متناقض ہے۔ مثلاً جب خداوند تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا تو وہ ذرا جھجکے اور کہا:

''اگر فرعون مجھ سے پوچھے کہ تیرے خدا کا نام کیا ہے تو میں جواب میں کیا کہوں؟ آپ ازراہ کرم مجھے اپنا نام بتا دیں''......خدا نے اپنے نام کا انکشاف کرتے ہوئے کہا......میرا نام ''ایہہ یہہ (Ehyeh) ہے' یعنی کہ میں جو ہوں سو میں ہوں۔ سو تُو بنی اسرائیل سے کہنا' میں جو ہوں' نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے۔'' (خروج باب 3' آیت 14)۔ لیکن خروج کے باب 6' آیت 3 میں' خدا کا نام ''یاہ ویہہ'' (Yah veh)......''وہ جو ہے''۔ لکھا گیا ہے۔ اس کا یونانی بائیبل کا ترجمہ...... یوں بنتا ہے۔ ''وہ جو ہے اس نے مجھے بھیجا ہے'' اس کا یونانی بائیبل کا ترجمہ...... یوں بنتا ہے۔ ''وہ جو ہے' اس نے مجھے بھیجا ہے۔'' اس طرح خدا نے موسیٰ علیہ السلام پر تیسری بار اپنے جس نام کا انکشاف کیا' ''یادیہہ'' (Yah veh) یعنی ''وہ جو ہے'' تھا۔

تاہم اس ترجمے پر شدید اعتراضات کئے گئے۔ یہ ترجمہ اس لحاظ سے غلط ہے کہ اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ عبرانی کے لفظ ''Yehi'' سے اخذ کیا گیا ہے اور اس کے معنی...... ''وہ ہوگا'' ہونے چاہئیں۔ جہاں تک دوسری شکل ''Jehu'' کا تعلق ہے، یہ مختصر اور جامع ہے' یہ ایک مختلف ماخذ سے لی گئی ہے۔ اس کے ایک معنی...... ''آنے والا'' (Coming one) بھی ہیں۔ اس سے پیشینگوئی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ بے حد اہم اور موزوں ہے اور عبرانی گرامر کے قواعد سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ یہودیوں کا کہنا ہے کہ ''جیہووہ'' (Jehovah) ایک غلط تلفظ ہے جو عیسائی متکلمین کا وضع کیا ہوا ہے لیکن وہ اس کا اعتراف نہیں کرتے۔ یہ اصطلاح دراصل چار حروف ''YHVH'' پر مشتمل ہے' جو بولنا' یعنی اس کا تلفظ کرنا' ناممکن ہے۔ بہ الفاظ دیگر اسے پڑھنا یا لکھنا ممنوع ہے۔ عیسائی متکلمین کی طرف سے اس کا تجویز کردہ تلفظ' عبرانی زبان کے قواعد کی رُو سے بالکل غلط ہے۔ اس کا متبادل ''ایڈونائی'' (Adonai) ہے۔ جہاں کہیں بھی یہ اصطلاح خدا کے نام کے طور پر استعمال کرنے کی ضرورت پڑے گی اس کی بجائے ''ایڈونائی'' ہی استعمال ہوگی۔ قدیم یونانی قلمی نسخوں میں یہ اصطلاح نہیں بلکہ ''کوریز'' (Kuries) استعمال ہوا ہے جو ''Adonai'' ہی کے معنی دیتا ہے۔

معروف یہودی عالم "فلو" (Philo) نے متعدد بار لکھا ہے کہ "YHWA" ناقابل تلفظ ہے' اسے حلقۂ تقدیس میں بیٹھ کر وہی شخص سن اور کہہ سکتا ہے جس کے کانوں اور زبان کی خدائی دانش کے ذریعہ تطہیر (Purification) ہو چکی ہو۔ اگر کوئی دوسرا شخص ان شرائط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی زبان سے یہ الفاظ کہنے کی جسارت کرے گا تو اسے سزائے موت پانے کے لیے تیار رہنا چاہیے اور وہ اگلے جہان میں بھی سخت گھاٹے میں رہے گا۔ بعض عیسائی پادریوں نے اس کا تلفظ کرنے کی کوشش کی ہے مگر ناکام رہے ہیں۔ کیونکہ اس کا صحیح تلفظ کبھی ہو ہی نہیں ہو سکا۔

جہاں تک "Jehovah" کے تلفظ کا تعلق ہے' عیسائی پادری اور یہودی مصنفین اس بات پر متفق ہیں کہ "جیہووہ" اتنا مقدس نام ہے کہ اسے زبان سے ادا نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ اسی تقدس کے پیش نظر اس کا حقیقی تلفظ "شمعون' عادل" (Simeon, the just) کے زمانے میں ہی متروک ہو چکا تھا' یہ سکندر اعظم کا ہمعصر تھا۔ قدیم یروشلم کے بڑے معبد (Temple) کی تباہی کے بعد اسے زبان پر لانے کا سلسلہ بالکل ہی بند کر دیا گیا تھا۔ "ابا شاؤل" نے پیشگوئی کر دی تھی کہ جب دنیا نے اس لکھے ہوئے لفظ کو زبان سے ادا کرنا شروع کر دیا تو اس کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔

ہیسٹنگز کی ڈکشنری میں بتایا گیا ہے کہ لفظ "(Jehovah)" یعنی "(Yhvh)" نے اتنا تقدس حاصل کر لیا کہ اسے زبان پر لانے کی بجائے "Adonai" (لارڈ) کہا جانے لگا۔ لکھتے وقت اس (Yhvh) میں واویل (a,e,i,o,u) شامل کر دیے جاتے تھے جس کی وجہ سے اسے تحریر میں لانا آسان ہو گیا۔ یہ صورت حال تحریک اصلاح (1520ء) تک تھی۔ کتابِ خروج (10:iii) میں آتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام مصر جانے سے گھبرائے تو خدا نے انہیں کہا۔ "جا' میں تیرے ساتھ ہوں گا پھر انہوں نے پوچھا "میں لوگوں کو ان کے باپوں کے خدا کا کیا نام بتاؤں" تو انہیں کہا گیا...... "وہ جو ہے سو ہے۔" پھر انہیں حکم دیا گیا کہ "جا میں تیرے ساتھ ہوں گا میں تیرا مددگار ہوں گا تجھے طاقت دوں گا اور نجات دلاؤں گا۔ میں تیری زبان بن جاؤں گا" گویا خدا نے اس وقت بھی اپنا صحیح نام نہ بتایا۔

1953ء میں "دی نیو ورلڈ بائیبل ٹرانسلیشن کمیٹی" نے عبرانی مذہبی کتابوں کا

جوترجمہ شائع کیا' اس کے پیش لفظ میں کہا گیا ہے کہ: ''مقدس کتابوں کے جدید مُترجمین کے لیے یہ بات بے حد شرمناک ہے کہ انہوں نے خدا کا خاص نام لکھنے سے پہلوتہی کی یا دیدہ دانستہ اسے چھپانے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ عبرانی متن میں چار حروف پر مشتمل لفظ ''YHWH'' ہزاروں مرتبہ آیا ہے اسے عام طور پر ''Tetragrammaton'' کہا جاتا ہے یعنی وہ لفظ جو حدِ بیان سے باہر ہو۔ ہمارے لیے یہ تو ممکن نہیں کہ ہم روایتی یہودیت اور تفرقہ بازی کی اس روایت کی پیروی کریں جو ''جیوش سائناگاگ'' (یہودی کنیسہ) کرتا رہا ہے یا بائیبل کا لاطینی روپ (Latin Vulgate) اختیار کریں جو ایک ہزار سال تک مغربی یورپ میں مقبول عام ترجمہ رہا ہے۔ اس میں کنیسہ کی روایت کے مطابق خدا کے اصلی نام کی بجائے ''لارڈ'' ''ایڈونائی'' اور ''گاڈ'' استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ہم ''یونانی ہفتادی ترجمہ'' (Greek septuagint) کے مترجمین کی پیروی کریں گے جنہوں نے مقدس نام کو صرف بطور نام استعمال کیا۔ اس لیے جہاں بھی چار حروف پر مشتمل نام (YHWH) آئے گا ہم اس کی معروف ترین انگلش شکل میں ''جیہوواہ'' (JEHOVAH) لکھیں گے۔ تا کہ قارئین الجھاوؤں میں پھنس کر نہ رہ جائیں۔''

تاہم جدید سکالرز کا اصرار ہے کہ یہ نام ''جاویہہ'' (Jahweh) ہے جس کا تلفظ ''یاویہہ'' (Yahweh) ہے۔

یہودی اور عیسائی سکالرز کے بیانات

(1) یہودی اور عیسائی سکالرز کی سال ہا سال کی تحقیق کا لب لباب یہ ہے کہ مدتوں سے خدا نام ''جیہوواہ'' (Jehovah) چلا آرہا ہے۔ جو کہ خود خدا کا بتایا ہوا ہے اور یہی بائبل میں استعمال ہوا ہے۔

(2) ہزاروں سال کے بعد پچھلی صدی میں اس نام کے بارے میں تنازعہ کھڑا ہو گیا جس کے بعد اسے غلط قرار دے کر صحیح نام کی تلاش شروع کر دی گئی۔

(3) یہ تحقیق' اس سے بھی زیادہ مشکل رہی جتنی کہ مقناطیس کے نارتھ اور ساؤتھ پولز کی صحیح پوزیشن تلاش کرنے میں اٹھانی پڑتی ہے۔ اس تحقیق کے سلسلے میں بائبل کے

قدیم ترین قلمی نسخوں کی چھان پھٹک' کندہ کاریوں کی تحقیق اور مذہبی روایات کا عمیق مطالعہ کیا گیا جس کے نتیجے میں بہت سی اہم چیزیں سامنے آئیں۔ اس تھکا دینے والی محنت اور عرق ریزیوں کا نچوڑ یہ ہے کہ خدا کا اصلی نام مدتوں پہلے کھو گیا تھا اور اس کے بعد اس کے جتنے بھی نام تجویز ہوئے ان میں سے کوئی بھی صحیح فٹ نہیں ہوا' ہر نام میں کوئی نہ کوئی سقم یا تشنگی محسوس ہونے لگتی تھی۔

(4) یہ بات بالکل ایک نیا انکشاف تھی کہ خدا کا حقیقی نام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے بھی کسی کو معلوم نہیں تھا (دیکھئے: کتاب خروج 4:6)

(5) اس نام سے اتنی عظمتیں اور بلندیاں منسوب ہیں کہ انسان اس کے محض زبانی اظہار سے بھی اس دنیا کی ساری برکات سمیٹ سکتا ہے لیکن جب نام پوچھا گیا تو جواب ملا کہ نام تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔

(6) یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی تاریخ مطالعہ سے منکشف ہوا کہ خدا کا نام تلاش کرنے کے لیے ہر عہد میں کوشش ہوتی رہی' جس کے نتیجے میں ایک نیا نام دریافت کر لیا گیا' کچھ عرصہ بعد اس نام کو غلط قرار دے کر مسترد کر دیا گیا اور محققین نے پھر نئی کوشش شروع کر دی۔ اگر ہر لفظ ایک منجمد تصویر ہو اور اس کے معنی ''زندگی اور حُسن'' ہو تو ''جیہوواہ'' (Jehovah) بے معنی ہونے کی وجہ سے بے جان لفظ بن جائے گا۔ یہ لفظ بار بار نئے سے نئے لبادے میں سامنے آتا رہا ہے' پھر بوڑھا ہو کر اپنی موت آپ مر جاتا رہا ہے۔

(7) اس کے تلفظ کے بارے میں بار بار اختلافات پیدا ہوئے' جس سے معاملہ مشکوک ہو جاتا رہا۔ اس کی صحیح اہمیت آج تک معلوم نہیں ہو سکی۔

(8) یہودیوں کی طرف سے عیسائی سکالرز پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے خدا کو ''جیہوواہ'' کا نام دے کر غلط بیانی کی ہے اور دنیا کو گمراہ کیا ہے۔ یہ الزام بالکل غلط' بے بنیاد اور بے جواز ہے۔ جب یہ انجیل میں صحیح شکل میں لکھا ہوا ہی نہیں تھا اور نہ ہی اسے صحیح تلفظ میں ادا کرنے کی اجازت تھی تو اس کا غصہ عیسائیوں پر اتارنے کا کیا جواز ہے۔ کیونکہ انہوں نے بھی وہی کچھ کیا جو یہودیوں کی دلی تمنا

اور خواہش تھی۔ خدا کا صحیح اور حقیقی نام لینا اتنا سنگین جرم قرار دیدیا گیا تھا کہ اسے دنیا میں سزائے موت دے کر' آخرت کی زندگی میں بھی ملعون اور جہنمی ٹھہرادیا گیا تھا۔

(9) اگر یہودیوں کو اس کا بالکل صحیح نام معلوم تھا تو پھر اس کے صحیح تلفظ کے بارے میں تنازعہ کیوں اور کیسے کھڑا ہو گیا؟

(10) کیا یہودی مذہبی رہنما خلوص دل سے چاہتے ہیں کہ دنیا کو خدا کا صحیح نام معلوم ہو جائے اور ہر کسی کے لبوں پر وہی نام ہو' یا وہ چاہتے ہیں کہ یہ ایک سربستہ راز رہے؟ اگر اس کے صحیح نام کا انکشاف کر دیا جاتا' تو ہر کسی کی زبان سے صحیح نام ادا ہونے کے امکانات بہت بڑھ جاتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہودی یہ سمجھتے ہیں کہ علم جتنا کم ہو گا اتنا ہی اچھا رہے گا۔

(11) بائبل میں یہ کہاں لکھا ہے کہ خدا کو حقیقی نام کی بجائے ایڈونائی یا کسی اور نام سے پکارا جائے؟

(12) آیئے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ خداوند عالم کے دو نام' ''جیہوواہ'' اور ''ایڈونائی'' ہیں۔ دونوں نام چونکہ اسی کے ہیں' اس لیے اس کی کوئی معقول وجہ نہیں کہ وہ ایک نام سے بہت خوش ہو جاتا ہو اور دوسرا نام سن کر وہ اتنا ناراض ہو جاتا ہو کہ اس نام سے پکارنے والے کو عبرتناک سزا دلانا چاہتا ہو۔

(13) جب خدا اپنے نام کو اتنا ناپسند کرتا ہو کہ اس نام سے پکارے جانے پر برہم ہو جاتا ہو تو پھر اسے اس کا انکشاف کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟ اگر کوئی انسان ایک نام سے نفرت کرتا ہو تو وہ اس کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اگر خدا نے بھی اسی طرح اپنے نام کا انکشاف نہیں کیا یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کان میں سرگوشی کر کے اسے بتایا اور کسی اور کو نہ بتانے کی بھی تلقین کی ہے تو پھر یہ سوال پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا کہ یہ نام زبان سے ادا کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

(14) یہودیوں نے اسے ایک سربستہ راز کہا ہے۔ ایک اعلیٰ وارفع ہستی کا ذاتی نام' اہل دنیا کے استعمال کے لیے نہیں ہے' اور اسے زبان پر لانے کی سزا موت مقرر کر دی

گئی ہے۔

(15) اپنے کسی پیارے شخص یا ہستی کا نام بار بار لینے میں ایک خاص لذت ہوتی ہے۔ جتنی بار کوئی زیادہ پکارتا ہے اتنا ہی اس کی محبت کا ثبوت ملتا ہے۔ کتاب گنتی .... (Numbers) کے باب 6' آیت 27 میں لکھا ہے: ''اس طرح وہ میرے نام کو بنی اسرائیل پر رکھیں اور میں ان کو برکت بخشوں گا'' اور زبور میں لکھا ہے: ''تا کہ وہ جان لیں کہ تو جس کا نام یہوواہ ہے تمام زمین پر بلند و بالا ہے'' (83:18)

(16) کسی نام کی قدر و قیمت اس کے معانی اور اہمیت کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر اس کے معنی معلوم نہ ہوں تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ''جیہوواہ'' کو پُر عظمت' باوقار اور بابرکت نام سمجھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

(17) کسی کا ذاتی نام وہ ہوتا ہے جس میں اس کی تمام صفات سموئی ہوئی ہوں۔ اس طرح ''جیہوواہ'' کو ذاتی نام قرار دینا درست نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ نام ہستی باری تعالیٰ کی صرف ایک صفت' (جس کا ذکر یہودیوں کی تفسیروں میں کیا گیا ہے) یعنی ''وہ ہے'' کا مظہر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک صفاتی نام ہے' ذاتی نہیں ہے۔

(18) استثناء (Deuteronomy) کے باب 28' آیت 58 سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت خوفناک نام ہے۔ کتاب پیدائش کے باب 32' آیت 30 میں آتا ہے ''اور یعقوب نے کہا' میں نے خدا کو روبرو دیکھا تو بھی میری جان بچی رہی'' استثناء باب 7' آیت 21 میں ہے۔ ''سو تو ان سے دہشت نہ کھانا کیونکہ خدا تیرے بیچ میں ہے اور وہ خدائے عظیم اور مہیب ہے۔'' استثناء کے باب 10' آیت 17 میں آیا ہے....... ''کیونکہ خداوند تمہارا خدا' الٰہوں کا اِلٰہ خداوندوں کا خداوند ہے' وہ بزرگوار اور قادر اور مہیب خدا ہے جو رُو رعایت نہیں کرتا اور نہ رشوت لیتا ہے۔'' نحمیاہ (Nehemiah) کے باب 1' آیت 5 میں ہے'' اور کہا اے خداوند' آسمان کے خداوند' خدائے عظیم و مہیب جو ان کے ساتھ ہے جو تجھ سے محبت رکھتے ہیں اور تیرے حکموں کو مانتے ہیں' عہد و فضل کو قائم رکھتا ہے' میں تیری منت کرتا ہوں۔'' خوفناک اور مہیب جیہوواہ کے تصور کو بہت بلند نام نہیں کہا جا سکتا۔ اگر اس میں

زیادہ محبت اور شفقت کا اظہار دکھایا جاسکتا تو اس کو محض نام لے لینے کی پاداش میں اتنی سخت سزائیں دینے والا نہیں ظاہر کیا جانا چاہیے تھا۔

(19) یہودیوں کے فقیہہ جنہیں عبرانی زبان جاننے کا دعویٰ ہے اور بائیبل کا فہم رکھنے کے بھی مدعی ہیں' ان کا کہنا ہے کہ ایڈونائی' جیہوواہ کا متبادل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ایڈونائی کو جیہوواہ سے بہتر ہی پایا ہو۔ ورنہ ایک اعلیٰ نام کو کم درجے کے نام سے بدلنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

(20) امریکہ کے شہروں میں سڑکوں پر تین قسم کے سائن پوسٹس ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن پر "سڑک بند ہے" لکھا ہوتا ہے' دوسرے وہ سرخ سگنل ہوتے ہیں جن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ سڑک خطرناک ہے۔ تیسرے گرین سگنل ہوتے ہیں جو امن و سلامتی کا نشان ہوتے ہیں۔ انجیل کی کتاب پیدائش میں خطرے کا نشان 156 جگہوں پر ہے۔ پوری انجیل میں' علماء کے بیان کے مطابق' 6823 ایسے نشانات ہیں۔ ایک قاری کو دو قسم کے خطرات سے سابقہ پڑتا ہے۔ (i) یہ کہ خدا کا نام مشکوک اور مشتبہ ہے۔ اور (ii) کیا پڑھا جانا چاہیے اور کیا نہیں پڑھا جانا چاہیے؟ بہ الفاظ دیگر' سڑک بند ہے اور زندگی کے لیے آگے ایک مثبت خطرہ موجود ہے۔ یعنی اگر آپ صحیح تلفظ سے پڑھیں تب بھی آپ کی جان نہیں بچ سکے گی۔ اس کی دوسری جانب "ایڈونائی" کی سبز روشنی ہے جو یہ ہدایت دیتی ہے کہ "بالائی راستہ چھوڑ دو' زیریں راستہ اختیار کرلو۔" لہٰذا آپ پر یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ اگر سلامتی مطلوب ہے تو جیہوواہ کے نام کی تلاوت کرنے سے باز رہو۔ لیکن یہ بات قابلِ فہم نہیں ہے کہ چار حروف "YHVH" کی محض ادائیگی آپ کو اس دنیا میں بھی سنگین خطرات سے دوچار کرسکتی ہے اور "فیلو" (Philo) کے کہنے کے مطابق اگلے جہان میں بھی عذاب النار میں مبتلا ہوجائیں گے۔ انجیل میں یہ بات 6000 بار کہی گئی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہودی اور عیسائی پادریوں کی ایک نمائندہ کانفرنس بلا کر ان باتوں کو انجیل سے خارج کردیا جائے۔

(21) انجیل کے احکاماتِ عشرہ (Ten Commandments) میں اس نام کی تلاوت سے

سختی سے منع کیا گیا ہے۔ کیا یہ تجویز پیش کی جاسکتی ہے کہ انجیل میں سے اس حکم کو خارج کر کے لفظ ''اللہ'' شامل کر لیا جائے تاکہ لوگوں کو دنیا میں موت کی سزا اور آخرت میں آگ کے عذاب سے بچایا جاسکے۔

(22) کتاب گنتی (Numbers) باب 6' آیت 27 میں آیا ہے۔ ''اور وہ میرے نام کو بنی اسرائیل پر رکھیں' میں ان کو برکت بخشوں گا'' لیکن جب خدا کا نام خود ہی گم ہو چکا ہے تو تمام برکت اور اس کا کرم' قوم کے نصیب میں سے خارج ہو گیا ہے۔ تو پھر کیوں نہ بنی اسرائیل کے نام' اللہ کے نام پر رکھ دیے جائیں؟ وہ انہیں لازماً برکت بخشے گا۔

(23) خدا کا صفاتی نام ''جیہوواہ'' اس کے فعل کے تینوں حالتوں (tenses) میں موجودگی کا اظہار کرتا ہے۔ عبرانی میں ''Jehu'' فعل مستقبل ہے ''Have'' فعل حال اور ''Hawa'' فعل ماضی ہے۔ ''جیہوواہ'' انہی چار حروف (YHVH) کو ملانے سے وجود میں آتا ہے یہ اگرچہ حرفوں کا ایک بچگانہ سا ملغوبہ ہے جو ناقص بھی ہے تاہم اگر اس ترتیب کو بدل بھی دیا جائے' معنی وہی رہیں گے۔ خواہ ''Jehovah'' کو کتنے ہی ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے۔ مثال کے طور پر ''HYVH'' ''HVHY'' ''VHHY'' ''HHYV'' ''VYHH'' وغیرہ وغیرہ۔ ان کے معنی وہی رہیں گے جو ''جیہوواہ'' کے ہیں۔ کیونکہ حروف وہی ہیں' معنی بھی وہی رہیں گے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ''Yehovah'' منفرد مفہوم کا حامل ہے۔

(24) ''یہوواہ'' گرامر کے قواعد کی رُو سے بالکل غلط ہے' اس بات پر یہودی اور عیسائی سکالرز میں مکمل اتفاق ہے۔ اب کہا جانے لگا ہے کہ ''Yahveh'' فعل مستقبل ہے جس کے معنی ''آنے والا'' (The Coming One) بنتے ہیں۔

(25) اس ضمن میں مسیحی دوستوں سے ایک سوال پوچھنا بے جا نہ ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ جب یہودی اور عیسائی دونوں اس نقطے پر متفق ہیں کہ خدا کا نام' انسان کے منہ سے نہیں نکلنا چاہیے' یہی ممانعت حضرت عیسیٰؑ کے نام کے سلسلے میں بھی کیوں نہ کر دی جائے؟ جنہیں کہ عیسائی یکے از ارکانِ تثلیث مانتے ہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے

کہ خدا کا نام لینے کی تو سختی سے ممانعت کر دی گئی ہے اور جس کو وہ اس کا بیٹا مانتے ہیں اس کا نام لینے کی پوری آزادی ہے۔ خاص طور پر اس حقیقت کے پیش نظر کہ عہد نامہ جدید کی پوری آزادی ہے۔ خاص طور پر اس حقیقت کے پیش نظر کہ عہدنامہ جدید کے ابتدائی چار صحیفوں (Gospels) میں مسیح کا نام لینے کی ممانعت موجود ہے۔ مثلاً دیکھیے لُوقا 9:20،21 اور متّی 16:15-20۔ ''مسیح نے اپنے شاگردوں سے کہا...... مگر تم لوگوں سے کیا کہو گے کہ میں کون ہوں؟ شمعون پطرس نے جواب دیتے ہوئے کہا تو زندہ خدا کا بیٹا مسیح ہے۔ اور اس (مسیح) نے انہیں سختی سے کہا کہ ''کسی کو یہ بات ہرگز نہ بتانا کہ میں مسیح ہوں۔'' یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ عیسائی اپنے لارڈ (آقا) کی اتنی واضح ہدایت کی اطاعت نہیں کرتے۔ وہ باپ کے نام کا اعلان نہیں کرتے لیکن اس کے بیٹے کے نام پر اپنے سرنگوں کر دیتے ہیں۔

آنے والے آقا کا نام

خدا کی وحدانیت وتوحید جس شدت وتکرار اور ناقابلِ تردید دلائل کے ساتھ قرآن میں پیش کی گئی ہے کسی دوسری آسمانی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ علاوہ ازیں جس واضح اور قطعی انداز میں پیغمبر کے محض ایک انسان ہونے کا بار بار اعلان' اس کے اپنے منہ سے کرایا گیا' کسی دوسرے پیغمبر پر نازل شدہ کتاب میں نہیں پایا جاتا۔

کرشن' رام چندر' بودھ اور عیسیٰؑ کے ماننے والوں میں ان کی الوھیت کے دعوے کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ یہ صورت حال اس وجہ سے ہے کہ ان کی جو کتابیں اس وقت دستیاب ہیں ان میں اس نقطے کے بارے میں ابہام اور اشتباہ پایا جاتا ہے انہوں نے جو الفاظ اپنی زبان سے کہے تھے ان میں کوئی شکوک وشبہات نہیں تھے لیکن صدیوں کے بعد ان کے جو بیانات اور اقوال ہم تک پہنچے ہیں ان میں یقیناً بہت سی پیچیدگیاں اور بے شمار الجھاوے موجود ہیں۔

ان کے برعکس قرآن نے توحید باری تعالیٰ کے عقیدے اور اس کی تائید میں ہر لحاظ سے کامل دلائل کے انبار لگا دیئے ہیں اور نبی کی انسانی فطرت کے ثبوت میں اتنے روشن شواہد اور براہین پیش کر دیے ہیں کہ بال برابر شبہے کی گنجائش باقی نہیں ہے۔

قدیم آسمانی کتابوں مثلاً ''استثناء'' (Deut) 33:2 اور ''یہوداہ کا عام خط'' (General Epistle of Jude) 14:1 میں پیغمبر اسلام کی آمد کو خدا کی آمد سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن کسی کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ہندوؤں' بودھوں اور عیسائیوں کی طرح ہم بھی حضرت محمد ﷺ کو خدا کی تجسیم (Incarnation) یا اس کا بیٹا یا (نعوذ باللہ) خود خدا سمجھتے ہیں۔ مسلمان توحید باری تعالیٰ کے بارے میں بے حد حساس ہیں اور اس عقیدے کی دل وجان سے حفاظت کرتے ہیں۔ وہ کسی صورت میں بھی اپنے نبی کو خدا' یا اس کی تجسیم یا اس

کا بیٹا سمجھنے کی غلطی نہیں کر سکتے۔

خدا کی بذاتِ خود آنے کی اہمیت' ہمارے عقیدے کی رُو سے' یہ ہے کہ اس کی ہستی' اس کی صفاتِ کاملہ اور اس کے قادرِ مطلق ہونے پر ہم ایمان رکھیں اور اس کی طرف سے پیغمبروں سے کیے گئے وعدوں کی تکمیل اور حق و صداقت کی فتح و کامرانی پر یقین کریں۔

یہ درست ہے کہ خدا ناقابل تصور (Inconceivable) ہستی ہے یعنی وہ ہمارے تصورات کی حدود سے بالاتر ہے لیکن اس کے اوصاف اور اس کی قدرت کاملہ کے مظاہر کے حوالہ سے اس کے وجود کا ثبوت مل جاتا ہے۔ اس کے اوصاف اس کی تخلیق اور دیگر مظاہر فطرت سے بھرپور طریقے سے منعکس ہو رہے ہیں۔ وہ ''المبدی'' ...... موجدِ زندگی ہے' وہ القابض ...... یعنی کنٹرولر ہے جو تمام موجودات کو ان کی حدود کے اندر رکھتا ہے۔ وہ الخافض ...... مغلوب کرنے والا یعنی غرور کا سر نیچا کرنے والا ہے۔ وہ المقیط ...... محفوظ کار ہے یعنی اپنی تمام پیدا کردہ اشیا کی صلاحیتوں اور خواص کو محفوظ کرنے والا ہے۔ یہ قرآن میں بیان کی ہوئی اس حیرت انگیز صفات میں سے چند ایک ہیں' یہ اتنی متنوع اور اتنی وسیع ہیں کہ انسانی دماغ ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ قرآن میں سورۃ البقرہ کی آیت 255 میں کہا گیا ہے:

وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے) پھر سورۃ یونس کی آیت 61 میں فرمایا گیا ہے:

وَمَاتَکُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَاتَتْلُوْامِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَاتَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا عَلَیْکُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ؕ وَمَایَعْزُبُ عَنْ رَّبِّکَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْبَرَ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ۔ (اے نبیؐ تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو' اور لوگو' تم بھی جو کچھ کرتے ہو' اس سب کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے' نہ چھوٹی' نہ بڑی' جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو۔)

ذاتی نام کسی شخص' جگہ یا چیز کی پہچان کے لیے ہوتا ہے' اس سے ہم اس کو دوسرے

اشخاص دوسری جگہوں اور چیزوں سے الگ شناخت کرتے ہیں۔ دنیا کی مختلف اقوام کی بنیادی زبانوں میں خدا کے ''ذاتی'' ناموں کی تعداد 150 ہے۔ ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سوائے ایک کے' سب صفاتی نام ہیں۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اسلام سے قبل جتنے بھی مذاہب تھے وہ اپنے اصولوں کے لحاظ سے ہمہ گیر (Universal) نہیں تھے۔ وہ بلاشبہ ان زمانوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی تھے اور سب کے سب سچے مذاہب یا ادیان تھے۔ یہودیوں کو خدا کے ذاتی نام سے مطلع نہیں کیا گیا تھا۔ انہیں اس کا صرف ایک اشارہ دیا گیا تھا: اشارہ یہ تھا کہ وہ اس کا کامل ظہور (Perfect manifestation) مستقبل میں کسی وقت ہوگا۔ چنانچہ یہودی اس کے صفاتی نام کو ہی اس کا ذاتی نام سمجھتے رہے۔ بعد ازاں انہوں نے اسے بھی طاق نسیان پر رکھ دیا۔ جب حضرت محمدؐ دنیا میں تشریف لائے تو انہوں نے نہ صرف خدا کے ذاتی نام کا انکشاف کیا بلکہ اس پر بھرپور روشنی بھی ڈالی اور اس کا علم بھی پھیلایا اور اس کی حکمتوں کو بھی عام کیا۔ اسی بنا پر حضرت محمدؐ کی آمد کا قبل از وقت اعلان کرتے ہوئے انہیں...... ''خود خدا کی آمد''...... قرار دیدیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دنیا اصل سماوی علوم اور اصل حقیقتوں سے ان کی وساطت سے روشناس ہوگی۔

آنحضرت صلعم کی آمد سے پہلے پتھروں' درختوں' بچھڑوں' سورج' چاند' ستاروں اور سیاروں کی پوجا ہوتی تھی اور انہی کو خدا مانا جا رہا تھا۔

بنی اسرائیل کے خلاف پیغمبروں نے خدا سے یہی شکایت کر رکھی تھی کہ وہ ہمیشہ دوسری قوموں کے بتوں کی پوجا کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ فانی انسانوں اور فلاکت زدہ ماؤں کے جنے ہوؤں اور روٹی' پانی اور نیند کی محتاج روحوں کو بھی خدائی کے مقام پر فائز کر دیتے ہیں اور یہ حضرت محمدؐ تھے جنہوں نے انسانوں کو بتایا کہ خداوند تعالیٰ کا ذاتی نام اللہ ہے اور یہ کہ اسے کسی نے نہیں جنا اور نہ اس نے کسی کو جنا ہے۔ نہ وہ کھاتا ہے' نہ پیتا ہے' نہ سوتا ہے' نہ تھکتا ہے۔ چونکہ وہ تھکتا نہیں اس لیے اسے ساتویں روز ستانے اور آرام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ وہ ٹھنڈے باغوں میں ٹہلنے کا محتاج ہے اور نہ وہ ان لوگوں سے ڈرتا ہے جنہوں نے بابل میں بلند ترین میناروں کی تعمیر شروع کر دی تھی۔ وہ بادلوں میں سے اتر کو یعقوب سے

کشتی لڑنے کے لیے نہیں اترا تھا اور نہ اسے اپنے کارناموں پر رنجیدہ ہونے کی کبھی ضرورت پڑی تھی۔ وہ رحم مادر میں کبھی داخل نہیں ہوا' نہ وہ کبھی شیر مادر کا محتاج ہوا' نہ اس نے پوتڑے پہنے اور نہ کبھی وہ گرم خون رکھنے والے نوجوان کی صورت میں متشکل ہوا۔ نہ وہ یہ سن کر کہ اس کا کسی نے نام لیا ہے غصے سے آگ بگولہ ہوا اور نہ اس نے ایک شخص کو صرف اتنی بات پر قتل کر دیا کہ اس نے اس کے برتنوں کو چھولیا تھا۔ وہ مالک حقیقی ہے' نہ صرف بنی اسرائیل کا' بلکہ دنیا کی ساری اقوام کا آقا ہے۔ اس کا اسم بارک' اللہ ہے کیونکہ وہ کاملیت کی تمام صفات سے متصف ہے۔ اس میں کوئی سقم اور کوئی خامی یا کمزوری نہیں پائی جاتی۔ وہ قادر مطلق ہے' قوی عزیز ہے اور علیم وخبیر ہے۔ اس نے دنیا اس لیے تخلیق نہیں کی کہ انصاف کے تقاضے پورے کر سکے بلکہ اپنی مخلوق پر اپنی محبتیں اور اپنی شفقتیں نچھاور کرنے کے لیے پیدا کی ہے۔ پروفیسر لین نے اپنی ''عربی انگلش لغت'' میں اللہ کے نام کے معنی ''کاملیّت کی جملہ صفات کا مظہر'' لکھے ہیں۔

(1) وہ نہ صرف اعلیٰ ترین صفات سے متصف ہے بلکہ اس میں کاملیت کی تمام صفات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اگر ''یہوواہ'' اسرائیل کے خاص خدا کا نام تھا تو پھر ''ہری'' اور ''اوم'' ہندو خدا کا نام تھا اور ''یزداں'' پارسیوں کا خدا تھا۔ گاڈ' لارڈ' تھیو' شنگتی اور کموئی سب اسی کے نام ہیں۔ لیکن اللہ وہ واحد امتیازی نام ہے جس میں تمام دیگر نام شامل ہیں اور جو تمام اعلیٰ ترین خوبیوں اور اوصاف کا مظہر ہے۔

(2) قرآن مجید نے یہ کہہ کر دنیا بھر کی اقوام اور مذہب کو چیلنج کیا ہے ''لاؤ اللہ کے مقابلے میں کوئی نام' اگر تم سے ہو سکے جو اتنی جامع صفات کا حامل ہو''

(3) اس نام میں تمام قوتیں' تمام زیبائیاں اور کمالات موجود ہیں۔

(4) اللہ کا نہ کوئی ثانی ہے' نہ اس کا جمع کا صیغہ ہے' نہ وہ دو ہے اور نہ تین۔ بلکہ ایک سچا اور حقیقی خدا ہے۔

(5) اس کی وحدانیت ''ایک عدد'' کا معاملہ نہیں' کیونکہ ایک عدد کے اندر کسریں (Fractions) ہوتی ہیں جیسے 1/2' 1/3' 1/4.......بے شمار اور لامحدود کسریں۔ اسلامی دینیات میں اللہ کی وحدانیت یا اس کی توحید کا مطلب اس کا یکتا' لاثانی اور

عدیم النظیر ہوتا ہے۔(لَامِثْلَ لَہٗ وَلَامِثَالَ لَہٗ)

(6) یہوواہ، اوم، دیو اور تھیو وغیرہ کے برعکس خدا کا نام کسی ماخذ یا مصدر سے اخذ نہیں کیا گیا، کیونکہ خدا کسی سے پیدا نہیں ہوا۔

(7) یہوواہ اور اوم کی طرح، یہ نام نہ ملغم ہے اور نہ ممزوج اور نہ چند کسروں وا جزا کا مجموعہ۔ کیونکہ اعلیٰ و برتر ہستی انشقاق (Fragments) سے بالاتر ہے۔

(8) عربی زبان میں اللہ کا کوئی اسم تانیث نہیں ہے جیسے دیوا اور دیوی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ گاڈ.......دی فادر، گاڈ.......دی سن اور گاڈ.......دی ہولی گھوسٹ اور مدر آف گاڈ قسم کے جھمیلوں سے بالکل پاک اور صاف ہے۔

(9) نہ صرف اسلام آنے سے قبل، بلکہ زمانہ قبل از اسلام میں بھی یہ نام کسی بُت، سورج یا چاند، ستارہ یا سیارہ وغیرہ کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ یہ صرف حقیقی خدا کے لیے استعمال ہوا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُالسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ط كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔

(اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو۔ چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا۔ اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو، چاہے آگ اس کو نہ لگے (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں)۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے۔ وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب

واقف ہے۔

(سورۃ النور' آیت 35)

یہ تمثیل اس امر کا انکشاف کرتی ہے کہ خدا کا نام ہر قوم' ہر زبان اور ہر آسمانی صحیفے میں ایک واضح اور منفرد رنگ کے چراغ کی طرح جگمگاتا رہا ہے۔ مگر روشنی وہی رہی ہے۔ اگر آپ اس چراغ پر نگاہ جمائے رکھیں تو آپ وہیں جم کر رہ جاتے ہیں کیونکہ وہاں سے اختلافِ اصل ابھرنے لگتا ہے۔ جیہوواہ' اسرائیلیوں کا خداوند ہے' اوم ہندوؤں کا دیوتا ہے' یزداں زرتشتوں کا خدا ہے' شانگتی چینیوں کا آسماں ہے اور کاموئی امیدا جاپانیوں کا نجات دہندہ ہے' لیکن آپ روشنی (اللہ) پر نظر ڈالیں جو ان الگ الگ رنگوں کے چراغوں کے اندر چمک رہی ہے تو آپ شرک سے نجات پا کر اسلام کی توحید تک پہنچ جائیں گے جو کسی خاص رنگ و نسل' کسی خاص قبیلے' کسی خاص ذات یا کسی ملک کا مذہب نہیں بلکہ پوری انسانیت کا مذہب ہے۔

خدا کے سارے نام' اچھے اور شاندار ہیں۔ یونانی میں یہ ''تھیو'' ہے' سنسکرت میں ''اوم' بدھ ازم میں ''بدھا'' اور عبرانی میں ''جیہوواہ'' ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ''جیہوواہ'' ہے' اللہ ایڈوناٸی ہے' اللہ اوم ہے اللہ ''ایلوہم'' ہے' اللہ ''پرماتما'' ہے' اللہ ''شانگتی'' اور ''کاموئی'' ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈارون ایک اچھا سائنسدان تھا مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایک سائنسدان ایک اچھا ڈارون ہے۔ چنانچہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اللہ کے 200 نام ہیں۔ مشرق اور مغرب میں پائے جانے والے یہ سارے نام' خدا کے اوصاف ہیں لیکن اس کا ذاتی' خصوصی اور حقیقی نام صرف اللہ ہے جو کاملیت کی تمام صفات پر مشتمل ہے۔ ذاتی اور حقیقی نام کا ترجمہ نہیں ہو سکتا لیکن تمام دیگر ناموں کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ وہ یہ کہ ان ناموں کے تثنیہ اور جمع کے صیغے اور ان کی تانیث (Feminine gender) بھی موجود ہے اور یہ مرکب الفاظ ہیں۔ جن کے مصادر اور تفضیلی اسم بھی پائے جاتے ہیں۔

جس طرح موسم بہار' مختلف رنگوں کے پھولوں سے دنیا کی چمک دمک بڑھا دیتا ہے اور تھکی ہوئی آنکھوں میں ان سے ایک فرحت بخش تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وحی قرآن نے دنیا بھر کی مذہبی کتب میں پائے جانے والے خدا کے متنوع ناموں کو اپنے اندر

سمو کر مذہب کی دنیا کو ایک آہنگ اور ایک فرحت بخش تازگی عطا کر دی ہے۔ یہ قرآن کا منفرد اعجاز ہے کہ اس نے خدا کے جملہ اعلیٰ و ارفع ناموں کو تین مختصر آیات کے اندر سمو دیا ہے۔ جو اس امر کی بھی توثیق ہے کہ دنیا کے ہر مذہب میں خدا کا نام سرفہرست رہا ہے۔
آیات یہ ہیں:۔

هُوَاللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ هُوَ ۚ عالِمُ الغَیْبِ والشَّهادةِ ۚ هُوَالرَّحمانُ الرَّحِیمُ۔ هُواللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ هُوَ ۚ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلامُ الْمُئوْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ ۔ سُبْحانَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِکُوْن. هُوَ اللّٰهُ الْخالِقُ الْبارِئُ الْمُصوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۔ یُسَبِّحُ لَهٗ مَافِی السَّماوٰتِ والْاَرْضِ ۚ وَهُوَالْعَزِیْزُ الْحَکِیمُ۔

(وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں' غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا' وہی رحمان اور رحیم ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے' نہایت مقدس' سراسر سلامتی' امن دینے والا' نگہبان' سب پر غالب' اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا۔ پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے' اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے......سورۃ الحشر آیات 22-24)

یہاں سے آپ چند صفحے پیچھے پلٹائیں' تو آپ دیکھیں گے کہ ''اللہ'' تمام مقدس ناموں کا ایک عظیم مجموعہ ہے۔ اس کے اندر خدا کے وہ تمام نام موجود ہیں جنہیں دنیا کی 60 بنیادی زبانیں بولنے والے انسان احترام و عقیدت پڑھتے ہیں اور ان کے سامنے سر نیاز خم کرتے ہیں۔ آپ اس پر ایمان لائیں تو آپ کا عقیدہ مکمل ہو جائے گا اور آپ جملہ انسانیت کے مذہب کے قابل احترام ممبر بن جائیں گے۔

انبیاء کا مذہب

قرآن مجید کی پہلی آیت جس سے میں نے اس کتاب کی ابتداء کی ہے' چار مہتم بالشان الفاظ کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ایک لفظ نام کے ہم معنی ہے اور دیگر تین الفاظ میں ایک اس کا اصل نام ...."اللہ" اور دوسرے دو الفاظ ...."الرحمان" اور "الرحیم" اس کی صفاتِ شفقت و رحمت ہیں۔ میں اس کے اصل نام کی پُرعظمت اہمیت کے بارے میں اپنے عاجزانہ نظریات کے اظہار کے بعد اب اس کی دو اعلیٰ ترین صفاتِ شفقت و رحمت کے بارے میں کچھ کہنے کی کوشش کروں گا۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق' خدا نے اپنی صفتِ رحمانیت یعنی بے حد مہربان ہونے کی وجہ سے کائنات کو تخلیق کیا۔ اس نے اپنی اس رفیع الشان صفت کی بنا پر جو کہ سراسر اس کی اپنی ذات سے صادر ہوئی' اس کامل اور جیتی جاگتی کائنات کو وجود بخشا۔ اور اسی کی بنا پر اس نے بنی نوع انسان پر اپنی مہربانیوں کی بارش کر دی۔ جس کا قرآن مجید میں یوں ذکر آتا ہے۔ "وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْم" (اگر اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو نہیں گن سکتے' حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی درگزر کرنے والا اور رحیم ہے...... سورۃ النحل:18)

ہمیں اس کی اسی صفت کی وجہ سے وحی اور ہدایت میسّر آئی ہے یعنی اس نے کتابیں نازل فرمائیں اور انبیاء بھیجے۔ جس طرح اس نے تمام قوموں اور نسلوں کی جسمانی اور طبعی ضروریات پوری کیں' اسی طرح ان کی روحانی ضرورتوں کو بھی پورا کرنے کا اہتمام فرمایا۔ تاہم زمانے کے نشیب و فراز اور مختلف تبدیلیوں کے باعث انسان' آسمان سے نازل شدہ پیغامِ ہدایت کو اس کی اصل شکل میں برقرار رکھ سکا۔ یہودیوں کی توریت اور عیسائیوں کی انجیل'

بنیادی سچائی سے ہم آہنگ نہ رہ سکیں۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اصل سچائی سے ان کا تناقض بڑھتا ہی چلا گیا۔ توریت اور انجیل مسلسل ''جیہوواہ'' کو اسرائیلیوں کا خدا کہتی رہیں۔ ہندوؤں نے اس بات پر اصرار شروع کر دیا کہ اندرا یا اوم' آریائی نسل کا خدا ہے۔ زرتشتوں نے بھی اتنی ہی شدت سے یہ دعویٰ پیش کر دیا کہ ''آہورامزداہ'' (Ahura Mazdah) صرف زرتشت کے پاس روشنی لے کر پہنچا تھا۔ ان سب نے اپنی غلط سوچ کی وجہ سے ہدایت پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ ان اقوام اور مذاہب کے برعکس اسلام کا اعلان یہ ہے کہ خدا (اللہ) دنیا بھر کی قوموں کا حکمران اور مالک ہے۔ لہٰذا اس کی اولین اور اہم ترین صفت مہربان اور شفیق ہونا کسی منتخب قوم کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ عربی کے لفظ ''الرحمان'' کے معنوں میں یہ مفہوم شامل ہے کہ وہ سب انسانوں پر اپنی مہربانیاں اور شفقتیں نچھاور کرتا ہے خواہ انہوں نے ان کے مستحق بننے کے لیے کچھ بھی نہ کیا ہو۔ وہ سب کو روزی دیتا ہے' سب کی جملہ ضروریاتِ زندگی پوری کرتا ہے اور اس نے سب کی روحانی رہنمائی کا بھی پورا پورا اہتمام کیا ہے۔

اگر دنیا کے تمام مذاہب خدا کی اس صفت پر ایمان رکھتے ہیں تو انہیں اس امر کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ خدا کی وحی کسی خاص قوم یا کسی خاص جغرافیائی خطے تک محدود نہیں تھی۔ چنانچہ تمام انبیاء کا وہی مذہب ہونا چاہیے جو یہ اعلان کرتا ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں انبیاء مبعوث ہوئے تھے اور اپنے تمام پیروکاروں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ ان سب پر ایمان لائیں۔

خدا کے نام' چند رسوم کے حوالے سے نہیں رکھے گئے اور نہ ہی دانہ تسبیح کے ذریعے شمار ہونے کے لیے آئے ہیں۔ قرآن ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ مذہب' چند عقائد' چند رسموں اور تسبیح کے دانوں پر شمار ہونے والے ناموں کا نام نہیں اور نہ ہی وہ بدھ مت والوں کے آلاتِ عبادت (Prayer wheel) پر مشتمل ہے جو پہیے کے چکروں کے دوران بشکل دعا پڑھی جانے والی رسم ہے۔ مذہب ایک طرزِ زندگی ہے جو ربّ العالمین نے انسانی کردار کی تشکیل اور اس کی رہنمائی کے لیے بھیجا ہے۔ لہٰذا انسان خدا کے ناموں سے اسی صورت میں نفع اٹھا سکتا ہے کہ وہ انہیں مسلسل اور شعوری طور پر اپنا وردِ زبان بنا لے۔ اور اس طرح وہ ان ناموں کے اظہار کا ذریعہ بن جائے۔

یہ درست ہے کہ خدا' نا قابلِ تصور (Inconceivable) ہے لیکن اس کی صفات اور اس کی تخلیقات اس کے وجود کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید کی سورۃ البقرہ کی آیت 138 میں فرمایا گیا ہے: صِبۡغَةَ اللّٰهِ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً وَّنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ۔ (اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو گا۔ اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے لوگ ہیں۔) پھر آگے سورۃ الصّف کی آیت 61 میں بتایا گیا ہے۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الۡاَرۡضِ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ۔ (اللہ کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ غالب اور حکمت والا ہے)۔ ان کی تمام صفات کا اظہار فطرت کی بُوقلمونیوں سے ہوتا ہے جو مختلف اشیاء کے پیدا ہونے' بڑھنے' پھلنے پھولنے اور بالآخر معدوم ہو جانے کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ کوئی اچھا شہری' حتیٰ کہ کوئی دہریہ (Agnostic) بھی ان ناموں کی مقتضیات سے انحراف کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یعنی ہر شخص کو ماننا پڑتا ہے کہ یہ کائنات خاص طریقوں اور قوانین سے سرِمو انحراف نہیں کر سکتی۔ آپ ایک سائنسدان کی طرح مطالعہ کریں تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ کائنات میں ایک خاص نظم و ضبط' ایک خاص قانون اور ایک معقول اندازِ افزائش پایا جاتا ہے' یہاں کوئی بھی چیز مقررہ دوائر سے باہر نہیں نکل سکتی۔ جب گھاس کا ایک تنکا تک کسی قانون اور نظام کے بغیر وجود میں نہیں آتا تو انسان کا خالق جو سبھی کا خالق ہے وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے کہ کسی خاص نسل کے لوگوں کو اپنی عنایات اور مہربانیاں نچھاور کرنے کے لیے منتخب کر لے اور دوسروں کو پرے دھکیل دے۔ دوسری جانب ہر قوم یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس کا اختیار کردہ مذہب خدائی مذہب ہے' لہٰذا مذہبِ انسانیت یہ ہے کہ تمام مذاہب پر ایمان لایا جائے اور سب کو منجانب اللہ سمجھا جائے۔ اگرچہ ان کی طرف سے بھیجی ہوئی کتابیں انسانی دست بُرد سے محفوظ نہیں رہ سکیں' اس میں انسانوں نے اپنی خواہشات کے مطابق کافی ردو بدل کر دیا ہے لیکن یہ کہنا کہ دوسری اقوام کو خدا کی طرف سے کوئی ہدایت ملی ہی نہیں خدائے رحمان و رحیم کی توہین کے مترادف ہے۔ قرآن کہتا ہے: ''اَلرَّحۡمٰنُ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ۔ (نہایت مہربان خدا نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے' اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا...... سورۃ الرحمان آیات 1-4) جس خدا نے انسان کو پیدا کیا' اس نے اس کے معاش یعنی اس کے نان نفقے کے

اسباب بھی پیدا کر دیئے۔ اس کی زندگی برقرار رکھنے کے لیے ہواؤں' بارشوں زمینوں کی زرخیزیوں اور گرمی' سردی وغیرہ جتنی چیزوں کی ضرورت تھی وہ اس نے اپنے آپ مہیا کر دیں' یہ اشیا انسان کے کسی استحقاق کا نتیجہ نہیں تھیں۔ اسی رحمان و رحیم نے انسان کو قرآن اس لیے عطا کیا کہ یہ اس کی روحانی زندگی کی ضرورت تھا۔ جس طرح جسمانی ضرورتوں کے لیے اس نے بہت سے عطیات دیے ہیں' اسی طرح اس نے روح کی ضرورتوں کے لیے وحی کا بندوبست کر دیا۔ اس لیے جو لوگ وحی کی عالمگیریت کا انکار کرتے ہیں وہ یہ بھی نہیں مانتے کہ دنیا کی تمام قوموں میں انبیاء مبعوث کئے گئے تھے۔ ان کا یہ انکار خدا کی رحمانیت کے انکار کے بھی مترادف ہے۔ اس مفہوم کو قرآن یوں بیان کرتا ہے: كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْخَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ۔ (اے نبی اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں تا کہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے' اس حال میں کہ یہ اپنے نہایت مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں......سورۃ الرعد' آیت 30)

اگر خدا اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے تو اس کی محبت سب انسانوں کے لیے ہے کسی خاص گروہ تک محدود نہیں ہے۔ پانی سے بپتسمہ دینے سے انسان میں کوئی تبدیلی نہیں آ جاتی۔ ایمان اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ سب قوموں کے پیغمبروں کو تسلیم کیا جائے اور سچائیوں کو قبول کیا جائے خواہ وہ کہیں بھی پائی جاتی ہوں۔

مذہب کی ہمہ گیریّت

ایف میکس مُلر لکھتا ہے کہ انسان بنیادی طور پر ''مذہبی اور ذی ادراک'' (Religious and Rational) مخلوق ہے۔ تاریخ عالم میں کوئی بھی ایسا دور نہیں آیا جس میں انسان مذہب کے بغیر پایا گیا ہو۔ دور قدیم سے ایک روایت چلی آ رہی ہے کہ جب کسی آدمی کو پیشوا' پیر یا آقا مانا گیا تو یہ کہا گیا کہ اسے ''اوپر'' سے ہدایت ملتی ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ ''اوپر'' سے مراد مافوق الفطرت ہستی ''خدا'' ہی تھی۔ عبرانیوں کا تصورِ خدا ''Henotheistic''

تھا' جس کے معنی یہ تھے کہ ''ہمارا خدا خدائے واحد'' ہے اور دوسرے لوگوں کے اپنے اپنے خدا ہیں۔ اس طرح وہ کئی خداؤں کے قائل تھے' جن میں سے سب سے ''بڑے'' کو انہوں نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ عہد نامۂ قدیم (Old Testament) کے طالب علموں کو آج بھی یہ سبق پڑھا جاتا ہے کہ عبرانی پیغمبروں کی دی ہوئی تعلیمات کے مطابق خدا چنیدہ لوگوں کے گروہ کے سامنے ''خود'' بطور اپنی وحی ظاہر ہوا تھا۔ یہ ایک لحاظ سے توحید ''Monotheism'' تو تھی مگر یہ توحید خالص نہیں تھی' کیونکہ انہوں نے دوسری قوموں کے لیے الگ الگ خدا مان رکھے تھے' ''اصلی'' اور حقیقی خدا کو اپنی خاص نسل کا پروردگار تسلیم کیا ہوا تھا۔ اور اب تک ایسا ہی چلا آ رہا ہے۔ ایف میکس مُلر مزید کہتا ہے کہ ''خدا کے ایک ہونے کے تصور کے جراثیم عبرانی تہذیب کے آغاز سے بھی پہلے سے چلے آ رہے تھے۔ سامی قبیلوں میں اپنے خدا کے ساتھ باقی دنیا کے الگ خدا کا تصور بھی موجود تھا''۔

ول ڈیوران اپنی کتاب ''Story of civlization'' میں لکھتا ہے: ''ضابطۂ حمورابی' 1902ء میں ''سوس'' (Sus) کے مقام سے دریافت ہوا یہ ایک آتشی چٹان کے استوانے (cylinder) پر نہایت خوبصورتی سے کندہ کیا گیا تھا، یہ استوانہ 1100 قبل مسیح میں ایک جنگ میں لوٹے ہوئے مال کے طور پر بابل سے ایلام لایا گیا تھا۔ اسے موسوی قوانین کی طرح عطیۂ آسمانی سمجھا جاتا تھا۔ استوانے کی ایک طرف بادشاہ کی تصویر ہے جس میں اسے ''شمش'' سے یہ ضابطہ وصول کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اور اس کا دعویٰ ہے کہ اسے خدا نے حمورابی کہہ کر مخاطب کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک بندہ خدا ہے جسے رعایا کو امن و امان کی زندگی اور ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن کرنے پر تقرّبِ الٰہی حاصل ہوا''

ہندوؤں کے ویدوں میں لکھا ہے: ''وہ کون سا خدا ہے جس کے سامنے ہم قربانی پیش کریں؟ یہ وہ خدا ہے جو ہمیں سانس دیتا ہے، ہمیں شکتی (طاقت) دیتا ہے۔ جس کے حکم کے سامنے اُجلے دیوتا (فرشتے) ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں' جس کا سایہ ہمیشہ رہے گا جو زندگی کے بعد موت دیتا ہے' جو اپنی بے پناہ قدرت کی وجہ سے پوری چمکتی اور دھڑکتی دنیا کا بادشاہ بنا ہے' وہ سارے انسانوں اور حیوانوں پر حکمرانی کر رہا ہے۔ یہ وہ ہے جس کی منشا و مرضی کی وجہ سے آسمان اور زمین مضبوطی سے کھڑے ہیں اور اندر سے اس کے خوف سے

لرزاں رہتے ہیں۔ وہی واحد خدا ہے جو سب دیوتاؤں کے اوپر ہے۔ (رگ وید 10، 121، 2.......4، 5)

شمالی امریکہ، کینیڈا گرین لینڈ اور الاسکا وغیرہ کے اسکیموز بھی اپنے مذہب پر فخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "یورپین ہمارے علاقے میں آداب زندگی اور نیکیاں سیکھنے کے لیے آئے تھے۔" (S and k vol 1, ; Somnerfelkways,-13 page 358)

انسانی تہذیب کی تاریخ پر ایک سرسری ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انسانیت کو ترقی کی موجودہ منازل پر پہنچانے میں مذہب نے بے حد موثر کردار ادا کیا ہے۔ انسان میں جو کچھ اچھائیاں یا نیکی کے جذبات ہیں وہ خدا پر ایمان کا نتیجہ ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر کوئی دہریہ بھی اعتراض نہیں کرسکتا۔ انبیاء اور اوتاروں نے اپنے اپنے ادوار میں انسانیت کی خدمت کر کے نسل انسانی کی پوری تاریخ بدل دی۔ اگر ہم مشرق بعید سے لے کر مغرب کے آخر تک کا دورہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ جاپان، چین، تھائی لینڈ اور برما میں بدھ ازم، شنٹو ازم اور تاؤ ازم ہے اور انڈیا میں غالب مذہب ہندو ازم ہے، ایران میں زرتشت کا مذہب پھیلا رہا ہے۔ شام، بابل اور فلسطین میں اسرائیلی انبیاء ہوتے تھے۔ مصر میں "کتاب الاموات" "Book of the dead" کی تعلیمات کی روشنی پھیلی رہی۔ یونان میں یونانی صحیفے اور جرمنی میں قدیم جرمن صحیفے لوگوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ سکنڈے نیویا میں "Idd" اور امریکہ میں "پوپالووہ" (Popalvow) مذہبی اقدار کے فروغ کا ذریعہ بنی رہیں چنانچہ ہم دنیا کے ہر خطے کو مذہب سے جگمگاتا پاتے ہیں۔ اب آیئے یہ دیکھیں کہ مذہب کیا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہوتے ہیں؟

مذہب اور اس کے مقاصد

مذہب کی نوعیت کیا ہے اور یہ کیا کام آتا ہے، یہ ذرا غور طلب مسئلہ ہے۔ لفظ "مذہب" کہاں سے آیا اور کہاں سے اخذ کیا گیا اس پر زمانۂ قدیم میں بھی بحث مباحثہ جاری رہا اور یہ آج بھی ایک کھلا سوال بنا ہوا ہے۔ لغت نویسوں نے اس پر کافی تحقیق کی ہے لیکن وہ کسی ایک تعریف پر متفق نہیں ہو سکے۔ "سکیٹ" اپنی "Etymological Dictionary" میں

لکھتا ہے کہ لفظ مذہب "Religion" (1) لاطینی لفظ "Religio" سے فرانسیسی زبان میں آیا جس کے معنی ہیں "تقدس"۔ (2) اس لفظ کا تعلق "Religens" سے ہے جس کا مطلب خداؤں سے ڈرنا' ہے۔ یہ "Neg.ligens" کے برعکس معنی دیتا ہے جس کے معنی "غافل" کے ہوتے ہیں۔ سسرو نے اپنی لغت "Denatura deoram" میں لکھا ہے کہ مذہب کا لفظ "relegere" سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں محتاط سلوک کرنا۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ جو لوگ خداؤں سے متعلقہ باتوں پر غور و خوض کرتے رہتے تھے انہیں "relegiose" کہا جاتا تھا۔ دیگر لغتوں میں بھی کم و بیش اسی طرح کی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ زیادہ تر لغت نویس اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر خدا کا مطیع سمجھنے کا نام مذہب ہے۔ اس کی کامل ترین صورت آسمان میں سمجھی جاتی ہے جہاں فرشتے' پیغمبر اور دیوتا ہمیشہ خدا کی تسبیح وتہلیل میں مصروف رہتے ہیں اور اپنا ہر لحہ اس کی اطاعت میں گزارتے ہیں۔(HERMANN, Catholic Encyclopedia)۔

ہندوؤں اور بدھوں کا تصور مذہب

ہندومت اور بدھ مت میں مذہب کے لیے دھرم یا دھرمان کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ دھرم مذہب کے مساوی نہیں ہے۔ یہ "دھر" سے نکلا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں "تھامنا برداشت کرنا' مدد دینا' برقرار رکھنا اور محفوظ کرنا" لفظی طور پر اس کا مطلب' ہے قانون۔ رگ وید میں "دھرمان" کے معنی مضبوطی سے قائم رہنا' مستقل مزاج ہونا' قانون اور ضابطے کے اندر رہنا' کے ہیں۔ (اسے اکثر سزا کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے) اس سے مراد نیکی' اخلاق' انصاف اور بدھ کی سچائیاں اور قوانین بھی لی جاتی ہیں۔(ROBERT CAESAR, Dictionary of the pali languages)

ویدوں میں یہ لفظ خدا کے سچے مذہب کے مفہوم میں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ مختلف ممالک کے لوگوں کے طریق زندگی اور ان کے طرز عمل کے حوالہ سے آیا ہے۔ اتھرو وید میں لکھا ہے "ہر خطے کے لوگ اپنی بود و باش کے مطابق مختلف زبانیں اور مختلف مذاہب اپناتے ہیں" اس طرح یہ لفظ اسی طرح استعمال ہوا ہے جیسے "بدھا کے دھماپد" میں استعمال کیا گیا

ہے۔("Dhammapad" page 360)

مذہب کا اسلامی مفہوم

عربی زبان میں مذہب کے لئے "دین" کا لفظ آتا ہے جس کے بنیادی معنے اطاعت' بدلہ اور سزا و جزا کے ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے: "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَام" (اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے......سورۃ آل عمران آیت 19)۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ عہد نامہ قدیم اور انجیلوں میں لفظ مذہب کہیں بھی نہیں آیا۔ یہاں مجھے ایک بار پھر مذہب اور دھرم کی تعریف پر بحث کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ اس حوالے سے یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مذہب نے جہاں بنی نوع انسان کی بڑی مفید خدمت کی ہے وہاں اس کے حوالے سے مذہبی اور فرقہ وارانہ دشمنیوں نے بھی جنم لیا ہے۔ اس وقت دنیا میں بیسیوں مذاہب پائے جاتے ہیں اور ہر مذہب کے سینے میں سینکڑوں ناسور اور پھوڑے ہیں۔ یہ عمومی مشاہدے کی بات ہے کہ ہر مذہب میں جوشیلے عناصر کافی تعداد میں موجود ہوتے ہیں جن کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ صرف ہمارا مذہب سچا ہے' باقی جو کچھ بھی موجود ہے وہ غلط ہے۔ یہ مقولہ اس حقیقت کا مظہر ہے کہ ایک شخص کے لیے جو چیز مذہب کی حیثیت رکھتی ہے وہ دوسروں کے لیے ایک قابل نفرت چیز ہے۔ ایک مخلص ہندو کے لیے ایک عیسائی اور ایک مسلمان اور علیٰ ہذالقیاس دیگر مذاہب کے پیروکار ملیچھ (قابل نفرت اور گندی شے) ہیں جبکہ ایک عیسائی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ہندو بے دین اور ملحد ہوتے ہیں۔ یہ مرض اتنا عالمگیر ہے کہ کوئی مذہب اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس رویئے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تمام مذاہب ایسے "پن روک" (Watertight compartments) بن گئے ہیں جن میں سے نہ پانی ٹپکے اور نہ ان میں داخل ہو سکے۔ یہ صورت حال بعض لوگوں کے خیال کے مطابق اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ لوگ مذاہب میں پائی جانے والی مشابہتوں پر زور دینے کی بجائے ان کے اختلافات کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔ اور ختلافات کی تشہیر کو ان کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ پیروکارانِ مذاہب اور خاص طور پر ان کے جنونی گروپوں کی انتہاپسندی نے مذہب کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰی لَیْسَتِ الْیَھُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ وَّھُمْ یَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِھِمْ (یہودی کہتے ہیں: عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کے پاس کچھ نہیں...... حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں......اور اسی قسم کے دعوے ان لوگوں کے بھی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم نہیں ہے......سورۃ البقرہ آیت 113)

ایک اور مقام پر قرآن کہتا ہے: وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ کَانَ ھُوْدًا اَوْنَصٰرٰی ط تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ ط قُلْ ھَاتُوْبُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ بَلٰی ق مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَلَہٗ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ ص وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ ان کی تمنائیں ہیں۔ ان سے کہو کہ اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو (دراصل نہ تمہاری کچھ خصوصیت ہے اور نہ کسی اور کی) حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے اس کے لئے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں ۔......سورۃ البقرہ آیات 112,111)۔ یہاں یہودیوں اور عیسائیوں پر الزام عائد کیا گیا ہے کہ وہ ایک ہی کتاب (عہد نامہ قدیم) کے پیروکار ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے بارے میں سچائی کا بھی انکار کر رہے ہیں۔ چنانچہ انجیل میں لکھا ہے کہ ''جب یہودیوں نے یہ خبر سنی کہ یسوع تبلیغ کر رہا ہے تو انہوں نے کہا کہ کیا ناصرہ سے کوئی اچھی چیز نکل سکتی ہے؟'' (یوحنا کی انجیل باب 1' آیت 46)۔ ''انہوں نے تو کیا تُو بھی گلیل کا ہے؟ تلاش کرو اور دیکھ کہ گلیل میں سے کوئی نبی برپا نہیں ہوگا۔'' (یوحنا کی انجیل باب 7' آیت 52)

ہندوستان کے باشندوں کی اکثریت ''ہندومت'' کی پیروکار ہے۔ یہ ہندودھرم کئی ہزار سال سے چلا آرہا ہے مگر تقریباً ایک صدی پہلے ایک نیا فرقہ آریہ سماج پیدا ہوگیا' اس کے پنڈتوں نے ہندو دھرم کی مسلمہ روایات کے خلاف متعدد کتابیں لکھیں جن میں انہوں نے لفظ ''ہندو'' کو ہی غلط قرار دیا اور کہا کہ یہ لفظ دشمنوں نے بطور مذمت ان پر چسپاں کیا ہے' اس کے معنی کالا آدمی' غلام' چور اور حرامی بچہ کے ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ اتنا کارگر ثابت ہوا کہ ہزاروں

لوگوں نے ہندو کا لفظ ترک کر دیا اور خود کو آریہ کہنا شروع کر دیا۔ یہ نئے فرقے کی طرف سے محض ایک حربہ تھا جس کے ذریعے اس نے اپنی تعداد بڑھا لی۔ حالانکہ لفظ آریہ کسی مذہب کا نام نہیں ہے۔ یہ ویدوں میں صرف ایک نسل' ایک رنگ یا ایک ذات کے معنوں میں آیا ہے۔ رگ وید میں متعدد مقامات پر لفظ آریہ کا ذکر ناپسندیدہ اشخاص کے طور پر استعمال ہوا ہے (مثلاً رگ وید 51:1' 8' 86:10' 19:36' 9:34:3' 3:49:10.......) ویدک شاعروں نے جہاں داسیوں (Dasus) سے پناہ مانگی ہے وہاں آریاؤں سے بھی پناہ مانگی ہے۔ اگر اول الذکر ڈاکو اور ملیچھ تھے تو ویدوں کے مطابق آریہ بھی انہی ناپسندیدہ حرکتوں کی وجہ سے بُرے سمجھے جاتے تھے۔

یہاں قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ویدوں کا کونسا مذہب ہے؟ یا یہ کس مذہب کی کتابیں ہیں۔ ویدوں نے کسی بھی مذہب کا نام نہیں لیا۔ دوسری طرف حضرت عیسیٰؑ نے بھی زندگی بھر اپنے پیروکاروں کو کوئی نام نہیں دیا۔ لیکن ہم مسلمان خود کو مسلمان کہتے ہیں اور ہندو' ہندو کہلاتے ہیں۔ یہ امر باعث حیرت ہے کہ عیسائی مختلف ملکوں میں الگ الگ نام اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً کرسچین' کرستان' ناصری' مسیحی' عیسائی اور یسوعی وغیرہ۔ ان کا اصل نام ایک سربستہ راز ہی رہا ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی جانتا ہے کہ ''کرائسٹ'' یونانی الاصل نام ہے اس نام سے گھر والوں نے انہیں کبھی نہیں پکارا۔ ''وفات'' کے بعد انہیں اس نام سے پکارنا مذاق کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟۔ جن لوگوں نے بائبل پڑھا ہے' وہ جانتے ہیں کہ زیادہ تر پیغمبروں کے دو نام تھے' ایک والدین کا رکھا ہوا نام اور دوسرا خدا کا پسند کیا ہوا نام تھا۔ متی کی انجیل میں آتا ہے کہ خدا کا فرشتہ مریم کے شوہر جوزف کے پاس آیا اور اس سے کہا ''ہم ایک بیٹا پیدا کریں گے تم اسے جیزز (یسوع) کے نام سے پکارنا'' (متی' باب 1 آیات 21,18) لیکن لوقا کی انجیل میں بیان کیا گیا ہے کہ فرشتہ جوزف کے پاس نہیں بلکہ مریم کے پاس آیا تھا اور اس نے ان سے کہا۔ ''مریم ڈرو نہیں کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے' اور دیکھ تو حاملہ ہوگی اور تیرے ہاں ایک بیٹا ہوگا' اس کا نام (جیزز) یسوع رکھنا۔'' (لوقا' باب 1' آیات 30' 31) جیزز۔ ''یہوشوا'' (Yehoshua) کے مساوی ہے جس کے معنی ''جیہوواہ'' یا ''خدا'' ''نجات دہندہ'' یا ''مددگار'' کے ہیں۔ یوشوا (Yoshua)' حضرت موسیٰؑ کا ایک فوجی کمانڈر تھا

جو اس نام والا پہلا آدمی تھا' بعد میں یہ نام یہودیوں میں بہت مقبول ہو گیا' بے شمار افراد اس نام والے ہو گئے۔ بہر حال خدا نے مریم کے بیٹے کا جو نام رکھا وہ "جیز ز" تھا' کرائسٹ نہیں تھا۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کرائسٹ' والدین کا رکھا ہوا نام نہیں تھا اور انہیں تمام زندگی اس نام سے کبھی نہیں پکارا گیا۔ لہٰذا حضرت مسیح کے شاگرد "کرسچین" نہیں کہلاتے تھے۔ وہ ایک ہی خاندان کے "بھائی"، ایک ہی آقا کے "عقیدتمند" اور ایک ہی "ایمان کے حامل" کہلاتے تھے۔ تاہم دنیا ان اجنبی اصطلاحوں کی اہمیت سے ناواقف تھی۔ لیکن چونکہ اس نئے مذہب کے وابستگان کو کوئی نہ کوئی نام دینا ضروری تھا اس لیے 43ء میں "انٹیوک" (انطاکیہ) کے مقام پر ایک اجتماع ہوا جس میں ان کو "کرسچین" کہہ کر پکارنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس کی یونانی شکل "کرسٹیانوس" (Christianus) تھی۔

"رسولوں کے اعمال" (Acts) کے باب 11' آیت 26 میں لکھا ہے "اور جب اس (برنباس) نے اس (پال) کو پایا تو وہ اسے انطاکیہ لے گیا جہاں وہ سال بھر رہا' یہاں لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا' اس طرح شاگردوں کی تعلیم و تربیت کے دوران پہلی بار ان کا نام کرسچین (مسیحی) پڑا۔ (رسولوں کے اعمال باب 11' آیت 26)

یہ نام اور یہ جگہ جہاں ان کا یہ نام پڑا' دونوں ہی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے اگرچہ اس نام کو اپنے لئے باعث فخر سمجھا' مگر یہ ان کا اپنا وضع کردہ نہیں تھا۔ نفرت کرنے والے یہودیوں کے لیے تو وہ ناصری (Nazarenes) اور گلیلی (Galileans) تھے' ان کے پاس عیسائیوں سے اظہار نفرت کے لیے اس سے زیادہ بُرے نام نہیں تھے۔ یہودی "مسیحا" کا پُر عظمت خطاب ان لوگوں کے لیے کیسے استعمال کر سکتے تھے جنہیں وہ ایک جعلی دعویدار کے پیروکار سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ پھر انہیں یہ نام غیر یہودیوں (Gentiles) نے ہی دیا ہو گا جنہیں یہودی مشرک اور ملحد قرار دیا کرتے تھے۔ اور ان کے پہلے کلیسا کے قیام کے لیے انطاکیہ سے بہتر کوئی بھی جگہ نہیں ہو سکتی تھی جو کافروں اور بُت پرستوں کی سرزمین سمجھی جاتی تھی۔ اس کلیسا کے عہدیداروں اور پادریوں نے یہاں کے لوگوں کی تعلیم و تربیت میں دن رات ایک کر دیئے۔ اور ان کے منہ سے "کرائیسٹ" "مسیحا" اور "Anointed" (مقدس تیل سے مالش شدہ) کے الفاظ بکثرت نکلتے تھے' اس کثرتِ تکرار کی

وجہ سے انطاکیہ کے لوگوں نے ازراہ تمسخر عیسائیوں کو ''کرائسٹس'' اور ''مسیحا'' کہنا شروع کر دیا۔ انہوں نے بھی انہیں یہ نام احتراماً نہیں بلکہ تمسخرانہ طور پر دیا تھا۔ مگر اس میں گالی یا نفرت کا تاثر بھی نہیں تھا (Dr. William Smith: Dictionary of the bible)

ٹرینچ نے اپنی کتاب ''On the study of Words'' میں لکھا ہے کہ عہد نامۂ جدید میں ہمیں لفظ 'کرسچین' حضرت مسیح کے پیروکاروں کے لیے استعمال ہوتا نہیں ملتا' ماسوائے ان کے دشمنوں کے' جو اسے ان کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اور سینٹ پال انطاکیہ کے بُت پرستوں کو تبلیغ کرتے ہوئے اسے استعمال کرتا تھا۔

جیمز بریڈسٹریٹ گرینوف اپنی کتاب ''الفاظ اور ان کا روزمرہ کا استعمال'' میں لکھتا ہے کہ حضرتِ مسیح کے بعد 150 سال تک ''کرسچین'' نام استعمال نہیں ہوا اسے بعد میں کلیمنٹ آف روما' برناباس اور ہرمز نے استعمال کیا۔ اس لفظ کے معنی ''جھوٹے پیغمبر کے سادہ لوح پیروکار'' ہیں۔ ''رسولوں کے اعمال'' (Acts) کے باب 11 آیت 26 میں لکھا ہے۔ ''اور ایسا ہوا کہ وہ سال بھر تک کلیسا کی جماعت میں شامل ہوتے رہے اور بہت سے لوگوں کو تعلیم دیتے رہے اور شاگردوں کو پہلی بار انطاکیہ ہی میں مسیحی کہا گیا'' یہی وہ زمانہ تھا' پال نے مسیحیت قبول کی تھی۔

پاپولر انسائیکلوپیڈیا آف بائیبل میں لکھا ہے کہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ''کرسچین'' ماسوائے ان امور کے جو عہد نامۂ جدید (اعمال 26' 28؛ پطرس کا پہلا عام خط) میں مذکور ہیں بطور نفرت استعمال ہوتا تھا' ابتدائی دور کے شاگرد نہ تو خود اسے اپنے لیے استعمال کر سکتے تھے اور نہ ہی ان کے اپنی قوم' یہود کی طرف سے ان کے لیے استعمال ہو سکتا تھا لہٰذا غالب گمان یہی ہے کہ یہ بُت پرستوں (Gentiles) ہی نے ان پر تھوپا تھا اور انطاکیہ کے سوا جہاں پہلا کلیسا وجود میں آیا کوئی جگہ انہیں بلند مقام نہیں دے سکتی تھی۔ یہاں کے باشندے اپنی ظرافت نام بگاڑنے (Nick-naming) میں بڑی شہرت رکھتے تھے''۔

اب سوال یہ ہے کہ لفظ مسیحی (کرسچین) کس نے ایجاد کیا؟ اس کے لیے ہمارے پاس کوئی براہ راست شہادت نہیں ہے۔ ایسا ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ عیسائیوں نے حواریوں کے عہد میں اسے اپنے لیے استعمال کیا ہو۔ وہ ایک دوسرے کو برادر' شاگرد' اور اہل ایمان کہتے تھے

لیکن کرسچین ہرگز نہیں کہتے تھے۔ صرف "پطرس کے پہلے عام خط" کے (باب 4' آیت 16) کے ایک فقرے میں "کرسچین" بمقابلہ "چور" اور "قاتل" استعمال ہوا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت مصنف بت پرست جابروں کے نقطۂ نظر سے گفتگو کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ سینٹ پال (رسولوں کے اعمال 26:28) نے بھی کرسچین نام استعمال کرنے سے گریز کیا۔ پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ عیسائیوں نے یہ خطاب خود وضع کیا ہو اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ یہودیوں نے اسے ایجاد کیا ہو۔ وہ عیسائیوں کو عہدنامہ جدید میں صرف ایک براہ راست نام سے پکارتے تھے وہ تھا "ناصری" (Nazarenes)...... (رسولوں کے اعمال باب 24' آیت 3)

غالب گمان یہی ہے کہ یہ نام انطاکیہ کی بت پرست آبادی نے تراشا تھا۔

نام کی اہمیت

"پطرس کا پہلا عام خط" سے معلوم ہوتا ہے کہ ملحدوں کی جانب سے عیسائیوں کو "کرسچین" کا نام دیا جانا' عملاً بدنیتی ہی تھا۔ (بحوالہ "رسولوں کے اعمال" 4' 15' 16/ 2' 12' 16) اس بدنیتی اور نفرت کا سبب یہ تھا کہ کرسچین ایک مصلوب شخص کے سامنے اظہار عبدیت کرتے تھے۔ جو یہودیوں کے لیے ایک سنگِ گراں اور بت پرستوں کے لیے ایک حماقت تھا (بحوالہ "کرنتھیون کے نام پہلا عام خط" باب 1 آیت 23)

ہارپر کی بائیبل ڈکشنری میں "کرسچین" کی اصطلاح کے بارے میں لکھا ہے کہ عہدنامۂ جدید کے زمانے سے ہی پیروکارانِ عیسیٰ کو "کرسچین" کہا جاتا تھا' ممکن ہے کہ غیر عیسائی بطور تمسخر انہیں اس نام سے پکارتے ہوں۔ "سائیکلو پیڈیا آف بائبلک لٹریچر" کا مصنف لکھتا ہے کہ یہ نام بجائے خود بھی قابل نفرت تھا اور جب ان لوگوں کے منہ سے نکلتا تھا جو اُسے قابل نفرت بھی سمجھتے تھے تو اس میں مزید ناگواری داخل ہو جاتی تھی۔

.....ہر عہد کے لیے واحد سچا مذہب:

قرآن مجید کی سورۃ ال عمران کی آیت 19 میں آتا ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الاِسْلَامَ (اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے)۔ یہ آیت ایک عملی نتیجے کی مظہر ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰ ؑ یا دیگر نبی جعلی تھے اور یہ مطلب بھی نہیں، اسلام اسی مفہوم میں واحد دین ہے جیسا کہ دیگر مذاہب کا دعویٰ ہے کہ ان کے سوا باقی سب ادیان جھوٹے اور باطل ہیں۔ اسلام کا دوسرے مذاہب کے بارے میں طرزِ عمل خیر سگالی نوعیت کا ہے۔ یہ سب سے عقیدت و احترام کا درس دیتا ہے اور سب پر ایمان لانے کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ "وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ (جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، ان سب پر ایمان لاتے ہیں......سورۃ البقرہ آیت 4)۔ اس ہدایت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام واحد مذہب ہے جس نے تمام پیغمبروں پر ایمان لانے اور اس سچ کا اعتراف کرنے کو لازم قرار دیا ہے، یہ اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ قرآنی آیت واضح کر رہی ہے کہ تمام انبیاء کا ایک ہی مذہب تھا، یعنی سب اسلام ہی لے کر آئے تھے۔ قرآن نے یہ اعلان کر کے ایک بہت بڑی آزمائش کا اہتمام کر دیا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ دنیا کے کروڑوں اربوں انسان جو گزشتہ صدیوں میں گزر چکے ہیں حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں اور ان کے ماننے والوں کی اب بھی بڑی تعداد موجود ہے۔ اسی طرح ہندو بھی خود کو زمانہ قدیم سے ہندو یا آریائی کہتے رہے ہیں اور اب بھی کہہ رہے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس یہودی، زرتشت اور بدھ بھی اپنے اپنے مذاہب کے پیروکار ہونے کا اعلان کر رہے ہیں، نہ کہ مسلمان ہونے کا۔ ان سب کو اپنے مذاہب سے پیار ہے اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے

کو تیار رہتے ہیں۔ اپنے مذہب سے اتنی عقیدت رکھنے والوں کے سامنے قرآن کا یہ اعلان کرنا کہ سب پیغمبر اندر سے ایک ہی تھے اور حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ کا مذہب اسلام ہی تھا کتنا مشکل اور سخت کام تھا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَاوَصّٰى بِهٖ نُوحاً وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآاِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوسٰى وَعِيسٰى اَنْ اَقِيْمُو الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْافِيْهِ (اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ......سورۃ الشوریٰ آیت 13)

جبکہ حضرت نوحؑ کو اپنی یہ بات امّت کو واضح طور پر بتانے کا حکم دیا گیا کہ:

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَاسَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ط اِنْ اَجْرِيَ اِلاَّ عَلَى اللّٰهِ لا وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا (تو میرا کیا نقصان کیا) میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہ تھا میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خواہ کوئی مانے نہ مانے) میں خود مسلم بن کر رہوں......سورۃ یونس آیت 72)

حضرت سلیمانؑ کا مذہب بھی اسلام تھا، قرآن ہمیں بتاتا ہے: قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلّٰهِ رَبِّ العالَمين۔ (وہ ﴿ملکہ شیبا﴾ اس پر پکار اُٹھی "اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی، اور اب میں نے سلیمانؑ کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کر لی......سورۃ النمل آیت 44) اِذْقَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ لا قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ العالَمِيْنَ۔ (جب اس کے ربّ نے اس (ابراہیمؑ) سے کہا: "مسلم ہو جا"۔ تو اس نے فوراً کہا، میں مالک کائنات کا "مسلم" ہو گیا......سورۃ البقرہ آیت 131)۔ اسی طریقے سے ابراہیم نے اپنے بیٹوں سے کہا۔ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرَاهِمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوبُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰے لَكُمُ الدِّيْنَ فَلاَ تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اس کی وصیت یعقوبؑ اپنی اولاد کو کر گیا تھا، اس نے کہا تھا کہ "میرے بچو! اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے۔ لہٰذا مرتے دم

تک مسلم ہی رہنا"...... سورۃ البقرہ آیت 132)' اسی سے اگلی آیت یہ ہے...... "اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يعقوبَ الموْتُ لا اِذْقَالَ لِبَنِيْهِ ماتَعْبُدُوْنَ مِنْ م بَعْدِيْ ط قَالُوْ نَعْبُدُ اِلٰهَکَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِکَ اِبْراهِيْمَ وَاِسْماعِيْلَ وَاِسْحَاقَ اِلٰهًا وَّحِدًا ج وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ (پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا؟ اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا: "بچو! میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے"؟ ان سب نے جواب دیا "ہم اسی ایک خدا کی بندگی کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیمؑ' اسماعیلؑ اور اسحاق نے خدا مانا ہے اور ہم اسی کے مسلم ہیں)۔ حضرت یوسفؑ کی دعا یہ تھی: تَوَفَّنِیْ مُسْلِماً وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصَّالِحِیْنَ (میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین سے ملا دے...... سورۃ یوسف آیت 101)۔ اسی طرح بتایا گیا...... وَقَالَ مُوسیٰ یا قَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْلهِ تَوَكَّلُوْآ اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمُوْن۔ (موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ "لوگو! اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس پر بھروسہ کرو اگر تم مسلمان ہو۔ سورۃ یونس آیت 84)۔ پھر دیکھئے کہ فرعون نے جب اپنے بلائے ہوئے جادوگروں سے انتقام لینا چاہا تو انہوں نے اللہ سے کیسے التجا کی: "رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ" (اے رب' ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اُٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرمانبردار ہوں...... سورۃ الاعراف آیت 126)

اور اسی طرح حضرت عیسیٰ کے حواریوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے......

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيْنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ ج قَالُوْٓ اٰمَنّاوَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلُمون (اور جب میں نے حواریوں کی طرف حکم بھیجا کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ وہ کہنے لگے کہ (پروردگار) ہم ایمان لائے تو گواہ رہیو کہ ہم مسلم ہیں...... سورہ المائدہ آیت 111)

اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْراة فِيهَا هُدًى وَّنُور" ج يَحْكُمُ بِهَاالنَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا...... (ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی جو مسلم تھے اسی کے مطابق ان یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے...... سورۃ المآئدہ آیت 44)

یہ آیات اس امر کا ثبوت ہیں کہ اسلام دنیا بھر کے انبیاء کا حقیقی مذہب ہے اور ان کی وساطت سے پوری انسانیت کا مذہب ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اسلام نہ صرف ہر پیغمبر کا دین ہے بلکہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق یہ ہر چیز کا فطری مذہب ہے:۔

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ۔ (اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دینُ اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چاروناچار اللہ ہی کی تابع فرمان (مسلم) ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے......سورۃ آل عمران آیت 83)

یہاں ہم قارئین کی توجہ کیتھولک انسائیکلوپیڈیا کے ایک اقتباس کی طرف مبذول کراتے ہیں جس میں مندرجہ بالا مفہوم ہی کی تائید کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ مذہب خدا کی طرف ایک رضا کارانہ اطاعت کا نام ہے' یہ اپنی کامل ترین شکل میں آسمانوں میں پایا جاتا ہے جہاں فرشتے ہمہ وقت خدا کی تسبیح وتہلیل میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے اوقات اس کی مرضی و منشا کے مطابق گزارتے ہیں۔ اس کی ترمیم شدہ شکل زمین پر پائی جاتی ہے جہاں دنیا بھر کے پیغمبر آتے رہے اور لوگوں کو مکمل طور پر خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ قرآن مجید کہتا ہے......وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى۔ (وہ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتا' یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے......سورۃ النجم آیت 3) یہی معاملہ سب انبیاء کا رہا ہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہا' صرف اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچایا ہے۔ ان کے اقوال اور افعال ایک ہی خدا کی مرضی ومنشا کی ترجمانی تھے۔ لہٰذا جن مذہبی صحیفوں میں ان سے گناہ' تجاوز اور حکم عدولیاں منسوب کی گئی ہیں وہ تحریفات ہیں' یہ اسلام کی عظمت کا ایک اور ثبوت ہے کہ وہ نہ صرف انبیاء کے معصوم ہونے کا عقیدہ پیش کرتا ہے بلکہ اصرار کرتا ہے کہ تمام کے تمام انبیاء بالکل بے گناہ اور خدا کے تابع فرمان تھے۔ "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامُ" میں لفظ "اسلام" اس نظامِ مذہب کے جوہر کی نشاندہی کرتا ہے جو اس نام کے حوالے سے یا اس کے ذریعہ سے وجود میں آتا ہے۔ اس کی بنیادی اہمیت قیامِ امن ہے جو اسلام کا مطمحِ نظر ہے۔ "اسلام" عربی کے لفظ "اَسْلَمَ" سے

ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں مکمل امن و آشتی اور سلامتی' اپنے اندر بھی اور باقی دنیا سے تعلقات میں بھی سلامت روی۔ دنیا میں قیام امن کے سلسلے میں اپنے فرائض اور ذمہ داریاں پوری کرنا اور اپنے ذمہ واجبات کی ادائیگی کا بھی اہتمام کرنا۔ خدا سے تعلق کا صرف یہی ایک مقررہ راستہ ہے اور یہی اسلامی تعلیمات ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے' دوسرے مذہبی صحیفوں میں یہودیت ہندومت' آریہ دھرم' زرتشت ازم اور عیسائیت کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا اور نہ ہی زرتشت' موسیٰ اور بودھ نے اپنے متبعین کو کسی نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ ایک ٹھوس تاریخی حقیقت ہے کہ ابتدائی دور کے شاگردوں نے لُوقا اور متی میں درج پیشگوئیوں کو مشکوک اور ناقابل اعتبار قرار دیدیا تھا:

''اور دیکھ تُو حاملہ ہو گی اور تیرے بیٹا ہو گا' اس کا نام یسوع رکھنا'' (لُوقا کی انجیل باب 1' آیت 31) ......''اسے ناصری (Nazarene) کہا جائے گا'' (متی باب 2' آیت 23)۔

اور یہ بالکل بجا کہا گیا ہے کہ جیزز کو روم نے نہیں بلکہ بُت پرست نصرانیوں نے بطور مسیح قبول کیا اور کرسچین بن گئے۔ مسیح کے اوّلین شاگرد نصرانی ہی تھے۔

......سب الہامی کتابوں کا لُبِ لباب

کسی کتاب کے بارے میں پہلا تاثر اس کے نام یا عنوان سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس کا مصنف اس کے لیے وہی نام یا عنوان تجویز کرتا ہے جو بہترین ہو اور قاری کو اسے پڑھنے کی ترغیب دے سکتا ہو۔ لیکن نام یا تو بہت معروف ہو یا فوراً اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہو۔ قاری کتاب کی طرف اسی صورت میں توجہ دے سکتا ہے جب وہ کتاب کو اپنے معاملات اور دلچسپیوں کے قریب تر پاتا ہو یا اس میں زیر بحث لائے گئے مسائل کو اپنے مسائل سمجھتا ہو۔ وید' توراۃ' انجیل' دھمپد اور زنداویستا اور دیگر مذہبی کتابوں کے نام بھی اس نقطۂ نظر سے خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔

ہم ان کتابوں کا تہہ دل سے احترام کرتے ہیں' باوجود اس امر کے کہ ان کے نام ''وحی'' کے طور پر نہیں اتارے گئے، رگ وید کی اصطلاح' اس کتاب کے متن میں نہیں پائی جاتی۔ توراۃ یا خمسۂ موسیٰ (Pentateuch) پانچ کتابوں پیدائش' خروج' احبار' گنتی اور استثناء کا مجموعی نام ہے جو ان کتابوں کے اندر نہیں پایا جاتا۔ یہ صرف ''دس احکامات'' (Ten commandments) کا نام ہے۔ لفظ انجیل (Gospel) حضرت مسیحؑ کی زبان سے کبھی نہیں نکلا۔ دھمپد' مہاتما بودھ کی قلمکاری کا نتیجہ نہیں ہے۔ جہاں تک ''زنداویستا'' یا ''اویستا زند'' کا تعلق ہے' اس کے بارے میں کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں' حتیٰ کہ اس کے مصنف کے نام کا صحیح تلفظ بھی کسی معلوم نہیں ہے۔

لفظ ''قرآن'' جو مسلمانوں کی مقدس ترین کتاب کا نام ہے' یہ علما اور فقہا کا رکھا ہوا نہیں بلکہ خود خدا نے اسے اس نام سے پکارا ہے جو قرآن 50 سے زائد بار آیا ہے۔ یہ اسمِ مصدر ہے جو ''قَرَ'' سے بنا ہے' اس کے بنیادی معنی ''اس نے چیزوں کو اکٹھا کیا'' کے ہیں۔

قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا جاتا رہا جو 23 سال میں مکمل ہوا۔ اس زمانے میں فنِ تحریر' دنیا بھر میں اپنے عہدِ طفولیت میں تھا' یہ اللہ نے ایک بے پڑھے (اُمّی) شخصؐ پر اتارا جو ایک جاہل ترین قوم کا فرد تھا۔ لیکن یہ رسول اکرمؐ کی زندگی میں ہی لکھا گیا' یکجا کیا گیا اور حفظ کر کے بھی دل و دماغ میں محفوظ کیا گیا' لکھنے والوں کی تعداد بھی کافی تھی اور حفظ کرنے والوں کی بھی بہت بڑی تعداد تھی' اسے ابتدائی لفظ سے لے کر آخری لفظ تک مروّجہ ذرائع کی مدد سے اکٹھا کر لیا گیا۔ یہ ایک منفرد' بے مثل اور تاریخی واقعہ تھا۔ اس کے سوا کوئی اور صحیفہ یا مذہبی کتاب اپنی حقیقی شکل میں محفوظ نہیں رہ سکی۔

یہ کوئی حادثہ یا محض اتفاقی امر نہیں تھا' بلکہ اس کی پہلے سے ہی پیشن گوئی کر دی گئی تھی۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ (بے شک یہ یاد دہانی......کتاب...... ہم نے اتاری ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں......سورۃ الحجر آیت 15) یہ نہایت تعجب خیز پیشین گوئیوں میں سے ایک ہے' جس کا سچ ثابت ہونا قرآن مجید کی حقانیت اور سچائی کی روشن ترین شہادت ہے۔ اس پیشگوئی کا درست ہونا اتنا بیّن واقعہ ہے کہ عظیم مستشرق میکس مُلر بھی اس کی تصدیق کرتا ہے اور مویئر (Muir) جیسا متعصب مصنّف بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ:

''دنیا میں غالباً اس کے سوا کوئی کتاب نہیں جو بارہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اپنے اصل اور خالص متن کے ساتھ آج تک محفوظ ہے'' (Muir's Life of Muhammad)

لفظ ''قرآن'' کے ایک اور امتیازی معنی ایک بڑے تالاب کے ہیں جس میں ہر طرف سے آنے والا پانی جمع ہوتا رہتا ہے۔ ایک ممتاز لغت نویس راغب کہتا ہے: ''قرآن کا مطلب ایک ایسا تالاب ہے جس میں چاروں طرف سے تیزی سے بہہ کر آنے والا پانی گرتا ہے اور اس کتاب کو قرآن اس لیے کہا جاتا ہے کہ تمام سابقہ الہامی کتابیں بھی اس میں یکجا ملتی ہیں''۔

قرآن' تمام مقدس کتابوں کی بہترین تعلیمات کا مجموعہ ہے جس کا اظہار وہ خود ہی ان الفاظ میں کرتا ہے: رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (خدا کے پیغمبر جو پاک اوراق پڑھتے ہیں جن میں مستحکم آیات لکھی ہوئی ہیں......سورۃ اَلْبَیِّنَة' آیات 3-2)۔ انسان کی رہنمائی کے لیے تمام ضروری ہدایات' جو خواہ پہلے صحیفوں میں شامل تھیں یا نہیں تھیں' قرآن میں موجود ہیں۔ اس طرح وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس میں تمام مقدس کتابوں

میں بیان کردہ نقاط کے علاوہ ایسی باتیں بھی ہیں جو ان کی خامیوں اور ادھورے پن کو دور کر دیتی ہیں۔

ایک دوسری جگہ پر قرآن نے اپنی یہ بات نہایت زوردار طریقے سے کہی: وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ۔ (اور ہم پے در پے ان لوگوں کے پاس (ہدایت کی) باتیں بھیجتے رہے ہیں تا کہ وہ نصیحت پکڑیں۔ جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور جب (قرآن) ان کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لے آئے۔ بے شک وہ ہمارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے (اور) ہم تو اس سے پہلے کے مسلم ہیں...... (سورۃ القصص' آیات 50-53)۔ ''ہم ان کی نصیحت کے لیے پے در پے ہدایات بھیجتے رہے'' کا مطلب یہ ہے کہ قرآن انہیں وہی کچھ کہہ رہا ہے جو پہلے کی الہامی کتابوں کے ذریعہ ان تک پہنچتا رہا ہے۔ انہیں یہ بات اس لیے یاد دلائی گئی ہے تا کہ ان کے لیے صداقت کو تسلیم کرنا آسان ہو جائے۔

اگر وہ پہلے نازل شدہ کتابوں کو نہیں بھی مانتے تو دو مختلف زمانوں میں مبعوث ہونے اور ایک دوسرے سے دُور کے مقامات پر آنے والے پیغمبروں کی باتوں کا یکساں اور مشترک ہونا' ان کے لیے لمحہ فکریہ ہونا چاہئے کہ یہ پاکباز لوگ مختلف قوموں میں آئے اور ایک دوسرے سے بالکل مختلف حالات میں ہوتے ہوئے بھی ایک ہی دعوت دیتے رہے ہیں تو یقیناً ان کو منصب نبوت پر فائز کرنے والی ایک ہی ہستی تھی۔ اور ان کی ایک دوسرے کے بارے میں پیشین گوئیوں کا درست ہونا بھی ان دونوں کی صداقت کا قطعی ثبوت مان لیا جانا چاہئے۔ اس آیت میں سابقہ پیغاماتِ خداوندی کے نقاط کے ساتھ قرآنی آیات کے ہم آہنگ اور مشترک ہونے پر اسی لیے زور دیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ ایک ہی صداقت کی کڑیاں ہونے کا ثبوت ہے۔

وحی اور شہد کی مماثلت

قرآن حکیم کی ایک سورۃ کا نام النّحل (شہد کی مکھی) ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ مکھّی ہر قسم کے پھولوں کا رس چوس چوس کر اسے شہد میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ یہ نام قرآن کے نام سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سارے عمل (Process) میں مکھی کو اس کی جبلّت (INSTINCT) سے رہنمائی مل رہی ہوتی ہے جو اسے یہ بتاتی ہے کہ پھولوں میں کونسا پھول بہترین ہے جس کا رس چُوسا جائے۔ اور کس طرح رنگ برنگے شربت بنائے جائیں۔ وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوتاً وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَراتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلاً ط یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِھا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ فِیْہِ شِفَآ ءٌ لِّلنَّاسِ ط اِنَّ فِی ذَالِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ۔ (اور دیکھو تمہارے رب نے مکھی پر وحی کردی کہ پہاڑوں میں، اور درختوں میں، اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں، اپنے چھتے بنا، اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس، ار اپنے ربّ کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غوروفکر کرتے ہیں۔ ......سورۃ النحل آیت 68-69)۔ مادی دنیا کی یہ مثال انسانوں کو یہ بات سمجھانے کے لیے دی گئی ہے کہ خدا کا قانون روحانی دنیا میں بھی اسی طرح کام کر رہا ہے۔ یعنی نبیؐ کو بذریعہ وحی سابقہ مذاہب میں سے چُن چُن کر اچھی باتیں بتا دی گئیں جو قرآن کی شکل میں اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان اپنی محنت سے یہ کام کرنے پر قادر نہیں تھا۔

مکھی کے محیّر العقول کارنامے پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسے چار قسم کا

الہام عطا کیا گیا ہے۔

(i) حیرت انگیز چھتے تعمیر کرنا

(ii) ہر قسم کے پھولوں اور پھلوں سے رس لے سکنا

(iii) اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں پر عجز و انکسار سے عمل پیرا رہنا۔

(iv) رس کو شہد میں تبدیل کرنا۔

مکھی کے اس الہام یا اس کی معجز نما جبلّت میں سینکڑوں نا قابلِ تصور اور فکر انگیز کاموں کی ہدایات پوشیدہ ہوتی ہیں جن کا مظاہرہ وہ موم کا محل تعمیر کرنے کے دوران کرتی ہے۔ اس طرح شہد کے چھتے اور قرآن مجید میں ایک حیرت انگیز مشابہت سامنے آتی ہے۔ جس طرح موسم بہار رنگا رنگ پھولوں اور ان کی مہک سے دنیا کی رونقوں کو دوبالا کر دیتا ہے' اسی طرح فطرت کی یہ شرمیلی کارکن طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب اپنے پروں پر تیرتی ہوئی شہد سازی کے عمل میں بے تکان مصروف رہتی ہے اور خدا کے سُجھائے ہوئے طریقوں پر عمل کر کے ایسی ایک نعمت کو وجود میں لے آتی ہے جسے کوئی دوسری مخلوق حتیٰ کہ انسان بھی تیار نہیں کر سکتا۔ وہ خدا کے طے کردہ طریقوں کے مطابق اپنی صلاحیتوں کے دھارے کو' ادھر اُدھر دیکھے بغیر' ایک ہی سمت میں رواں دواں رکھتی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَاَوْحىٰ رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ۔ (اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا کہ پہاڑوں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا)

آیئے اب شہد کی مکھی کے عربی نام پر غور کریں جو اس آیت کا اصل موضوع یا' اس کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ممتاز جرمن مؤرخ لیوپولڈ رینکی (متوفی 1886ء) لکھتا ہے ''عہد متوسط دو کلاسیکل زبانوں لاطینی اور عربی پر بجا طور پر فخر کر سکتا تھا لیکن عربی اپنے ذخیرہ الفاظ' اپنی گرامر اپنے اشتقاق و استخراج اور سلاست وفصاحت میں لاطینی سے کہیں آگے تھی۔'' خالق کائنات نے اسے خاص طور پر پسند کرتے ہوئے حضرت محمدؐ پر وحی اسی زبان میں نازل کی۔ کیونکہ اس جیسی جامعیت اور محاورے کسی دوسرے ادب میں نہیں ملتے۔

ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ان کے فروغ و ترقی کے لیے مثالوں اور موازنوں

سے مدد لیتے ہیں۔ دنیا میں متعدد زبانیں رائج ہیں لیکن اس پروں والے کیڑے کی خصوصیات کو جامع طور پر بیان کرنے کے لیے عربی سے زیادہ کوئی زبان موزوں نہیں ہے مثلاً ہم سنسکرت' لاطینی' یونانی اور انگلش سے بات شروع کرتے ہیں' ان میں اس کیڑے کو علی الترتیب ''مدھومکشی''، ''ایپس''، ''ہمنو پترا'' اور ''بی'' (Bee) کہا جاتا ہے۔ مدھومکشی ایک مرکّب لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''شہد کی مکھی'' ہیں۔ ''ایپس'' سے کوئی بھی معاشرت پسند یا خلوت پسند کیڑا مراد لیا جاسکتا ہے۔ ہمنو پترا دو لفظوں کا مرکّب ہے' ''ہمن'' کے معنی پردہ یا جھلّی اور ''اوپرا'' کے معنی پروں کو لپیٹ لینا یا تہہ کر لینا کے ہیں یعنی اڑنے والا ایسا کیڑا جو پروں کو لپیٹ لیتا ہے یا تہہ کر لیتا ہے۔

اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ناموں میں کوئی بھی منطقی یا فلسفیانہ مفہوم نہیں ہے جبکہ اس کے عربی نام ''النّحل'' کے معنی ایک ایسے تحفے کے ہیں جو زیر بار احسان لائے بغیر دیا جائے بلکہ دینے والا' اسے اپنا فرض سمجھ کر پیش کرے۔ نامور عربی لغت نویس راغب اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ شہد کی مکھی کو النّحل کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ پھولوں اور پھلوں پر بیٹھتی ہے لیکن انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتی۔ وہ انہیں استعمال کرتی ہے مگر ان سے زیادتی نہیں کرتی۔ اس کا ان کے ساتھ سلوک ہم انسانوں کے سلوک سے بالکل برعکس ہے۔ ہم انہیں استعمال بھی کرتے ہیں اور کچھ نہ کچھ بدسلوکی بھی کر ڈالتے ہیں۔

مزید برآں یہ پھولوں سے بے حد محبت کرتی ہے اور انہیں بے تحاشہ بوسے دیتی ہے۔ اس کے بوسے کی مٹھاس وٹامن B1' فاسفورس اور تھایامین وغیرہ کے مواد پر مشتمل ہوتی ہے۔ مکھی اگر پیار بھرے بوسے نہ دے تو پھول بارآوری سے محروم ہو جائے۔ کیونکہ اس عمل سے وہ ایک پھول کا زردانہ (Pollen) دوسرے پھول میں منتقل کر دیتی ہے۔ اگر اس مکھی کو پھولوں سے رغبت نہ ہوتی تو لاکھوں قسم کے پودوں کے بیج ہی تشکیل نہ پاتے اور وہ دنیا میں اپنا نام ونشان چھوڑے بغیر مٹ جاتے۔ ہم آج جو سیب کھاتے ہیں وہ ایک شگوفے سے پک کر سیب بنا تھا اور وہ گلابی پھول شہد کی مکھی کے بوسے کا محتاج تھا' اگر اسے یہ نہ ملتا تو وہ ہرگز سیب نہ بن سکتا۔

ہم شہد کی مکھی اور دیگر جانوروں میں تقابل وموازنے کو اس وقت تک کماحقہٗ نہیں

سمجھ سکتے جب تک' ہم ان کی الگ الگ افادیت سے آگاہ نہ ہوں۔ مثلاً گائے ہمارے لیے بے حد مفید ہے اور ہمیں بھیڑ بکری کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن انہیں زندہ رہنے کے لیے گھاس کی ضرورت ہے' گھاس نہ ہوگی تو وہ کیا کھائیں گی؟۔ ہر قسم کی گھاس' اناج اور پھلی دار پودوں کی باروری (Fertilization) کے لیے شہد کی مکھیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ گائے اور بھیڑ بکریاں ان مکھیوں کی محتاج ہیں۔ اسی لیے قرآن فرماتا ہے اِنَّ فِی ذَالِکَ لَاٰیٰتٍ لِقَوْمٍ یَتَفَکَّرُوْنَ (اس میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں......سورۃ الرعد آیت 3)

تاہم ''النحل'' بہت پُر معنی اور بے حد فلسفیانہ نام ہے۔ دنیا بھر کے جانور باری باری کوئی نہ کوئی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بعض وقتوں اور بعض مقامات پر ان میں سے کوئی ایک بھی مرکزی اہمیت کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ ریتلے صحرا میں اونٹ ایک مفید جانور ہو سکتا ہے معتدل خطوں میں ایسا وقت آیا تھا کہ جس میں گھوڑا انسان کے لیے ایک مفید ترین جانور تھا۔ آجکل ہم کہہ سکتے ہیں کہ گائے ہمارے لیے مفید ترین مویشی ہے۔ ہم کتے کی وفاداری کو بھی نہیں بھول سکتے۔ لیکن یہ تمام جانور اور مویشی ہم سے اپنے لیے چارے اور پناہ گاہ کا مطالبہ کرتے ہیں جس کے لیے ہمیں محنت کرنا پڑتی ہے اور اخراجات بھی برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ لیکن شہد کی مکھی مفید ترین جانور ہے جسے پیدا کر کے خدا نے ہم پر بے حد احسان کیا ہے یہ ہمارے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ یہ بغیر کسی غرض کے' ہمیں فائدہ پہنچاتی ہے۔ جب تک اسے تنگ نہ کیا جائے کسی کو ڈنک نہیں مارتی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ یہ پھولوں کو استعمال کرتے ہوئے انہیں نقصان نہیں پہنچنے دیتی بلکہ انہیں زرخیز اور ثمر آور بناتی ہے۔

جانوروں کی دنیا میں سے شہد کی مکھی واحد جانور ہے جو انسان کے سب سے زیادہ کام آئی ہے۔ انسان نے بہت پہلے اس کی قدر و قیمت پہچان لی تھی اور وہ شہد کو بہت سی بیماریوں کا علاج سمجھتا اور اسے آبِ حیات یا امرت قرار دیتا رہا ہے ہندو اس کو دیوتاؤں کی افسانوی خوراک کہتا تھا جو اس کے عقیدے کے مطابق کھانے والوں کو امر بنا دیتی تھی۔ اسے گائے بھینس کی طرح گھر میں پالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ اپنی خدمت کرائے بغیر خدمت کے لیے مستعد رہتی ہے۔ اور آدم اور حوا کے زمین پر قدم رکھنے سے پہلے اس کام میں لگی ہوئی

تھی۔ یہ واحد کیڑا ہے جو ہماری خوراک کا ایک اہم حصہ ہمیں فراہم کرتا ہے اور ہم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔

چشم کشا مشابہت

اس مکھی کا طریق کار روحانی دنیا میں خدائی قوانین کے طریق کار سے بے حد مشابہت رکھتا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم نبی اکرمؐ کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیتا ہے......''یاقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا' اِنْ اَجْرِیَ اِلاَّ عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ط اَفَلاَ تَعْقِلُوْن......(اے برادرانِ قوم' اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا' میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے ......سورۃ ہُود آیت 51)۔ جیسے شہد کی مکھی انسان سے کوئی معاوضہ مانگے بغیر اور جائے پناہ (Shelter) طلب کیے بغیر ایک گرانقدر تحفہ پیش کر دیتی ہے' اسی طرح قرآن بھی خدائے رحمان و مہربان کی طرف سے بندوں کے لیے ایک بے مثال تحفہ ہے۔ بزرگ و برتر خدا نے جس طرح انسان کو پیدا کرنے سے پہلے اس کی جملہ ضروریات مہیا کر دی تھیں' اسی طرح اس نے اس کی روحانی زندگی کے لیے قرآن اتار دیا جو انسان کی اپنی محنت کا نتیجہ نہیں' بلکہ سراسر یکطرفہ انعام و اکرام ہے۔

انسانوں کے لیے یہ دنیا' علم اور تجربہ حاصل کرنے کی ایک جگہ کے سوا کچھ نہیں ہے ہم یہاں سیکھنے اور تجربات کو اپنی یادداشت میں جمع کرنے کے لیے آتے ہیں۔ یادداشت (Memory) انسانی صلاحیتوں میں اولین چیز ہے جو اس کی ترقی کے لیے مثبت کردار ادا کرتی ہے۔ پھر ہمارے پاس ذہانت (Intellect) ہے جس کی ہم نشوونما کرتے ہیں اور اس کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس کا زیادہ تر انحصار ہمارے ماضی کے تجربات پر ہوتا ہے۔ ماضی ہمیں خیالات اور اصول مہیا کرتا ہے جن سے کہ ہم آج گھرے ہوئے ہیں۔ ماضی سے ہمیں جو کچھ ملا ہے وہ اپنی حتمی حالت (Finished form) میں نہیں ہے۔ کوئی چیز محض اپنی قدامت کی بنا پر تقدس کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی کہ ہمارے لیے اسے من و عن قبول کرنا لازمی قرار دیا جائے۔ اس لیے ہم ماضی کی روایات کی جانچ پڑتال کر سکتے ہیں' یہی ہمارے لیے ترقی کا ایک راستہ ہے جس پر ہم اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔

دوسری طرف شہد کی مکھی کو ماضی کا کوئی تجربہ حاصل نہیں ہے' ہماری طرح وہ سکول میں نہیں پڑھی جس میں اسے ماضی کے تجربات پڑھائے گئے ہوں' نہ ہی اسے کوئی ٹریننگ گراؤنڈ میسر آیا ہے جس میں وہ اپنی صلاحیتوں کو ترقی دے سکتی ہو۔ پھر بھی وہ اپنی ایسی سرگرمیوں میں مصروف رہتی ہے کہ کوئی اور زندہ مخلوق' حتیٰ کہ انسان بھی اس کی ہمسری نہیں کرسکتا۔

کہنے کو تو کہا جاسکتا ہے کہ اصل ذہانت' قوتِ استدلال ہے جو انسانی ترقی کے لیے ایک سنہری شاہراہ ہے' شہد کی مکھی اس صلاحیت سے محروم ہے۔ وہ غیر فقاری (Invertebrate) جانوروں کے زمرے کی سے تعلق رکھتی ہے (قوتِ استدلال صرف فقاری جانوروں کا خاصہ ہوتی ہے) اس کے باوجود وہ اپنے کام میں عقلمندی' ذہانت' محکم فیصلے کی قوت' سائنس اور آرٹ کا زبردست مظاہرہ کرتی ہے' اور اپنے ارادوں اور اصولِ عمرانیات کے معاملوں میں اختراع پسندی سے کام لیتی ہے۔

ایک ماہر مگس بانی (Apiarist) لکھتا ہے: ہم شہد کی مکھیوں کے بارے میں جتنا زیادہ مطالعہ کرتے جاتے ہیں' ہماری حیرت اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے' ان کی زندگیاں اور ان کی عادات بالکل ہم جیسی ہیں۔ ان کی بودوباش اور ان کا بڑے بڑے گروہوں کی صورت میں مل جُل کر کام کرنا' بالکل ویسا ہی ہے جیسے ہم شہروں میں مشترکہ حکمت عملی کے تحت کرتے ہیں۔ ان کا اجتماعی نظام اتنا کامل ہے کہ انسان کے لیے قابل تقلید مثال بن سکتا ہے۔

قرآن مجید کہتا ہے: اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ۔ (یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں......سورۃ النحل آیت ۶۹) یہ بات کسی کرامت سے کم نہیں کہ ایک ذہین اور عقلمند آدمی ایک محروم گویائی کیڑے کی سرگرمیوں کا جب مشاہدہ کرتا ہے تو اسے اس میں خود سے زیادہ عقل اور دانشمندی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

مختصراً یہ کہ شہد کی مکھی کے طور طریقوں میں خدا کے بنائے ہوئے قوانین فطرت کا بھرپور مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کے چھتے کے مشاہدے سے اس کی انجینئرنگ' سائنس' آرٹ' آرکیٹکچر' کیمسٹری' سوشل سٹڈیز' سائیکالوجی اور اعلیٰ ریاضی کی زبردست مہارت سامنے آتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حیوانات سارے کام اپنی جبلّت (INSTINCT) کے تحت کرتے ہیں' آیئے دیکھتے ہیں کہ جبلّت کیا ہوتی ہے؟ جبلّت کے معنی ہوتے ہیں ''آگے دھکیلنا' اکسانا' چبھونا' ایک خاص طریقے سے کام کرنے کا فطری اور طبعی رجحان' مہیجات کا فطری اور غیر اکتسابی ردعمل' جیسا کہ دودھ پی کر افزائش پانے والے جانور ماں کی چھاتیوں کی طرف خود بخود بڑھ جاتے ہیں' اس کے لیے انہیں کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ سب الفاظ جبلّت کی وضاحت کے لیے دیے گئے ہیں۔

مل جُل کر رہنے والے جانوروں میں شہد کی مکھیاں سرفہرست ہیں۔ ان کی ہنرمندی اتنی حیرت انگیز اور ان کا نظم وضبط اتنا غیر معمولی ہوتا ہے کہ خطرہ ہے کہ ہم ان کی فہم وبصیرت پر انہیں بہت زیادہ کریڈٹ دے بیٹھیں گے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ جبلّت کی کارکردگی کہاں جا کر ختم ہوتی ہے اور ذہانت کا کہاں سے آغاز ہوتا ہے؟ آیئے اب اس موضوع کو لیتے ہیں کہ اسے اپنا گھر بنانے کے لیے کیا الہام ہوا ہے؟ اسے حکم دیا گیا کہ ''اپنے لیے پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا'' اس کی تعمیل کے لیے اسے جبلّت دیدی گئی کہ وہ گھر بنانے کے لیے کس جگہ کا انتخاب کرے؟ اس پر اچھی طرح غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے جانوروں کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ جن میں گھر تعمیر کرکے اپنے کی جبلّت سرے سے ہی نہیں ہوتی اور دوسرے وہ ہیں جن میں یہ ہوتی ہے۔ مؤخر الذکر کو اوّل الذکر جانوروں پر فوقیت حاصل ہے۔ جو جانور گھر نہیں بناتے وہ اپنی پوری زندگی گھوم پھر کر گزارتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں:

''اور ایک فقیہہ نے پاس آکر اس سے کہا اے استاد جہاں کہیں تو جائے گا میں تیرے پیچھے چلوں گا۔ یسوع نے اس سے کہا کہ لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور پرندوں کے گھونسلے مگر ابن آدم کے لیے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں'' (متی: باب 8' آیات 19' 20؛ لوقا: باب 9' آیت 58,57)

بعض جانور صرف اس وقت گھر بناتے ہیں جب ان کے ہاں بچے پیدا ہونے والے ہوں۔ ریڑھ کی ہڈی والے بہت سے جانور مستقل گھروں میں رہتے ہیں' ان میں سے بعض زمین میں سوراخ بنا لیتے ہیں' بعض پرندے بڑے خوبصورت گھونسلے بناتے ہیں' ہر جانور

اپنے طریق رہائش کے عین مطابق اپنا گھر بناتا ہے۔

گھر بنانا انسان کی اہم ترین عالمگیر سرگرمیوں کا حصہ ہے۔ اس کو آرامدہ اور خوشگوار رہائش گاہ کی شکل دینا' ایک آرٹ بھی ہے اور ایک سائنس بھی۔ تعمیری کام کے کئی شعبے ہوتے ہیں اور جو کوئی بھی گھر بناتا ہے اسے کئی قسم کی ''ہنر مندیوں'' کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ ان سے کام اسی وقت لیا جاسکتا ہے جب یہ سیکھ لی جائیں۔ گھریلو زندگی سے متعلقہ مسائل حل کرنے کے لیے وہ بہت سے علوم' مثلاً سائنس' آرٹ' سوشل سٹڈیز سائیکالوجی اور ریاضی سے کام لیتا ہے۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے اسے جن فنون سے ضرورت ہوتی ہے ان میں سے ایک فن' دوسروں کے ساتھ رہنے کی صلاحیت بھی ہے۔

اس نقطہ نظر سے شہد کی مکھی کی زندگی کو دیکھئے۔ یہ ایک سماجی کیڑا ہے جو بڑے بڑے گروہوں کی شکل میں رہتا ہے۔ اس کی معاشرت کا انداز دوسرے کیڑوں کے طرز زندگی سے بالکل مختلف اور منفرد ہوتا ہے۔ مکھی ایک کالونی بنا کر رہتی ہے۔ جو کارکنوں اور ان کے بال بچوں (Larvae) پر مشتمل ایک انجمن امداد باہمی (کوآپریٹو سوسائٹی) ہوتی ہے جس میں ہر ایک فرد کو اس کی صلاحیت اور طاقت کے مطابق کام سونپا جاتا ہے اور ہر کوئی اپنے حصے کے کام میں جُتا ہوا ہوتا ہے۔ کیا مجال ہے کہ کوئی کام چوری کرے یا اپنے فریضے میں تساہل برتے۔

بے مثال صناعی

زیر بحث قرآنی آیت میں کہا گیا ہے کہ مکھی کے چھتے کی تعمیر میں فطرت کا خدائی قانون بھرپور طریقے سے رُوبہ عمل ہوتا ہے۔ لندن کا ایک ماہر تعمیرات کہتا ہے:

''مکھی اپنے چھتے کی تعمیر میں میٹریل کے بہ کفایت استعمال کی صلاحیت کا شاندار مظاہرہ کرتی ہے اور کم سے کم مواد کو زیادہ سے زیادہ فائدے کے لیے استعمال کرتی ہے۔''

ایک ماہر انجینئر اپنے کام کے لیے چار قسم کی کفایت شعاریاں (Economies) کرتا ہے (1) جگہ کی کفایت (2) وقت کی کفایت (3) مواد کی کفایت اور (4) محنت کی کفایت۔ ایک چھوٹے سے کیڑے کا اپنے چھتے کی تعمیر میں اتنی زبردست معاشی عقلمندی کا مظاہرہ کرنا حیرت

انگیز واقعہ ہے۔ جن لوگوں کو چھتے کو قریب سے دیکھنے کا کبھی موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے خانے (CELLS) ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص ترتیب یا ''تشاکل'' سے ملے ہوتے ہیں' اور ہر خانہ ایک مسدّس (Hexagon) یعنی چھ پہلوؤں والا ہوتا ہے۔

اشکال تین قسم کی ہوتی ہیں جو بہت آسانی سے بنالی جاتی ہے۔ (i) مستطیل (ii) مربع اور (iii) مدوّر یعنی گول۔ جن میں سے مؤخرالذکر مضبوط ترین ظرف (Receptacle) ہوتی ہے۔

مکھی اپنے خانوں کو مسدّس یعنی چھ پہلوؤں والے کیوں بناتی ہے جو کہ مستطیل مربع اور مدوّر کی بہ نسبت مشکل سے بنتے ہیں' یہ ایک بڑی غور طلب بات ہے؟ اس کا سبب بڑا معقول اور منطقی ہے اور کفایت شعارانہ بھی ہے۔

(الف) مسدّس' مضبوط ترین ساخت کے قریب تر ہوتی ہے (ب) اگر یہ خانے مدوّر ہوتے تو ان کے بارڈر کے گرد جگہ ضائع ہو جاتی۔ کیونکہ جب انہیں ایک کے ساتھ ایک کر کے رکھا جاتا تو ان کے درمیان ایک ''محدّب خلا'' (Convex Cavity) رہ جاتا۔ (ج) اور اگر یہ خانے مربع کی شکل میں ہوتے تو مربع کے ہر زاویئے پر اندر کی طرف ایک گہراؤ یا کھوکھلا پن پیدا ہو سکتا تھا۔ (د) لہٰذا اس کے بچوں (Larvae) کے جسم قدرے ''بیلن نما'' (cylindrical) شکل اختیار کر جاتے۔ چنانچہ دائرہ اور مربع کی شکل کے خانے بنانے میں جگہ' وقت' مواد اور محنت' چاروں کے ضیاع کا امکان تھا۔

مکھی اپنے چھتے کو مسدّس یا شش پہلو' اس لیے بناتی ہے کہ چھ (شش) ایک معین عدد (Definite number) ہے جو ''بارہ'' کا نصف اور ''تین'' کا دگنا ہے۔ یہ ''پانچ'' سے زیادہ اور ''سات'' سے کم ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایک خانے کو پانچ پہلوؤں والا اور دوسرے کو ''چار'' یا ''سات'' یا ''آٹھ'' پہلوؤں والا کیوں نہیں بنا دیتی؟ جیسا کہ ایک غیر تربیت یافتہ' غائب دماغ اور بھلکڑ انسان اکثر کر دیتے ہیں۔

اس کا جواب خالصتاً منطقی ہے۔ وہ اپنا کام اپنی جبلت کے تحت یا خدائی الہام کے مطابق انجام دیتی ہے جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے: فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۔ (اور

اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ...... سورۃ النحل آیت 69) وہ اس کے مطابق عاجزی وانکسار کے ساتھ چلی جا رہی ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ حیوانات کی دیگر انواع کی طرح یہ بھی گنتی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور شماریاتی نظاموں سے بالکل بے خبر ہے' جمع تفریق اور ضرب وتقسیم سے بھی ناآشنا ہے اور وہ تین اور چار میں بھی فرق نہیں کر سکتی' اس کے باوجود ہم شہد کے چھتے کی تعمیر میں اعلیٰ ریاضی کے اطلاق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس میں جگہ کو ضائع ہونے سے بچانے' محنت' مادے اور وقت کے بکفایت استعمال کا بھی پورا پورا اہتمام دکھائی دیتا ہے' مسدّس خانوں کو اتنے کمال طریقے سے جوڑا گیا ہے کہ دیواریں کہیں بھی دوہری (Two fold) نہیں ہونے پاتیں۔ صرف اکہری دیوار دو کمروں کو علیحدہ کرتی ہے۔ وہ دو منزلہ چھتے کو افقی طور پر یعنی افق کی سطح کے متوازی (Horizontally) تعمیر کرتی ہے اور اس کا گھر اوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے جبکہ ہمارا گھر نیچے سے اوپر کو جاتا ہے' وہ اکہری چھت کو ہی دو منزلوں کے درمیان حد فاصل بناتی ہے' جو ایک حیرت انگیز ہنرمندی ہے۔

یونانی اور رومن شاعروں کا تمام رزمیہ کلام مسدّس ہے جس پر وہ فخر کرتے تھے شہد کی مکھی اپنے خانوں کو ''شش پہلو'' (مسدس) بناتی ہے اور وہ اس پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

کسی بھی مکان کی تعمیر میں استعمال ہونے والا مواد بہت اہم آئٹم ہوتا ہے۔ کسی کارخانے کے سائن بورڈ پر ''سو سال سے'' ''قائم'' لکھا ہو تو یہ اعلان اس امر کی ضمانت ہوتا ہے کہ یہاں کی مصنوعات' درجہ کمال حاصل کر چکی ہیں' ان میں کسی ردو بدل کی ضرورت نہیں۔ اگر مکھی اپنے چھتے پر کوئی سائن بورڈ لگا سکتی تو وہ یہ ہوتا کہ ''لاکھوں سال سے قائم''۔ یعنی اس کی تعمیر میں ایسا کامل مواد استعمال ہوا ہے کہ جس کا کوئی متبادل نہیں۔

کسی مکان کی تعمیر کے لیے مواد (میٹریل) عموماً کہیں اور سے لایا جاتا ہے اور اس کا انتخاب مکان کے معیار کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ پرندے اپنے گھونسلے بنانے کے لیے گھاس' پتے اور تنکے استعمال کرتے ہیں۔ انسان اپنے مکان کی تعمیر کے لیے زمانہ قدیم سے مختلف اقسام کا مواد استعمال کرتا آرہا ہے۔ لیکن شہد کی مکھی اپنے زمانہ پیدائش ہی سے اپنے گھر کی تعمیر میں مصروف ہوگئی جب انسان کو گھر کی تعمیر کا کوئی احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ موم سے

اپنا چھتہ تعمیر کرتی ہے جسے وہ اپنے پیٹ کے اندر ہی پیدا کرتی ہے جو آتشگیر مواد ہے۔ یہ مواد اپنی ساخت میں اتنا ہلکا' اتنا ملائم اتنا معتدل' موسم کی زد سے اتنا محفوظ اور اتنا مناسب وموزوں ثابت ہوا ہے کہ لاکھوں سال سے اس کے کسی متبادل کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

یہ شہد کا جوہر (Essence) ہوتا ہے جو انتہائی خالص اور بے داغ چیز ہوتا ہے' وہ اسے موم میں کس طرح تبدیل کرتی ہے؟ یہ ایک سربستہ راز ہے جس پر پڑا ہوا پردہ آج تک نہیں ہٹایا جاسکا۔ اس چھوٹے سے کیڑے کو ایسی صاف ستھری اور بے داغ چیز پیدا کرنے کا طریقہ کس نے سکھایا' جس کی مدد سے وہ اپنا چھتہ بناتی ہے۔ انسان اپنے وسیع ذخیرۂ معلومات اور سائنسی استعداد کا مالک ہونے کے باوجود محض لعاب کی مدد سے اپنے لیے ایسی رائش گاہ نہیں بنا سکتا۔

چھتے اوپر سے نیچے کی جانب بنائے جاتے ہیں اور ایک ''خاص نمونے'' کے حامل ہوتے ہیں' جبکہ انسان کا گھر نیچے سے اوپر کو جاتا ہے۔ مہذب ممالک میں ہاؤسنگ پراجیکٹ چند قواعد وضوابط کے تابع ہوتے ہیں جن کے نفاذ کا سختی سے اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان قواعد میں یہ باتیں شامل ہوتی ہیں کہ کتنے رقبے میں کتنے فیصد جگہ تعمیر کی جائے گی' ہر کمرے کی کتنی لمبائی' چوڑائی اور بلندی رکھی جائے گی' دیواریں چھت کے وزن کے تناسب سے کتنی موٹی ہوں گی روشنی اور تازہ ہوا کے لیے کتنے روشندان ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس سارے اہتمام کے مقابلے میں مکھی کا گھر ایک معلق شہر کی مانند ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد یا نیؤ زمین پر نہیں رکھی جاتی بلکہ یہ درخت کے تنے یا چٹان سے لٹک رہا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ اسے بھاری نہیں ہونا چاہیے جس کے لیے زیادہ عقل و دانش درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ مکھی قانونِ تجاذب (LAW OF GRAVITATION) کو ملحوظ رکھ کر اسے اتنے بوجھ تک محدود رکھتی ہے کہ یہ الٹا لٹکا ہوا ''شہر'' زمین پر نہ جا گرے۔

مکھی کو ہاؤسنگ کے لیے جو مواد دستیاب ہے وہ صرف اور صرف شہد ہے لیکن اس پر یہ انکشاف کیسے ہوا؟ اور اسے یہ بات کس نے سکھائی کہ اسے اپنے مکان کی تعمیر کے لیے صرف اسی واحد مواد پر انحصار کرنا ہے؟۔

شہد ایک میٹھا' گاڑھا اور بھاری مائع ہے' عظیم فلسفی ارسطو نے ہمیں بتایا تھا کہ دنیا

میں دو چیزیں ہیں' ایک ہے "وزن" (Weight) اور دوسری ہے "بے وزنی" (Lightness) لیکن شہد کی مکھی' ارسطو سے ہزاروں سال پہلے' اپنی جبلت یا الہام کے ذریعے جانتی تھی کہ یہ "بیان" درست نہیں ہے۔ تمام مادی چیزیں "وزن" یا کششِ ثقل (Gravity) رکھتی ہیں۔ کاغذ کا پُرزہ یا "پَر" (Feather) اپنی بے وزنی کے باعث گرنے سے نہیں بچا رہتا' بلکہ یہ "ہوا" کی کارکردگی ہے کہ اسے گرنے سے روکتی رہتی ہے۔

مکھی کی زندگی کا بڑا کام شہد کو ذخیرہ کرنا ہوتا ہے۔ اسے "خانوں" (Cells) کے بغیر ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا اور خانوں کا ہلکا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ یہ مکھی کے لیے ایک مسئلہ تھا جسے اس نے حل کر لیا۔

جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ شہد گاڑھا اور بھاری ہوتا ہے۔ یہ اپنے وزن سے اس وقت تک جان نہیں چھڑا سکتا جب تک علم کیمیا کا کوئی ماہر ترین عالم' اس پر محنت نہ کرے اور اس مسئلے کا کوئی حل تلاش نہ کرے۔

لفظ "کیمیا" (کیمسٹری) علم عناصر اور ان کے قوانینِ ادغام (Laws of combination) کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اگر چیزوں کو آپس میں ملانے کے بعد ان میں کوئی تبدیلی نہ آتی تو پوری دنیا ساکن اور ساکت ہو کر رہ جاتی۔ چنانچہ مرکبات بنانے یا اس کے عناصرِ ترکیب کو ان کی اصلی حالت میں واپس لے جانے کے لیے مادے کا گہرا مطالعہ درکار ہوتا ہے۔ ایک مادی چیز جب پھیلتی ہے تو اس کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ اس علم سے مکھی خوب آگاہ ہے' وہ اپنے داخلی احساسات کے تحت جانتی ہے کہ شہد کا وزن کیسے کم کیا جائے اور اس کے عناصر ترکیب کو کس طرح ایک دوسرے سے جدا (Decompose) کیا جائے۔ ہم اس طریق کار (پروسیجر) سے واقف نہیں ہیں۔ لیکن مکھی رولز آف انجینئرنگ کے تحت جانتی ہے کہ اس کا گھر ہلکا پھلکا ہونا چاہئے کیونکہ اسے معلق رہنا ہے۔

یہ قوت گویائی سے محروم مکھی' سائنس آف کیمسٹری سے تو آگاہ نہیں ہے لیکن اپنی جبلت یا الہام کی وجہ سے جانتی ہے کہ شہد ایک مادۂ مرکب (کمپاؤنڈ) ہے جو مختلف اجزا کے آپس میں ملنے سے وجود میں آتا ہے' یہ اجزا یکساں تناسب سے یکجا نہیں ہوئے۔ اس میں درجنوں اجزا (Ingredients) ہیں جو مختلف تناسب سے آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ (اس کی

تفصیل آگے ''مکھی کے لیے چوتھا الہام'' کے عنوان سے دی جائے گی)۔ اگر کوئی کمپاؤنڈر یا ڈسپنسر ذہنی طور پر حاضر نہ ہو تو اس کا امکان رہتا ہے کہ اس کا تیار کردہ مرکب یا آمیزہ خطرناک بن جائے۔ پھولوں کے رس کو شہد میں تبدیل کرنا ''علم مرکبات'' (Art of Composition) کہلاتا ہے اور شہد کو موم میں تبدیل کرنا ایک قسم کا ''علم تحلیل'' (Art of Decomposition) ہے۔ مرکبات کو وجود میں لانا اور ان کے اجزا کو اصل حالت میں واپس لے جانا' علم کیمیا کے دو قوانین ہیں۔ ''مرکب'' تیار کرنے کے لیے ایک خاص درجے کی حرارت کی ضرورت پڑتی ہے اور اصل حالت پر لے جانے کے لیے بھی اتنے ہی درجے کی حرارت درکار ہوتی ہے۔ یہاں ذرا رکیے اور ذہن لڑائیے کہ مکھی کو یہ مرکب تیار کرنے اور اسے دوبارہ اجزا میں تبدیل کرنے کا علم کس نے سکھایا؟ قرآن جواب دیتا ہے کہ...... ''شہد کی مکھی کو خدا نے الہام کیا''

اب مزید آگے چلیے: موم کو لے لیجئے' یہ تہوں (Scales) کی صورت میں مکھی کے پیٹ کی نچلی سطح پر موجود غدودوں سے برآمد ہوتی ہے' اسے نکالتے وقت جب وہ اسے چباتی ہے تو اس میں اپنا لعاب بھی شامل کر دیتی ہے۔ اس کا نقطۂ پگھلاؤ 60 سے 66 درجہ سینٹی گریڈ (143-151F) تک ہوتا ہے اور اس کی کثافتِ اضافی (specific Gravity) عموماً 0.958 سے لے کر 0.967 تک ہوتی ہے۔ جب اس کا درجہ حرارت 86 فارن ہائیٹ تک پہنچا دیا جائے تو اسے ہاتھ سے کوئی بھی شکل دی جا سکتی ہے۔ ان تشریحات کے لیے کیمسٹری کے اچھے خاصے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ان پڑھ انسان حرارت کے خصوصی درجوں' وزن کے تناسب' کوالٹی' نقطۂ پگھلاؤ اور کثافتِ اضافی سے بالکل نابلد ہوتا ہے۔ لیکن مکھی کے کاموں میں یہ ساری سائنسی اصطلاحات بروئے کار آتی ہیں۔

عقل انسانی کے لیے چیلنج

موم ایک مختلف الاجزا کیمیائی مادہ ہے جو اگرچہ چربیوں سے متعلقہ ہے مگر ان کی بہ نسبت سخت اور ان سے زیادہ پھوٹک (Brittle) ہوتا ہے' یہ شہد کا محافظ اور دافع رطوبت ہوتا ہے۔ یہ چونکہ مانع حرارت ہوتا ہے اس لیے ہوا کی آکسیجن اسے بہت کم متاثر کرتی ہے۔ اس ذہین کیمیا دان نے اپنی مقدس پناہ گاہ کے لیے یہ بے مثل مادہ ایسے زمانے میں ایجاد کیا جب

انسان اپنے پنگھوڑے میں لیٹا' انگوٹھا چوس رہا تھا۔ سائنسدان محو حیرت ہیں کہ مکھی نے شہد کو موم میں تبدیل کرنے کی تیکنیک کہاں سے سیکھی ہے؟ مشاہدے میں آیا ہے کہ نوجوان مکھیاں اپنے گھر کی چھت سے لٹک کر ایک جھنڈ سا بنا لیتی ہیں اور کئی گھنٹوں اور کئی دنوں تک بھی لٹکی رہتی ہیں' اور کسی پُر اسرار طریقے سے اپنے جسموں کی حرارت کو بڑھا لیتی ہیں' جس سے کہ شہد موم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

شہد کی مکھی خدا کی تائید و نصرت سے عقل انسانی کو چیلنج کرتی ہے کہ وہ پھولوں کے رس سے ایسی ٹھوس چربیلی موم تیار کر دکھائے جو دوسری چربیوں سے مختلف ہو ان سے زیادہ سخت ہو' ان سے اونچا درجہ پگھلاؤ رکھتی ہو' پانی میں حل نہ ہوتی ہو' اتنی ہلکی ہو کہ اس کی کثافت اضافی 0.967 ہو' ہلکی سی روشنی دیتی ہو جس سے کہ بصارت کو کوئی نقصان نہ پہنچتا ہو' دوا کے طور پر قابل استعمال ہو' معلق گھر بنانے کے لیے موزوں ہو اور ''دیوتاؤں'' کے لیے امرت کا ذخیرہ کر سکتی ہو۔ یقیناً انسان اس سے یہ مقابلہ نہیں جیت سکتا۔

یہ توضیح اس امر کے ثبوت کے لیے پیش کی گئی ہے کہ وحیٔ الٰہی ایک ایسی چیز کو وجود میں لا سکتی ہے جو انسانی کاوشوں سے ممکن نہیں ہو سکتی۔ انسان اگرچہ صاحبِ عقل و دانش ہے اور مکھی ایک گونگا کیڑا ہے مگر وہ اپنے چھوٹے سے شکم میں ایک مختصر ترین لیبارٹری جمائے بیٹھی ہے جس میں وہ ایسا کارنامہ انجام دیتی ہے کہ سائنسدان اپنی اجتماعی ہنر مندی کو بروئے کار لا کر بھی اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ قرآن اس پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے۔ ''وہ ہر قسم کے پھولوں کا رس چوستی ہے اور اس سے ایک بے مثل مشروب یا شہد تیار کرتی ہے' جس میں بنی نوع انسان کے لیے شفا رکھ دی گئی ہے''۔

اگر ہم دنیا بھر کے ماہرین علم کیمیا اور اعلیٰ درجے کے سائنسدانوں کو اکٹھا کر کے انہیں پھولوں سے ایسا مشروب کشید کرنے کی دعوت دیں تو وہ یقیناً ایسا نہ کر سکنے کا اعتراف کر لیں گے۔

روحانی دنیا کے قوانین

مادی دنیا کی اس مثال کو قرآن مجید نے بھی روحانی دنیا میں خدا کے قوانین کی

فرمانروائی ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ نبیؐ نے وحیٔ الٰہی کے ذریعہ وہ سب کچھ حاصل کرلیا ہے جو تمام مذاہب میں اچھی باتوں کی صورت میں پایا جاتا تھا' اور اسے قرآن میں یکجا کر کے پیش کر دیا ہے' اس لیے اس جیسا کوئی اور کلام نہیں لایا جاسکتا۔ یہ بات خود قرآن نے کہی ہے:۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اُتاری ہے' یہ ہماری ہے یا نہیں' تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنالاؤ' اپنے سارے ہمنواؤں کو بلالو' ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو' اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ.......سورۃ البقرہ آیت 23)

اس طرح ابتدائی دور کی ایک ہی وحی میں جملہ عالم انسانیت پر اس کی بے بسی اور نااہلی واضح کر دی گئی کہ وہ خواہ کچھ بھی کر لے قرآن جیسی کتاب نہیں لاسکتی۔ یہ صرف قرآن کے اسلوب اور اس کے الفاظ کی بندش کے حُسن کا مسئلہ نہیں' یہ اس کی جامعیت اور ندرتِ فکر کا معاملہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت وہ حیرت انگیز قلبِ ماہیت ہے جو صرف اس کے ذریعہ ممکن ہوئی ہے اور جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ہے' چنانچہ دنیا کی کوئی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ اور جس ہستی پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے ''وہ تمام انبیاء اور مذہبی شخصیات میں سے کامیاب ترین انسان تھے''(دیکھئے: انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا' گیارھواں ایڈیشن' آرٹیکل ''قرآن'')۔ اس کتاب کے ذریعہ انہیں جو احکامات ملے ان کی بدولت صدیوں کی بت پرستی اور جرم وعصیان کے تناور درختوں کی جڑیں تک اکھڑ گئیں' پورا جزیرۃ العرب برائیوں سے پاک ہوگیا' اور دنیا کی جاہل ترین قوم علم اور حکمت کی مشعل بردار بن گئی اور سیاسی طور پر پسماندہ ترین لوگ دنیا کی عظیم ترین سلطنتیں قائم کرنے کے قابل ہو گئے' علاوہ ازیں قرآن کا ہر لفظ خدا کی عظمت وشان کو ایسے انداز میں پیش کرتا ہے جو صرف اس کا خاصہ ہے' کوئی دوسری کتاب ایسا نہیں کرسکتی۔ چنانچہ اس کا دیا ہوا چیلنج آج بھی بدستور موجود ہے۔ اس کا آج تک کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔

جیسا کہ مکھی اپنے شہد کی حفاظت کے لیے اپنے چھتے کے ہر خانے کو ''شش'' پہلو''

بناتی ہے' اسی طرح قرآن کی ہر سورۃ شش پہلو ہے' وہ جن نقاط اور پہلوؤں پر زور دیتی ہے وہ یہ ہیں:

(1) خدا پر ایمان: وہ ہستی جو تمام صفات کاملہ کی تنہا مالک ہے۔
(2) انسان کو تمام مخلوقات سے اعلیٰ و ارفع تسلیم کرنے پر ایمان: خواہ وہ زمین پر ہیں یا آسمانوں پر رہتے ہیں اور اس پر بھی ایمان کہ تمام انسان برابر ہیں۔
(3) انسانیت کی بہبود کے لیے ایثار و قربانی کا درس
(4) دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ انصاف۔ ہر قوم کی ہدایت و رہنمائی کے لیے پیغمبر بھیجے گئے اور ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔
(5) ادائیگی نماز
(6) خواہشات اور جذبات کو قابو میں رکھنے کی تلقین

چھتے کے لیے جگہ کا انتخاب:

انسان اپنا مکان بنانے کے لیے' خواہ وہ شہر میں بنانا چاہتا ہو' گاؤں میں یا کسی میدان میں' پہلے جگہ (Site) کا انتخاب کرتا ہے اور اس کے محل وقوع میں جن باتوں کو ملحوظ رکھتا ہے ان میں ہوا' دھوپ' صحت و صفائی' اور پُرسکون حالات (جہاں شور و شغب نہ ہو) شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح مکھی بھی تاریک' دھوئیں والی' بدبودار اور پُرشور جگہوں پر چھتہ تعمیر نہیں کرتی۔ اور ایسی جگہیں منتخب کرتی ہے جہاں صحت و صفائی کے لیے حالات سازگار ہوں' خوراک کی سپلائی وافر ہو' اردگرد خاموشی ہو اور جہاں ہوا اتنی شدید نہ ہو کہ اس کے چھتے کو خطرے میں ڈال دے۔

متعدد جانور اپنے گھر بنانے کے لیے بڑی محنت اور ہنرمندی بروئے کار لاتے ہیں اور انہیں بجا طور پر ''گھروں پر فخر کرنے والے'' (House-proud) جانور کہا جا سکتا ہے۔ شہد کی مکھی بھی اسی زمرے میں آتی ہے کیونکہ یہ اس معاملے میں ذوقِ تعمیر کا زبردست مظاہرہ کرتی ہے۔

ائیر کنڈیشنڈ سٹی:

یہ بات غور طلب ہے کہ شہد کی مکھی کو درختوں پہاڑوں اور بلند و بالا چٹانوں پر چھتے

بنانے کا الہام کیوں کیا گیا ہے؟ اس لیے کہ اس کا چھتہ' محض ایک گھونسلہ نہیں ہوتا' یہ موم سے بنا ہوا ایک شہر یا ایک نو آبادی (کالونی) ہوتا ہے۔ اسے کافی مقدار میں تازہ ہوا اور دھوپ درکار ہوتی ہے۔ اس لیے ربّ کریم نے اسے ایسی جگہ گھر بنانے کا حکم دیا جہاں صاف ہوا اور سورج کی کرنیں آسانی سے پہنچ سکیں۔

متعدد ممالک میں کئی ایسے مکانات ہوتے ہیں جن میں کھڑکیاں یا تو بالکل ہی نہیں ہوتیں اور اگر ہوں تو ایسی بنی ہوئی ہوتی ہیں کہ انہیں کھولا نہیں جا سکتا۔ ایسے مکانوں میں رہنا بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ نمدار گھٹن زدہ اور تاریک گھروں میں پرورش پانے والے مائیکروب (جراثیم) انسانوں کے سخت دشمن ہوتے ہیں' ان کے باعث ہونے والی اموات' سال بھر میں بھیڑیوں' شیروں اور سانپوں کی وجہ سے ہونے والی ہلاکتوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ لیکن مکھیوں کے اس ''شہر'' میں جو کہ ایک گنجان آبادی ہے تازہ ہوا اور سورج کی کرنیں اتنی وافر ہوتی ہیں کہ خطرناک جراثیم ان کی تاب نہیں لا سکتے۔ ''شہد کے محل'' میں جرثومہ ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

بڑی آبادی کے اس ''شہر'' میں چونکہ شہد کا ایک بڑا ذخیرہ ہوتا ہے' اس لیے اس میں حرارت' نمی اور ہوا کو قابو (کنٹرول) میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ کنٹرول کا یہ نظام (جسے ہم وسیع ترین مفہوم میں ''ائیر کنڈیشننگ سسٹم'' کہہ سکتے ہیں) ہوا کی ہمہ قسم فزیکل اور کیمیکل مقداروں کو ایک خاص مقدار کے مطابق رکھتا ہے۔ اس سسٹم میں دو باتوں کا خصوصی طور پر اہتمام ہوتا ہے: (1) چھتے میں شہد سازی کے شعبے کے لیے مناسب ماحول ہونا اور (2) مکھوں کی ''ملکہ'' اور ''کارکنوں'' کے لیے آرام اور صحت کے تمام تقاضے پورے ہونا۔ چنانچہ چھتے کو بدبودار گیسوں اور نمی سے پاک کرنے کا بھی خصوصی انتظام موجود ہوتا ہے تاکہ کارکنوں کی صحت کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔

گھر کے ائیر کنڈیشنر کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے مکھیاں اپنے پروں کو مسلسل حرکت میں رکھتی ہیں اس طرح درجۂ حرارت بجلی کی کرنٹ کے بغیر بھی 86 درجہ سینٹی گریڈ سے کبھی نہیں بڑھتا۔ انہیں ٹمپریچر کو کنٹرول میں رکھنے اور ہوا کو صاف رکھنے کا یہ طریقہ کس نے سکھایا؟ ذرا غور تو کیجیے۔

ذہنی صلاحیتوں سے مالا مال انسان نے ہر قسم کے کام کے لیے آلات ایجاد کر رکھے ہیں لیکن جانوروں کی دنیا میں جتنے کمالات دیکھنے میں آتے ہیں ان میں ایک آلہ بھی استعمال نہیں ہوتا۔ اس لیے "موم کا محل" بغیر آلات کے وجود میں آجاتا ہے۔ حتیٰ کہ اسے "ہاتھ سے بالکل ہی نہیں چھوا جاتا"۔

یہ عمدہ اور خود کفیل شہر 10,000 سے لے کر 50,000 "شہریوں" مشتمل ہوتا ہے جن کے شش پہلو شکل کے گھر قطاروں میں سجے ہوتے ہیں اور عام گزرگاہ کے لیے گلیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود ان کے بنانے کے لیے کسی قسم کے آلات استعمال نہیں ہوتے۔ ہم جب کاغذ پر ہزاروں کی تعداد میں "شش پہلو" خانے متوازی لائنوں میں بناتے ہیں تو ہمیں کتنی ہی دیر تک پنسل اپنے منہ میں پکڑنا پڑتی ہے لیکن مکھی اپنے منہ میں مسالہ پکڑے کتنی سیدھی لائینیں کھینچتی رہتی ہے' کیا ہم اس کے اس کٹھن کام کا اندازہ کر سکتے ہیں؟

مکھی کا جسم متعدد اعضا پر مشتمل ہے اور اس کا ہر عضو اس کو درپیش کام کی مناسبت سے بنا ہوا ہے' اس کی آنکھیں ہیں' اس کے محاسے (Antennae) ہیں' منہ ہے' پر ہیں اور ڈنک ہے' وہ ان سب کو اپنی خوراک اکٹھی کرنے' چھتے کی نگرانی کرنے اور دشمنوں سے خود کو محفوظ کرنے کے لیے استعمال میں لاتی ہے۔

مکھی کے لیے دوسرا الہام یہ تھا: "پھر ہر قسم کا پھل کھاؤ" (ثُمَّ كُلِي مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ......اور ہر قسم کے میوے کھا......سورۃ النحل آیت 69)

شہد کی مکھی کو پھولوں اور دھوپ کے ساتھ خصوصی محبت ہے۔ موسم گرما میں جب پھول کثیر تعداد میں کھلتے ہیں تو وہ اپنی اس خصوصی مہمان کے لیے اپنے دروازے کھلے چھوڑ دیتے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنے دروازے پر مہمان کی آمد کا انتظار کرتے ہیں۔ ہر قسم کا پھول اپنے عاشقوں کا وفادار ہوتا ہے اور مکھیوں کو آکر بوسہ بازی کی ترغیب دیتا ہے' پھر عشق و محبت کی یہ پینگیں دن بھر ہلارے کھاتی رہتی ہیں۔ مکھیاں آدابِ محبت سے پوری طرح باخبر ہوتی ہیں' وہ اپنے دلرُبا میزبانوں کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچنے دیتیں (ان کا یہ رویّہ انسانوں اور بعض پرندوں کے بالکل برعکس ہے' جو پسند آنے پر پھول کو ٹہنی سے توڑ دیتا

ہے اور اکتا کر مسلسل دیتا ہے)۔شہد کی مکھیاں پھولوں کے ساتھ لپٹ لپٹ جاتی ہیں اور ان کے بوسے لیتے ہوئے دعائیں دیتی رہتی ہیں ''اللہ کرے تم پھلو پھولو' اور اپنی خوشبوؤں سے چمن کو لہکاتے رہو'۔

یہ قرآن اور دیگر الہامی کتابوں کی کتنی حیرت انگیز مماثلت ہے۔ قرآن مذہبی یا روحانی پھولوں کی کیاری میں لگے ہوئے مقدس پھولوں میں سے کسی کو نہ مسخ کرتا ہے' نہ نقصان پہنچاتا ہے اور نہ مسترد کرتا ہے بلکہ ان کی تائید و توثیق اور تصدیق کرتا ہے۔ یہ صرف اور صرف قرآن کے ماننے والے ہیں جو سب سابق پیغمبروں اور ان پر اتارے گئے مقدس صحیفوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

قرآنی وحی نے تمام لہلہاتے ہوئے پھولوں کا امرت پیا' اسے مصفیٰ کیا اور ان کی خامیوں کو دور کیا' اور پھر اسے اپنا اساسی سرمایہ بنا کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا جیسا کہ یہ اس کا اپنا روح اور جسم ہو۔ جب ایک مسلمان محبت و عقیدت کے ساتھ قرآن کو تھامتا ہے تو وہ اس سے پہلے اتاری گئی آسمانی کتابوں کو بھی محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

مسلمانوں نے مسیحی مشنریوں کے اس پروپیگنڈے کا ہمیشہ خیر مقدم کیا ہے کہ قرآن نے بائبل' ویدوں' زنداویستا اور مصری کتاب رفتگاں ''Book of the Deads'' (دیکھیے سر ولیم میور کی کتاب ''Sources of Islam'') کی ہوبہو نقل پیش کر دی ہے۔ اور انہیں ہندو پنڈتوں کے اس دعوے پر بھی کوئی تشویش نہیں کہ ''قرآن وید منتروں کی تصدیق کرتا ہے۔'' قرآن (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے) ایک عظیم ذخیرۂ آب کی مانند تمام مذہبی تصانیف کے جوہروں کا مرقع ہے' وہ سب اپنے اپنے وقت کے صحیح صحیفے اور گلدستے تھے' قرآن نے سب کے مفاہیم کو یکجا کر دیا ہے۔ اس میں سب کی خوبیاں اور سب کے رنگ اور سب کی کرنیں منعکس ہو رہی ہیں۔

تاہم طریق کار میں ایک فرق پایا جاتا ہے۔ جیسے کہ پھولوں میں بنا بنایا شہد موجود نہیں ہوتا' اسے بنانے کا ایک خاص طریق کار ہوتا ہے یعنی مکھی سب پھولوں سے ایک خاص تناسب سے رس لیتی ہے اور پھر اپنی جبلی قوتِ محرکہ سے اسے میٹھے گاڑھے مائع میں تبدیل کرتی ہے جو اپنے اندر شفا کی خاصیت رکھتا ہے اور جو ''دیوتاؤں'' کی غذا کہلاتا ہے اسے

عرف عام میں شہد خالص کہا جاتا ہے۔

اسی طرح قرآن انبیائے اسرائیل یا مذاہب کے بانیوں کے بیانات اور احوال کی تصدیق کرتا ہے' آدمؑ' نوحؑ (یا ہندوؤں کے منوں) ابراہیمؑ (آریاؤں کے برہما) اسحاقؑ' یعقوبؑ' یوسفؑ اور ان کے بعد آنے والوں مثلاً ذوالکفل (کپل وستو کا گوتم بودھ) لقمان (یونانیوں کا ایسپ) کا احترام کرتا ہے۔ یہ ان کی زندگیوں کے اہم واقعات بیان کرتا ہے' لیکن ان کی طرف منسوب ان غلطیوں' خامیوں یا گناہوں کی توثیق بالکل نہیں کرتا جو بعد کے ادوار میں بائبل میں داخل کر دی گئی تھیں۔

قرآن کے مطابق آدمؑ نے کوئی قانون شکنی نہیں کی کیونکہ اس وقت کوئی قانون موجود نہیں تھا۔ اور نہ اس کے بیٹوں نے اس قانون شکنی کا گناہ بطور ورثہ پایا۔ حضرت نوحؑ نے ہرگز وہ حرکتیں نہیں کیں جو انجیل کی کتاب ''پیدائش'' کے باب 9 کی آیات 20 تا 25 میں ان سے منسوب کی گئی ہیں۔ ابراہیمؑ بت پرست نہیں تھے' اور انہوں نے وہ جھوٹ نہیں بولا جو کتاب پیدائش کے باب 12 میں ان سے منسوب کیا گیا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے اپنے بھائی' والد اور بہنوئی سے کوئی بدسلوکی نہیں کی جو کتاب ''پیدائش'' کے باب 25 آیت 33 اور باب 31 میں ان سے منسوب کی گئی ہے۔ قرآن نے حضرت لوطؑ پر لگائے گئے اس الزام کی تصدیق نہیں کی جو کتاب ''پیدائش'' کے باب 19' آیات 31 تا 36 میں ان پر لگایا گیا ہے اور نہ ہی حضرت یوسفؑ نے اپنے باپ کو اپنے بھائیوں کے بارے میں بدخبری سنائی۔ حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کے درمیان دشمنی پیدا نہیں کی تھی۔ اسی طرح قرآن زور دے کر یہ بات کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے خدا کا بیٹا ہونے کا ہرگز دعویٰ نہیں کیا تھا۔ قرآن مجید نے اس قسم کی سینکڑوں غلط بیانیوں اور بے ہودگیوں کو سختی کے ساتھ ردّ کیا ہے اور انہیں مقدس انجیل میں تحریف قرار دیا ہے۔ اور انجیل میں تحریف ایک مسلّمہ امر ہے۔

اس طرح مکھی کے لیے الہام اور وحیٔ قرآنی کے مابین ایک گہری مماثلت ہے۔ جیسے مکھی ہر قسم کے پھولوں سے حاصل کردہ رس میں سے نمی اور آمیزشوں کو اُڑا کر ان کے اصل جوہر کو شہد بنا دیتی ہے' اسی طرح وحیٔ قرآنی نے تمام پیغمبروں کی تعلیمات کو ایک خلاصے کی شکل میں نبی آخر الزمان پر بصورتِ ''قرآن'' نازل کر دیا۔ جیسا کہ پوری انسانیت اپنے جملہ سائنسی

علوم سے لیس ہونے کے باوجود پھولوں کے رس کو شہد خالص میں تبدیل نہیں کر سکتی' اس طرح پورا عالم انسانیت اس قرآنی چیلنج کا جواب نہیں دے سکتا ...... "فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ" ......(تو لاؤ اس کی مانند کوئی ایک ہی سورۃ)

جس طرح شہد کی مکھی کو اپنے رب کے راستوں پر عاجزی سے چلتے رہنے کی تلقین کی گئی ہے' اسی طرح ایک سچے مسلمان کی صحیح ترین تعریف (Definition) یہ بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر عاجزی سے چلتا رہتا ہے' یہی صراط مستقیم ہے اور اس کے سوا کوئی راہ نجات نہیں ہے۔ اگر شہد کی مکھی کی ساری زندگی اور دیگر تمام جانداروں اور بے جان اشیا کی ساری زندگی' قرآنی الفاظ میں ......وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ طَوْعًا كَرهاً وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ۔ (اور جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی سے یا زبردستی سے خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہیں اور ان کے سائے بھی صبح و شام ایسا ہی کرتے ہیں ......سورۃ الرعد آیت 15)' سجدہ کرتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح شہد کی مکھی خدا کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہتی ہے اور ذرہ بھر بھی غیر اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتی تو خدا انسانوں سمیت پوری مخلوق سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ صرف اسی کے سامنے سرِ اطاعت خم کریں ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے ......اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ۔ (کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے سامنے سربسجود ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں' سورج اور چاند اور تارے' اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان ......سورۃ الحج آیت 18) یہ آیات بتاتی ہیں کہ اسلام یا خدائی قانون کے سامنے سر جھکانا' ایک قانون ہے جو نہ صرف شہد کی مکھی کی زندگی میں کام کر رہا ہے بلکہ پوری فطرت میں جاری و ساری ہے اور یہ دلیل مذہب اسلام کی حقانیت کی مظہر ہے۔

سرِ اطاعت خم کرنے کے سوا انسان کی بخشش کا کوئی ذریعہ یا واسطہ نہیں ہے۔ مگر عیسائیت' اسے پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھتی' اور اپنا بوجھ کسی دوسرے کے کندھوں پر منتقل کرنے کی قائل ہے۔ جبکہ قرآن حکیم اس تصور کی نفی کرتا ہے اور ہمیں اپنی صلیب خود اٹھانے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ مکھی کی مثال دیتے ہوئے ہمیں اسی کی طرح اپنی جملہ صلاحیتیں اور سرِ نیاز اس

کے سامنے جھکانے کی ہدایت دیتا ہے۔ تاکہ ہم اپنی حیاتِ دنیوی اپنے مالک حقیقی کی مرضی اور اس کی بتائی ہوئی راہوں میں صرف کر دیں اور بالآخر پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے باغوں کی سرزمین یعنی جنت کے مستحق ہو جائیں جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

''خدا کے بتائے ہوئے راستے پر سر اطاعت جھکائے چلتی رہ'' کا الہام بھرپور سائنسی رموز کا حامل ہے۔ سیدھے راستے کو محاورے کی زبان میں ''Beeline'' کہا جاتا ہے۔ یہ محاورہ اس طرح بنا کہ یہ مکھیاں خوراک حاصل کرنے کے لیے طویل سفر کرتی ہیں اور اس سفر کی مشکلات کو خوشی سے برداشت کرتی ہیں' کہیں بھی ستانے کے لیے نہیں رکتیں۔ جب چھتے سے بہت دور نکل جائیں تو واپسی کی سمت کا تعین کرنے کے لیے کافی اونچائی تک پرواز کرتی ہیں' پھر جب اس کا اندازہ ہو جائے تو مختصر ترین راستے سے واپس چھتے میں پہنچ جاتی ہیں۔

مکھی' خلوت کی نہیں بلکہ جلوت کی زندگی بسر کرتی ہے' یہ ایک سماجی کیڑا ہے جو گروہ (کمیونٹی) کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ یہ گروہ ایک کالونی کی صورت میں رہتا ہے۔ اس کالونی میں زبردست توافق اور نظم و ضبط پایا جاتا ہے۔ اس ہم آہنگی اور توافق کا مشاہدہ کرنے والے ان میں اعلیٰ درجے کی ذہانت پاتے ہیں۔ اس مشاہدے کی بنا پر متعدد مثالیں اور کہاوتیں وجود میں آئی ہیں' مثلاً: (1) Beeline کی طرح ''سیدھا راستہ'' (2) شہد کی مکھی کی طرح ''مصروف'' (3) فلاں آدمی نے دائیں بائیں جھکے بغیر مکھی طرح ''سیدھا راستہ'' اختیار کیا (4) مکھی کو افسردہ ہونے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ (5) جہاں مکھی ہوتی ہے وہاں شہد بھی ہوتا ہے۔ (6) اچھی مکھیاں' نکھٹو (Drones) نہیں بنتیں۔ (7) بلاشبہ ہر پھول کے اندر شہد ہوتا ہے' مگر اسے نکالنے کے لیے مکھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ (8) ایک پاؤنڈ شہد بنانے کے لیے مکھیوں کو 50,000 میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔

سائنسدانوں کا مشاہدہ ہے کہ جب مکھی پھولوں کا رس لیے واپسی کی اڑان بھرتی ہے تو وہ اس کے جسم کے وزن سے تقریباً نصف تک ہوتا ہے۔

عجائباتِ فطرت پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں' ان میں مکھی کی کہانی سے بڑھ کر کوئی دلچسپ نہیں ہوتی۔ انسان اس پُراسرار کیڑے کی زندگی کا صدیوں سے مطالعہ کرتا رہا ہے مگر شاید اسے ابھی مزید بہت کچھ جاننا ہے' کیونکہ مکھی کے اسرار کھلنے کا سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کے علاوہ وہ عملی طور پر ''پہاڑی کا وعظ'' دہرا رہی ہے جس کا ذکر انجیل میں ''SERMON ON THE MOUNT'' کے عنوان سے آیا ہے' اس تاریخی وعظ میں' جو حضرت عیسیٰؑ نے پہاڑی پر کھڑے ہو کر اپنے حواریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کیا' کہا تھا: ''یہ مت سوچو کہ میں شریعت کو توڑنے آیا ہوں یا پیغمبروں کے راستے کو تباہ کرنا چاہتا ہوں' میں تو ایک عہد پورا کرنے کے لیے آیا ہوں''...... مکھی عاجزی کے ساتھ خدا کی الہام کی ہوئی راہ پر چل رہی ہے' وہ رس حاصل کرنے کے لیے کسی ایک پھول کو بھی گزند نہیں پہنچاتی۔ ایک پاؤنڈ شہد پیدا کرنے کے لیے پچاس ہزار میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اور اتنی شدید مشقت اپنے لیے نہیں' دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے کرتی ہے۔ اس طرح پوری انسانیت کو یہ عملی سبق دیتی ہے کہ ''قانون کی پاسداری کرو' اسے توڑو نہیں۔ اسے تباہ کرنے سے تم خود ہی نقصان میں رہو گے' قانون انسانوں کی بہبود کے لیے بنتا ہے' اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو وہ اس کی پابندی کرنے سے ملے گا۔ ''پہاڑی کے وعظ'' کو قرآن نے اپنے الفاظ میں یہ فرمایا:۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

(آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے...... سورۃ المائدہ آیت 3)

اعلیٰ ترین ریاضی دانی:

کارکن مکھی جب پھولوں کے کسی جھنڈ سے رس لاتی ہے تو چھتے میں ڈانس کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ ڈانس اس کے لیے نہ صرف خوشی یا تفریح ہوتا ہے بلکہ پُر معنی بھی ہوتا ہے۔ یہ دوسری مکھیوں کے لیے ایک اشارہ ہوتا ہے کہ وہ بھی انہی پھولوں کا رس لائیں۔ مکھیوں کی ڈانس لینگویج پر میونخ یونیورسٹی کے پروفیسر وین فرلیش (Van Frisch) کے تحقیقی کام کو بہت شہرت حاصل ہوئی ہے' وہ چھتے کے اندر اس ڈانس کو بڑا معنی خیز قرار دیتا ہے۔ اس نے اور دیگر ماہرینِ حشریات (Entomologists) نے کیڑوں کے نظام ابلاغ کی تفصیلات پر کافی تحقیق کی ہے' وہ کہتے ہیں کہ مکھی اس خاص قسم کے ڈانس کے ذریعہ اپنی کالونی کی کارکنوں کو نہ صرف اپنے تلاش ہوئے پھولوں کا محل وقوع بلکہ ان کی قسم کی بھی اطلاع دیدیتی

ہے۔ یہ پیغام' اس کے پیٹ کے مختلف حصوں کی حرکت اور اس کے پروں کی رفتار حرکت سے ان تک پہنچتا ہے اور وہ گروہ در گروہ اس کے اشارے کی سمت میں اڑ جاتی ہیں۔ یہ ان کا ایک عددی نظام (Numerical system) ہے جس کے ذریعہ وہ ایک دوسری کو پھولوں تک پہنچنے کی سمت اور فاصلہ تک سمجھا دیتی ہیں۔ ''وین فریش'' کا کہنا ہے کہ مکھیوں کا نظام کاملاً منطقی اصولوں پر استوار ہے۔ یہ تو ''علم مثلثات'' (Trignometry) پر بھی عبور رکھتی ہیں۔ اس نے ان کی چھتے میں ''حرکت'' اور پھولوں تک ''فاصلے'' کے سلسلے میں ایک خاص تناسب (Ratio) بھی دریافت کیا ہے۔ اس تحقیق کے سلسلے میں اس نے کارکن مکھیوں کے پیٹ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مقناطیس لگائے۔ ان مقناطیسوں کی قطبیت (Polarisation) ان کے ڈانس کی سطح سے افقا تھی۔ ان مکھیوں کو ایک مقررہ فاصلے سے خوراک لانے کی عادی بنا دیا گیا' جب وہ اپنے مقناطیسی فیلڈ کے ساتھ ڈانس کرتیں تو چھلے (Coil) کے آر پار مختلف درجے کی ''برقی حرکت'' (وولٹیج) پیدا ہوتی تھی۔ اس میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں کرنے سے جو فرق پیدا ہوتا تھا اسے برقی آلات کی مدد سے بڑھا بڑھا کر رجسٹر کیا جاتا رہا۔ اس تجربے سے پتہ چلا کہ مکھیوں کی آگے پیچھے اور اوپر نیچے کی حرکتوں (Wagging Movements) میں ایک مستقل تعدّد (فریکوئنسی) پایا جاتا ہے۔ جو 15 بار فی سیکنڈ ہے۔ وہ جتنی بار حرکت کرتی ہیں اسی تناسب سے خوراک کی جگہ تک کا فاصلہ ہوتا ہے۔ یہ تجربہ بار بار دہرانے سے معلوم ہوا کہ وہ فاصلہ' ان کی حرکت سے بالکل صحیح مطابقت رکھتا تھا' اگرچہ یہ عددی لحاظ سے اس کے تناسب معکوس (Numerically inverse) میں تھا۔ پروفیسر فریش نے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ دریافت کی کہ مکھی کی ''اوپر نیچے اور دائیں بائیں حرکت'' کا فی ''رن'' (Run) تناسب اور پھولوں تک کا فاصلہ ''ای فنکشن'' (e-funcion) کے بالکل مطابق تھا جو کہ علم ریاضی میں قدرتی لوگارتھم کے نظام کی بنیاد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شہد کی مکھی ''قدرتی غیر متغیر مقدار'' سے اچھی طرح واقف ہے جسے ریاضی دان ''e'' (چھوٹا ''ای'') کہتے ہیں' اس کی عددی قیمت تقریباً 2,718 ہوتی ہے۔

یہ اعلیٰ ریاضی کا وہ پیچیدہ مسئلہ ہے جسے طلبا بڑی محنت سے سکول میں سیکھتے ہیں۔ مکھی کی ایک مجرد تصور قائم کرنے اور اس کے مطابق کام کرنے کی صلاحیت بھی واقعی ایک

قابل داد چیز ہے۔ تاہم اس کا ''ای فنکشن'' کا انتخاب اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ شاید وہ بالکل ہی ''سوچتی'' نہیں ہے' بلکہ ایک سادہ احساس ہی کو ''چھانے پھٹکے بغیر چند خاص علامات (Symbols) میں تبدیل کر لیتی ہے۔ (یہ ''چھان پھٹک'' یعنی فلٹرنگ ایک ذہنی عمل ہے جبکہ اس کو ایسا ذہن عطا ہی نہیں ہوا۔) اس طرح اسے فاصلے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ تین دیگر جرمن ماہرین حیاتیات ڈاکٹر ہوفمین' کوہلر اور وٹکنڈ نے بھی مکھیوں کی زبان سمجھنے کے لیے جدید طریقے وضع کیے۔ انہوں نے ڈانسنگ مکھیوں کے پیٹ کے آخری دائرے (Ring) سے پہلے والے دائرے پر ایک چمکیلا مادہ پینٹ کیا اور ان کے چھتے کو بالائے منفشی (الٹراوائیلٹ) روشنی سے منور کیا' اس روشنی نے مکھی کے پیٹ پر لگی پینٹ کو مزید نمایاں کر دیا' اب کیمرے کو چھتے پر فوکس کیا گیا اور ایکسپوژر کے وقت کو ایسے طریقے سے ایڈجسٹ کیا گیا کہ مکھی کی پوری متحرک تصور تیار ہو گئی۔ اس طرح متعدد متحرک تصویریں بن گئیں۔ ان حرکات کو شمار کر کے ایکسپوزر میں لگنے والے وقت کے ساتھ ان کا تناسب نکالا گیا۔ اس تجربے نے پروفیسر فریش کے اخذ کردہ نتائج کی توثیق کر دی۔ کہ مکھی ''ای فنکشن'' کا استعمال کرتی ہے اور اس کا ڈانس اس کے پیٹ کی حرکات کا نتیجہ ہوتا ہے جبکہ دوسری مکھیاں اپنے محاسوں (Palps) کو اس کے متحرک پیٹ کے ساتھ جوڑ کر اس سے اپنا پیغام (معلومات) وصول کر لیتی ہیں۔ لیکن اس سے وہ یہ نتیجہ کیسے اخذ کرتی ہیں کہ پھول کس سمت میں واقع ہیں اور کتنے فاصلے پر ہیں؟ یہ ایک نہایت گہرا راز ہے اور اس کا تعلق ''طریق تفکر'' سے ہے لیکن سردست ہم اس کی کوئی عضویاتی (Physological) توجیہہ نہیں کر سکتے۔ وہ دور دراز کے فاصلوں سے اپنے آشیانے (چھتے) کی طرف سے سیدھی لائن کا تعین اس طرح کرتی ہے کہ وہ اس فاصلے کے مساوی اونچائی تک پرواز کرتی ہے' پھر وہاں سے سیدھی سمت پا لیتی ہے۔

قرآن مجید کہتا ہے:۔

يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (اس کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اور اس میں لوگوں کے لیے کئی امراض کی شفا ہے......سورۃ النحل آیت 69)

یہ بہت اہم نسخہ ہے۔ مکھی کے اندر لیبارٹریوں کا ایک نظام ہوتا ہے' ان میں سے

ایک لیبارٹری پھولوں کے رس کو شہد میں تبدیل کرنے کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ ایک دوسری لیبارٹری ''ملکہ'' کے لیے خصوصی مشروب ''جیلی'' تیار کرتی رہتی ہے۔ اور ایک اور لیبارٹری شہد کو موم میں تبدیل کرتی ہے اور ''زرگل'' (Pollen) اور میٹھا رس مکھیوں کی خوراک ہوتا ہے۔ مکھیاں ایک پھول سے دوسرے پھول پر جاتی ہیں اور اپنی تھیلیوں پر اگے ہوئے بالوں کے ذریعہ ''زرگل'' اکٹھا کرتی ہیں جبکہ پھولوں کا میٹھا رس اپنے سونڈ میں جمع کرتی ہیں جس کے اندر کئی خانے (Division) ہوتے ہیں۔ مکھی سامنے والی ٹانگیں شگوفوں سے رس اور زرگل نکالنے کے لیے استعمال کرتی ہے اور رس کو سونڈ میں سے ایک خاص قسم کے لمبے تھیلے یا ایک قسم کے معدے میں منتقل کر دیتی ہے جہاں وہ شہد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ معدے کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ اس میں جمع شدہ شہد کسی وقت بھی خانوں (Cells) میں منتقل کیا جاسکتا ہے یا ''بچوں'' کی خوراک کے طور پر استعمال ہوسکتا ہے۔ قرآن مجید اس بات کی توثیق کرتا ہے کہ شہد کی مکھی کے کئی معدے (بطون) ہوتے ہیں۔ جو دراصل لیبارٹریاں ہوتی ہیں۔ یہ نہایت چھوٹی چھوٹی مگر اتنی حیرت انگیز لیبارٹریاں ہوتی ہیں کہ انسان کو بمشکل ہی یقین آتا ہے۔ یہ تین اقسام کی چیزیں بناتی ہیں (i) ایک پورا شہر تعمیر کرنے کے لیے خاص قسم کا مواد یا میٹریل (ii) کئی ہزار شہریوں کے لئے خوراک اور (iii) رائل جیلی جو نوجوان ملکہ کی پرورش کے لیے بطور دودھ استعمال ہوتی ہے' یہ نائٹروجن سے بھرپور ہوتی ہے چھتے میں کئی اقتصادی اصول کارفرما ہوتے ہیں۔ کئی کیمیائی رطوبتیں پیدا ہوتی ہیں اور کئی آلات حرارت کو کنٹرول کر رہے ہوتے ہیں۔

اب آگے کئی سوال ہیں مثلاً پھولوں کے رس کو شہد میں تبدیل کرنے اور شہد کو موم کی پلیٹوں کی صورت میں لانے کے لیے کیا طریق کار ہے؟ مکھیاں' مگسِ نر (Drones) کے لیے معمولی قسم کی خوراک' کارکن مکھیوں کے لیے عمدہ قسم کی بریڈ اور ''ملکہ'' کے لیے خصوصی مشروب' رائل جیلی کیسے تیار کرتی ہیں؟۔ وہ کیسے جانتی ہیں کہ ''ملکہ'' خود نہیں کھا سکتی' ہم نے اسے رائل جیلی ہی کھلانی ہیں؟ یہ سربستہ راز ہیں' ان کا اب تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ لہٰذا ہمیں خدا کے اس فرمان پر ہی ایمان رکھنا چاہئے۔ ''تیرے رب نے مکھی کو الہام کیا ہے'' اور وہ اس الہام کے تحت سارے حیرت انگیز کام عاجزی و انکساری کے ساتھ کئے جا رہی ہے۔

سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ بعض مکھیاں علم الوجود (ONTOLOGY) کی ماہر ہوتی ہیں۔ پھولوں میں سے مطلوبہ ''جوہر'' کشید کر کے چھتے میں لاتی ہیں اور کیمسٹ مکھیوں کے منہ میں اسے زبردستی ٹھونس دیتی ہیں' یہ مکھیاں اپنی زبان کی تیز رفتاری کے بل بوتے پر اس میں سے نمی کو اڑانے کے بعد اس میں اپنا لعاب شامل کر دیتی ہیں' اس طرح پُراسرار طریقے سے یہ رس شہد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سائنسدان مکھیوں کی اس کیمیائی کرامت پر حیرت زدہ ہیں۔

قرآن کا کیمیائی اعجاز

اب ہم روحانی دنیا اور اخلاقِ قرآن کے کیمیائی اعجاز کی طرف آتے ہیں۔ ہم مادی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس کائنات میں پائی جانے والی ہر چیز کسی نہ کسی مفید مقصد کی تکمیل کر رہی ہے۔ لیکن یہ مفید اسی وقت ہوتی ہے جب اسے ایک خاص طریقے سے کام میں لایا جائے۔ ورنہ یہ زہر بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ مکڑی کے لیے جو چیز زہر کی حیثیت رکھتی ہے وہ مکھی کے لیے شہد بن جاتی ہے۔ اور مقولہ ہے کہ:۔

''شہد تو ہر پھول میں ہوتا ہے مگر اسے نکالنے کے لیے مکھی کی ضرورت ہوتی ہے''

علیٰ ہذا القیاس تمام سابقہ الہامی کتابوں میں بے سند اور بے جواز باتیں کسی نہ کسی طریقے سے شامل کر دی گئی ہیں۔ قرآنی وحی نے شہد کی مکھی کی مانند ہی ان میں سے رس یعنی روح' اخذ کر کے اور اس میں سے نمی کو اڑا کر اسے خالص و مصفیٰ پیغام پیش کر دیا ہے۔ اسے انسانی ہاتھ نے نہیں چھوا جس کی وجہ سے اس کی تازگی برقرار ہے۔ ان کتابوں میں سے کون کون سی آلائشیں دور کی گئیں اور کن کن بے اصولیوں اور خلافِ قیاس باتوں کی نشاندہی کی گئی یہ ایک وسیع موضوع ہے جس کے لیے تفصیلی بحث درکار ہے' یہاں صرف چند ایک مثالوں کا ذکر کافی رہے گا۔

مذہبی کتابوں میں تحریفات

قرآن نے انجیل میں پائی جانے والی غلطیوں اور تحریفات پر اپنی ناپسندیدگی کا جس خوبصورتی کے ساتھ اظہار کیا ہے وہ اس کے کلام اللہ ہونے کا روشن ترین ثبوت ہے۔

عبرانی زبان کی انجیل میں یہودیوں کے عظیم مذہبی پیشوا' جن سے اسرائیلی اپنی شناخت پاتے ہیں ان کا نام یعقوب لکھا ہوا ہے' اس کے معنی ہیں ''وہ شخص جو کسی کو روندتے ہوئے' کہنی مار کر پیچھے ہٹاتے ہوئے' یا دھوکہ فریب دیتے ہوئے اس کی جگہ لے لیتا ہے''۔ انجیل کہتی ہے کہ ''اور اس (عیسو یعنی برادرِ یعقوب) نے کہا: ''اس کا نام یعقوب صحیح طور پر نہیں رکھا گیا' کیونکہ اس نے دو دفعہ میرے ساتھ چالبازی کی' پہلے اس نے میرا پیدائشی حق لے لیا؛ اور اب دیکھو اس نے میری برکت چھین لی ہے''

اس چالبازی کا کچھ جواز تلاش کرنے کے لیے اسی کتاب توراۃ میں اپنے اس پیشوا سے ایسے جرائم منسوب کیے گئے جو انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس واقعہ کے حوالے سے بھی پہلے یعقوبؑ سے کتاب پیدائش میں یہ بات منسوب کی گئی کہ اس نے رحم مادر ہی میں اپنے بھائی سے داؤ پیچ شروع کر دیئے:

''اور اس (اسحاق) کی بیوی ربقہ حاملہ ہوئی اور اس کے پیٹ میں دو لڑکے آپس میں مزاحمت کرنے لگے۔ تب اس نے کہا' اگر ایسا ہی ہے تو میں زندہ کیوں ہوں؟ اور وہ خداوند سے پوچھنے گئی۔ خداوند نے اس سے کہا کہ تیرے پیٹ میں دو قومیں ہیں اور دو قبیلے تیرے بطن سے نکلتے ہی ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جائیں گے اور ایک قبیلہ دوسرے سے زور آور ہو گا۔ اور بڑا چھوٹے کی خدمت کرے گا۔ اور جب اس کے وضع حمل کے دن پورے ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے پیٹ میں توام ہیں۔ اور پہلا جو پیدا ہوا اس کا رنگ سرخ تھا' اوپر سے ایسا جیسے پشمینہ۔ انہوں نے اس کا نام عیسو رکھا۔ اس کے بعد اس کا بھائی پیدا ہوا اور اس کا ہاتھ عیسو کی ایڑی پکڑے ہوئے تھا اور اس کا نام یعقوب رکھا گیا...... (کتاب پیدائش باب 25' آیات 22-24)

لیکن یعقوب' اپنے بھائی کی ایڑی کیوں پکڑے ہوئے تھا؟ اس لئے کہ' قوم میں رواج یہ تھا کہ توام بچوں میں سے جو بھی پہلے جنم لیتا' اسے پہلوٹھی کا بچہ کہا جاتا اور وہی اپنے باپ کی برکتوں کا وارث ہوتا تھا' اس لیے دونوں بھائیوں میں' پہلے جنم لینے کے لیے کشمکش شروع ہو گئی۔ ہوسیع (HOSEA) رسول کے الفاظ میں:

''اس نے رحم مادر میں اپنے بھائی کی ایڑی پکڑی اور اپنی توانائی کے ایام میں خدا سے کشتی لڑی''.......(ہوسیع باب 12' آیت 3)

چنانچہ حضرت یعقوب کا پہلا بڑا کارنامہ یہ ٹھہرا کہ انہوں نے اپنا پہلے پیدا ہونے کا حق حاصل کرنے کے لیے بطن مادر ہی میں کشمکش شروع کر دی۔ ان کی زندگی کا دوسرا واقعہ ذرا زیادہ تفصیل سے دیا گیا ہے:

''اور یعقوب نے دال پکائی اور عیسو جنگل سے آیا اور بے دم ہو رہا تھا۔ عیسو نے یعقوب سے کہا کہ میں تیری منت کرتا ہوں۔ کہ یہ جو لال لال ہے مجھے کھلا دے کیونکہ میں بے دم ہو رہا ہوں۔ اسی لیے اس کا نام ادوم بھی ہو گیا۔ تب یعقوب نے کہا تو آج اپنا پہلوٹھے کا حق میرے ہاتھ فروخت کر دے۔ عیسو نے کہا دیکھ میں تو مرا جاتا ہوں۔ پہلوٹھے کا حق میرے کس کام آئے گا؟۔ تب یعقوب نے کہا کہ آج ہی مجھ سے قسم کھا۔ اس نے اس سے قسم کھائی اور اس نے اپنا پہلوٹھے کا حق یعقوب کے ہاتھ بیچ دیا''.......(کتاب پیدائش باب 25 آیات (29-32)

اس طرح یعقوب نے اپنے بھائی کے احتیاج اور بھوک سے فائدہ اٹھا کر اس سے اس کا پہلوٹھے کا حق مبیّنہ طور پر چھین لیا، لیکن اسی پر اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے بوڑھے باپ کو بھی دھوکہ دیا جس کی بینائی کمزور ہو چکی تھی۔ اس نے اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خود کو عیسو کے طور پر پیش کر کے اس سے پہلوٹھے کی برکت حاصل کر لی۔ (اس واقعہ کی مزید تفصیل جاننے کے لیے کتاب پیدائش باب 27 دیکھئے) جب عیسو کو معلوم ہو گیا کہ اس کے بھائی نے اسے دھوکہ دیا ہے تو وہ اس کا بدترین دشمن بن گیا۔ چنانچہ ماں نے یعقوب کی زندگی بچانے کے لئے اسے اس کے سُسر کے گھر بھیج دیا۔ یعقوب نے وہاں جا کر اسے بھی دھوکہ دیا' اور اس کا بہت سا سامان اور سونا وغیرہ لے گیا۔ لیکن اپنے سسر کے گھر جانے سے پہلے اس نے جو دعا کی تھی وہ یوں تھی:

''اور یعقوب نے یہ عہد کیا تھا' اگر خدا نے میرا ساتھ دیا اور میں جس راستے پر چل رہا ہوں اس چلنے میں میری مدد کی' اور مجھے خیریت کے ساتھ واپس والد کے گھر پہنچا دیا' پھر وہ خدا' میرا خدا ہو گا (یعنی اگر ایسا نہ ہوا تو وہ خدا ''اُس'' کا خدا ہو گا) اور اگر ایسا ہو گیا' یعنی تو نے

مجھے سب کچھ دے دیا تو میں یقیناً اس کا دسواں حصہ تیرے نام قربان کر دوں گا"۔ یہ یعقوب کے لیے اچھی تجارت ہوسکتی تھی لیکن خدا کے لیے تو ایسا نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے اپنے سسر کے گھر سے لوٹی ہوئی دولت کا دسواں حصہ خیرات نہیں کیا۔

حضرت موسیٰؑ پر دھوکہ دہی کا الزام

انجیل کے مصنفین نے صرف یعقوبؑ پر ہی تہمت تراشی نہیں کی بلکہ عظیم المرتبت پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ ان پر متعدد الزامات لگائے گئے اور دھوکہ باز تک کہہ دیا گیا۔ کتاب خروج میں لکھا گیا ہے کہ:

''جب موسیٰؑ نے اسرائیلیوں سمیت مصر سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا تو خدا نے اس سے کہا ''سو اب تو لوگوں کے کانوں میں ڈال دے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے پڑوسی اور ہر عورت اپنی پڑوسن سے سونے چاندی کے زیورات بطور ادھار مانگ لے اور خداوند نے ان لوگوں پر مصریوں کو مہربان کر دیا اور یہ آدمی، موسیٰ بھی ملکِ مصر کے خادموں کی نظر میں بڑا بزرگ تھا'' ...... ''اور بنی اسرائیل نے وہی کیا جو موسیٰ نے انہیں کہا تھا، اور ساتھ یہ بھی کیا کہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیورات اور کپڑے بھی مانگ لئے اور خدا نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ جو کچھ انہوں نے مانگا، انہوں نے دے دیا، سو انہوں نے مصریوں کو لوٹ لیا''۔ (کتاب خروج: باب 11 آیت 2، 3 ...... باب 12، آیات 35، 36)

کیا خدا، ایک جلیل القدر پیغمبر کے ذریعے بنی اسرائیل کو ایسی غیر اخلاقی ہدایات دے سکتا تھا کہ وہ اڑوسیوں پڑوسیوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائیں۔ یہودی سکالروں نے اس شرمناک ہدایت کا یہ جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ اقدام ابراہیمؑ سے خدا کے اس وعدے کے تحت ضروری ہو گیا تھا کہ تمہارا ''بیج'' چار سو برس تک ایک اجنبی ملک میں غلامی کی

زندگی بسر کرنے کے بعد لوٹ مار کے بہت سے سامان سمیت وہاں سے نکل آئے گا۔ اگر خدا نے اپنا کوئی وعدہ پورا کرنا ہی تھا تو کیا اس کے لیے یہی شرمناک طریقہ باقی رہ گیا تھا؟ ہم اس بات پر کیسے یقین کر لیں کہ اس فراڈ کا ارتکاب ''لارڈ جیہوواہ'' کے حکم کے تحت کیا گیا تھا؟

اب کتاب خروج میں باب 3' آیات 21 اور 22 ملاحظہ فرمایئے:

''اور یوں ہوگا کہ جب تم نکلو گے تو خالی ہاتھ نہ نکلو گے بلکہ تمہاری ایک ایک عورت اپنی اپنی پڑوسن سے اور اپنے اپنے گھر کی مہمان سے سونے چاندی کے زیورات اور لباس مانگ لے گی۔ ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو لوٹ لو گے''

اس عبارت کو کتابِ استثناء کے باب 5 کی آیات 19 تا 21 سے کیسے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے؟ جس میں یہ ہدایات دی گئی ہیں:۔

تو چوری نہ کرنا' تو اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا' تو اپنے پڑوسی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا' اور نہ اپنے پڑوسی کے گھر یا اس کے کھیت یا غلام یا لونڈی یا گدھے یا اس کی کسی اور چیز کا خواہاں نہ ہونا۔''

اب متی کا باب 12' آیت نمبر 1 دیکھیے جس میں بتایا گیا ہے کہ ''اس وقت یسوع سبت کے دن کھیتوں میں ہو کر گیا اور اس کے شاگردوں کو بھوک لگی اور وہ بالیں توڑ توڑ کر کھانے لگے''۔ پہلے تو یہ دیکھیے کہ محض بھوک لگ جانا' مسلّمہ اخلاقی آداب سے انحراف کا جواز نہیں بن سکتی۔ درحقیقت وہ اور ان کا آقا ہمیشہ بھوکے رہتے تھے کیونکہ وہ کسی قسم کی محنت نہیں کرتے تھے' کیونکہ ان کے آقا نے انہیں یہی درس دیا تھا۔ (دیکھیے متی 2:4؛ لوقا 2:4؛ مرقس 25:2؛ متی 18:21؛35:25) جبکہ متی کے باب 6' آیات 25 تا 32 میں تفصیلاً لکھا گیا ہے:

''اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں' نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں تو بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ تم میں سے ایسا کون ہے جو اپنی عمر میں ایک لمحہ بھی بڑھا سکے اور پوشاک کی کیوں فکر کرتے ہو

جنگلی سوسن کے درختوں کوغور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں۔تو میں بھی تم سے کہتا ہوں کہ سلیمانؑ بھی باوجود اپنی ساری شان وشوکت کے ان میں سے کسی کی مانند ملبوس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی' ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو کیا وہ تم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ اس لیے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے؟''

ثانیاً...... یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ واقعہ یوم سبت پر ہوا تھا کیونکہ فریسی (ریاکار' شریعت کی ظاہری پابندی کرنے والے) اس روز شہر سے اتنے زیادہ دور نہیں جاتے۔

ثالثاً...... شاگردوں اور ان کے آقا کو بھوک کی حالت میں سفر شروع نہیں کرنا چاہئے تھا۔ انہیں کافی سفر کے بعد بھوک محسوس ہوئی۔ یہ بات معقول نہیں لگتی کہ فریسی ان کے پیچھے پیچھے صرف یہ دیکھنے کے لیے چلتے رہے کہ اتنے دور بیابان میں جا کر وہ کیا کریں گے؟

رابعاً...... کسی مذہبی قائد یا معلم اور اس کے شاگردوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی شخص کے ملکیتی حقوق میں' اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرے۔ اگر تیرہ بھوکے کسی غریب کاشتکار کے کھیت سے بھٹے توڑ لیں تو اسے حق مل جاتا ہے کہ وہ ان کے خلاف عدالتِ انصاف میں چارہ جوئی کرے۔

خامساً...... یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ شاگردوں نے کھیت پر خوب ہاتھ صاف کیے۔ اور اس کے مالک کی فصل بے خوف ہو کر لوٹی کیونکہ ان کے آقا نے روز اول ہی کو ان سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں تمہیں انسانوں کا ماہی گیر بناؤں گا۔ (مرقس 17:1) چنانچہ انہوں نے محنت کر کے کھانے کی بجائے صرف انسانوں پر جال ڈالنا شروع کر دیے۔

سادساً...... سوال یہ نہیں کہ بھٹے چوری کرنا عام دنوں میں جائز ہے لیکن یوم سبت کو جائز نہیں۔ یوم سبت ایک مقدس دن ہے اس روز ''تمہارا جو کچھ ہے وہ میرا ہے'' والا رویّہ عام دنوں کی بہ نسبت زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔

سابعاً...... انجیل کا فاضل مفسر کتابِ استثنٰی کے باب 29' آیت 25,24 کا حوالہ دیتا ہے ''تب وہ بلکہ سب قومیں پوچھیں گی کہ خداوند نے اس ملک سے ایسا کیوں کیا؟ اور ایسے بڑے قہر کے بھڑکنے کا سبب کیا ہے؟ اس وقت لوگ جواب دیں گے کہ خداوند' ان کے باپ

داؤد کے ساتھ خدا نے جو عہد انہیں ملک مصر سے نکالتے وقت باندھا تھا' اسے ان لوگوں نے چھوڑ دیا'' اور کہتا ہے کہ کیا یہ پیشگوئی کر دی گئی تھی کہ وہ قانون کو ترک کر دیں گے لیکن یہ تو اعتراف جرم کا معاملہ ہے۔

آخر میں مرقس نے یسوع مسیح کا قول یاد دلایا ہے...... ''کیا تم نے نہیں پڑھا کہ داؤد نے اس وقت کیا کیا جب اس کو اور اس کے ساتھیوں کو بھوک لگی اور غذا کی سخت ضرورت پڑی' وہ کیسے خدا کے گھر گئے اور نذر کی روٹیاں کھائیں جن کو کھانا کاہنوں کے سوا کسی کے لیے روا نہیں۔ اور کاہن نے ان سے کہا کہ سبت آدمی کے لیے بنا ہے' نہ کہ آدمی سبت کے لیے۔ (مرقس باب 2' آیات 25' 26' 27)۔ یہ عذرِ گناہ' بدتر از گناہ تھا' (دیکھیے ''ایسموئیل'' 6:21 ''تب کاہن نے مقدس روٹی اس کو دی' کیونکہ کوئی اور روٹی وہاں نہیں تھی۔ فقط نذر کی روٹی تھی جو خداوند کے آگے سے اٹھائی گئی تھی۔ لیکن یہ چوری نہیں تھی)

اس عظیم معلم کے لیے فریسیوں کے سامنے یہ اعتراف کر لینا زیادہ بہتر تھا کہ اس کے شاگردوں نے جو کام کیا وہ غلط تھا۔ بھوک برداشت کر لینا دوسرے انسانوں کا حق غصب کرنے سے بہتر تھا۔ حضرت عیسیٰؑ ان کے سامنے حضرت داؤدؑ کی مثال پیش کر دینے سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر کم سے کم بھی کہا جائے تو یہ محض ایک معذرت تھی۔ دو منفیاں (Negatives) مل کر ایک مثبت نہیں بن سکتیں۔ نہ ہی دو گناہ مل کر ایک نیکی بن سکتے ہیں۔

لیکن ایک بزرگ پیغمبر نے نذر (منت) کی روٹی ہرگز نہیں چرائی' یہ کاہن نے خود انہیں پیش کی تھی۔ ان پر چوری کا الزام دھرنا ایک مقدس شخصیت کی بے ادبی بلکہ کلمۂ کفر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جن میں ایسا کیا گیا ہے۔

معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنا' مذہبی کتابوں کا اوّلین مقصد ہوتا ہے۔ ان کتابوں کے مصنفین اور شارحین نے یہ اہتمام تو کر دیا ہے کہ احکامات کو تاکیدی انداز میں لکھا ہے جیسا کہ ''تم ایسا نہیں کرو گے' تم ویسا نہیں کرو گے'' مگر انہیں موثر بنانے کے لیے گناہوں اور جرائم کے تمام اسباب و محرکات کا جائزہ لینے اور انہیں دور کرنے کی ضرورت تھی۔ بائبل کے یہ احکامات کہ ''تم چوری نہیں کرو گے' بدکاری نہیں کرو گے' قتل نہیں کرو گے'' اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتے جب تک انبیاء اور صلحاء کا کردار مثالی طور پر پاک و صاف نہ دکھایا جائے۔

لیکن بائبل ہی میں ان کا کردار ان کی اپنی تعلیمات کے بالکل برعکس دکھایا گیا ہے۔ مثلاً:

احکامات:

(i) ''میرے حضور تُو غیروں کو معبود نہ ماننا''۔ (خروج 1:20)

(ii) ''تُو اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا'' (خروج 13:20)

(iii) تو پڑوسی کے مکان' اس کی بیوی' اس کے غلام اس کے بیل یا اس کے گدھے یا اس کی کسی اور چیز کو حرص و لالچ کی نظر سے نہ دیکھنا۔ (خروج 14:20)

(iv) تُو چوری نہ کرنا۔ (خروج 15:20)

اعمال:

(i) پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا: ''دیکھ میں نے تجھے فرعون کے لیے گویا خدا ٹھہرایا......(خروج 7:)

(ii) اور اے موسیٰ تو اس (ہارون کے لیے گویا خدا ہوگا (خروج 16:4)

(iii) اور ایسا ہوگا کہ جب تم (مصر سے) نکلو گے تو خالی ہاتھ نہ نکلو گے بلکہ تمہاری ایک ایک عورت اپنی اپنی پڑوسن سے اور اپنے اپنے گھر کی مہمان سے سونے چاندی کے زیورات مانگ لے گی۔ ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو لوٹ لو گے......(خروج 21:3)

چنانچہ بنی اسرائیل نے وہی کچھ کیا جس کے لیے حضرت موسیٰ نے انہیں حکم دیا تھا۔ انہوں نے اہل مصر سے چاندی اور سونے کے زیورات اور ملبوسات مانگ لیے۔ خدا نے چونکہ مصریوں کی نگاہ میں انہیں باعزت اور قابل اعتبار بنایا تھا' اس لیے انہوں نے بھروسہ کر کے انہیں مطلوبہ چیزیں دیدیں' اور وہ انہیں نقصان پہنچا کر چلے گئے۔ (خروج 12:35' 36)

چوریوں کا خاتمہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب چوروں کو جرائم پیشہ اور گناہ گار سمجھ کر ان سے نفرت کی جائے لیکن اگر معلّمینِ اخلاق خود ہی ارتکابِ جرم کی ترغیب دینے لگیں تو معاشرے میں سے برائیاں کیسے ختم ہوسکتی ہیں۔

مسیحؑ کا یہ اخلاقی درس کہ ''اپنے دشمنوں سے ایسے محبت کرو جیسے خود سے کرتے ہو''

بہت بلند پایہ درس ہے لیکن عملی زندگی میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے کیونکہ اسے روزمرہ کی زندگی میں عملاً اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ دشمن کو معافی دی جا سکتی ہے' حتیٰ کہ اس سے مشفقانہ سلوک بھی کیا جا سکتا ہے لیکن دشمن سے محبت (اور وہ بھی اپنی طرح') کرنا نفسیاتی طور پر ناممکن ہے۔

دشمن سے نہ تو خدا نے محبت کی ہے اور نہ حضرت مسیحؑ نے عملاً ایسا کر کے دکھایا ہے۔ بعض مخالفوں کو انہوں نے منافق (متی 5:7؛ لوقا 42:6؛ 15:13 اور متی 7:15) بدکار نسل (متی 12 : 39؛ 16 : 4؛ مرقس 8 : 38) اور زہریلے ناگ' بدباطن وکینہ پرور نسل (متی 7:3؛ 34:12؛ 33:23؛ لوقا 7:3) وغیرہ کا خطاب دیا ہے جو کہ ان کی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ وہ تو درخت سے بھی اپنی نفرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکے جس پر انہوں نے درخت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: ''اور جب صبح کو وہ پھر شہر جا رہا تھا تو اسے بھوک لگی اور راہ کے کنارے انجیر کا ایک درخت دیکھ کر اس کے پاس گیا اور پتوں کے سوا اس پر کچھ نہ پا کر اس سے کہا کہ آئندہ تجھ میں کبھی پھل نہ لگے اور انجیر کا درخت اسی وقت سوکھ گیا''......(متی 19:21)

والدین کے حقوق اور انجیل

انجیل میں والدین کے بارے میں ہم ایک طرف یہ پڑھتے ہیں (i) اپنے باپ اور ماں کی عزت کرو (ii) تم ہر آدمی کو اس کی ماں اور باپ کے مسئلے پر ڈراؤ (iii) جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کرے وہ ضرور جان سے مارا جائے گا (احبار 9:20)

لیکن دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ حکم بڑے واضح طور پر دیا گیا ہے۔ ''اس لیے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی بیوی سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔'' (کتاب پیدائش 24:2)۔ انجیلوں میں کوئی ایسی آیت نہیں ملتی جس میں عیسیٰؑ کے اپنی والدین سے حسن سلوک کا ذکر ہو' اس کے برعکس ہمیں وہاں ان کی طرف سے ان کے لیے توہین آمیز الفاظ ملتے ہیں۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ انجیل ہمارے سامنے اپنے اعزہ واقربا سے اچھے سلوک کی کوئی اچھی مثال پیش نہیں کرتی۔ ''جیکب'' (یعقوب) نے اپنے والد اور سُسر کے ساتھ جو برتاؤ کیا' پچھلے صفحات میں ہم اس کا ذکر کر آئے ہیں۔ اس کے نام کے معنی ہی ''دوسروں کو

پیچھے ہٹا کر ان کی جگہ لینے والا یا پاؤں تلے روندنے والا'' کے ہیں۔ لیکن خدا ''جیکب'' سے محبت کرتا تھا اور اس کے بھائی عیسو سے نفرت رکھتا تھا' کیونکہ موخر الذکر سادہ طبیعت کا آدمی تھا اور ''جیکب'' کی طرح دغاباز نہیں تھا۔

قرآن نے نہ تو اس کینہ پروری کی خصوصیات کے حامل نام کا ذکر کیا اور نہ ہی انجیل میں اس عظیم شخصیت سے منسوب چالبازیوں کا کوئی حوالہ دیا' بلکہ ''جیکب'' نام کو ہی تبدیل کر کے ''یعقوب'' کر دیا جس کے معنی ہیں ''ایسا شخص جو اپنے دادا (ابراہیم) کے نقش قدم (عقب) پر چلتا تھا'' چنانچہ فرمایا گیا......وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ۔ (اور ہم نے اسے (ابراہیم کو) اسحاق عطا کیا اور یعقوب اس پر مزید' اور ہر ایک کو صالح بنایا......سورۃ الانبیاء آیت 72) ان زوردار الفاظ کے ذریعہ نبی اُمی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس عظیم المرتبت شخصیت پر' اس کے بیٹوں کی طرف سے لگائے گئے الزامات کی سختی سے تردید کی اور ان کے حقیقی کردار کو شایان شان طریقے سے بیان کیا۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہودی اور عیسائی خدا کے ایک عظیم سپاہی پر جعلسازی اور غصب کے الزامات لگا کر دنیا بھر میں ان کی اشاعت کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انجیل' دنیا بھر کی کسی بھی کتاب سے زیادہ تعداد میں چھپتی ہے۔

اب ایک اور مثال' حضرت مریم کے نام کی لے لیجئے (اس لفظ کو انگریزی میں ''Mirium'' یا ''Miryam'' لکھا جاتا ہے اور اس کے معنی ''باغی'' یا ''سرکش'' کے ہیں) اور انجیل کی کتاب ''Numbers'' (گنتی) کے باب 12 میں ان سے جو من گھڑت کہانی منسوب کی گئی ہے اسے بھی پڑھئے۔ یہاں مریم نام کی دو خواتین قابل ذکر ہیں۔ ایک ہے ہارونؑ اور موسیٰؑ کی ہمشیرہ صاحبہ اور دوسری حضرت عیسیٰؑ کی والدہ صاحبہ۔ اول الذکر کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس نے موسیٰ ؑ کے خلاف بغاوت کی تھی (ملاحظہ کیجئے کتاب گنتی کا باب 12 جس میں کہا گیا ہے کہ مریمؑ اور ہارونؑ موسیٰؑ کے خلاف باتیں کرتے رہتے تھے جس پر خدا کو غصہ آ گیا اور مریم کو جذام کا مرض لاحق ہو گیا) جبکہ دوسری مریم کے بارے میں کہا گیا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ پر کبھی ایمان نہیں لائیں۔ (متی 46:12' 50؛ مرقس 30:3' 35 اور لوقا 19:8' 21)

ان انجیلوں کی متذکرہ آیات پر غور کرنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کے

مطابق تو حضرت عیسیٰؑ نے زندگی بھر اپنی والدہ سے احترام کا سلوک نہیں کیا۔ آخر وہ اس عظیم شخصیت کی والدہ تھیں جسے بحیثیت ایک مذہبی مصلح ان سے مثالی حسن سلوک اور احترام کا رویّہ رکھنا چاہیئے تھا لیکن ہمیں کیا دکھایا جاتا ہے کہ قانائی گلیل میں گھر میں زیادہ مہمان آجانے کی وجہ سے وہ شراب کم پڑ جانے کے باعث بے حد پریشان ہوگئی تو اس نے بیٹے سے کہا.......

''ان کے لیے شراب نہیں رہی تو عیسیٰؑ نے جواب دیا...... ''اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام ہے'' (یوحنا کی انجیل 4:2) ایک اور موقع پر اس کی ماں اس سے ملنے آئی تو ان کی ملاقات کا یوں ذکر کیا گیا ہے: ''پھر اس کی ماں اور اس کے بھائی اس کے پاس آئے مگر بھیڑ کی سبب سے اس تک نہ پہنچ سکے اور اسے خبر دی گئی کہ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے ملنا چاہتے ہیں' اس نے جواب میں ان سے کہا کہ میری ماں اور میرے بھائی تو یہ ہیں جو خدا کا کلام سنتے اور اس پر عمل کرتے ہیں'' (لوقا 19:8 ' 21؛ مرقس 31:3 ' 36)

پھر دیکھیے: جب ایک عورت نے بہ آواز بلند کہا ''مبارک ہے وہ رحم جس میں تو رہا اور وہ چھاتیاں جو تُو نے چوسیں''......اس نے کہا ''ہاں مگر زیادہ مبارک وہ ہیں جو خدا کا کلام سنتے اور اس پر عمل کرتے ہیں''۔ (لوقا 27:11، 28)

انجیل کے مطابق جب مسیح کو ''مصلوب'' کیا جارہا تھا تو صلیب کے نچلے سرے پر ماں کا دل غم و اندوہ میں ڈوبا جارہا تھا' بتایا جاتا ہے کہ ''مسیح نے اپنی ماں کو' جسے وہ بہت پیار کرتا تھا' دیکھ کر کہا........ ''اے عورت' دیکھ تیرا بیٹا یہ ہے'' کیا کہنے اس طرز مخاطب کے!

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسیح نے جتنی بار بھی اپنی ماں کو مخاطب کیا اس کے لئے لفظ ''گنائی'' استعمال کیا جو یونانی زبان میں کسی بھی عورت کے لیے استعمال ہو سکتا ہے خواہ وہ بیوی ہو' کوئی طوائف ہو یا والدہ۔ بحوالہ متی 25:16؛ 22:15؛28؛ 7:26؛ مرقس 25:5)

ولدیت مسیح کا مسئلہ

جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولدیت کا مسئلہ ہے' اس پر اظہار خیال سے پہلے ہم چند جملے بطور تمہید عرض کرتے ہیں:

کہا جاتا ہے کہ انسانی بچہ جس کی ماں نہ ہو' دنیا کی انتہائی معذور اور بے آسرا مخلوق ہوتا ہے۔ روئے زمین پر تین قسم کے خاندان پائے جاتے ہیں۔

(i) ''ماں باپ پر مشتمل خاندان'' جنہیں اصطلاحاً ''Bi-paternal'' خاندان کہا جاتا ہے۔ ان میں ماں اور باپ مل جل کر اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔

(ii) ''ماں والے خاندان''۔ یہ وہ خاندان ہوتے ہیں جن میں بچوں کی پرورش ماں کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے اور باپ اس کام میں عموماً حصہ نہیں لیتا۔ تقریباً تمام جانور اسی قسم کے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

(iii) ''بچوں کے ایسے خاندان'' جن میں نہ ماں پرورش کی ذمہ دار ہوتی اور نہ باپ۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ براہ راست خدا کے ذمہ ہوتے ہیں۔ وہی ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ مینڈک اور تتلیاں اسی زمرے میں آتی ہیں۔

ہم نہایت افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگر ان لوگوں کے کہنے کے مطابق یُسوع مسیح' حضرت داؤد کے شجرۂ نسب کی وجہ سے یوسف نجار کے بیٹے تھے تو پھر یوسف بڑا غافل اور لا اُبالی شخص تھا اور گھر میں اپنی بیوی سے بے اعتنائی اور لاتعلقی کی زندگی گزار رہا تھا' جس نے جُوڈیا کی شدید سردیوں میں ایک درخت کے نیچے بچے کو جنم دیا۔ اگر وہ خدا کے بیٹے تھے تو پھر خدا نے اپنے ''بیٹے'' کے ساتھ کوئی خاص دلچسپی نہیں لی کیونکہ وہ ''چرنی'' (کھرلی) میں پیدا ہو کر وہاں چلاّتا رہا۔

مادریت کی عظمت پر جتنا زور دیا جائے اتنا ہی کم ہے' وہ اپنے بچے کو جنم دینے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہوتی ہے' جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے انسان کا بچہ ماں کے بغیر انتہائی بے بس چیز ہوتا ہے' بلکہ بندر کے بچے سے بھی زیادہ بے چارہ ہوتا ہے۔ چنانچہ زندہ نسلوں کی تقدیر ہی مادریّت پر منحصر ہوتی ہے۔ آج ہم جہاں پر اور جس حالت میں ہیں' اس کا سبب یہ ہے کہ ہمیں ہماری ماؤں نے نہ صرف جنم دیا' بلکہ ہمیں پالا بھی اور تحفظ بھی دیا اور ایسے وقت دیا جب ہمیں اس کی اشد ضرورت تھی۔ اسی لیے قرآن نے ہمیں اپنی ماؤں کا احترام کرنے کا سبق دیا۔ ہمیں حکم دیا کہ ہم خدا کی عبادت کریں اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں۔ اگر ان میں سے کوئی بڑھاپے کو پہنچ جائے تو اس کے سامنے ''اف''

تک نہ کریں۔ اور نہ ہی انہیں جھڑک کر جواب دیں۔ ان سے نرمی اور شفقت کے ساتھ بات کریں ان کے سامنے جھک کر رہیں اور ان کے لیے یہ دعا کریں: رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا۔ (پروردگار' ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا...... سورۃ بنی اسرائیل' آیت 23)

حضرت عیسیٰؑ "بچوں والے" اس خاندان کے فرد تو واقعی نہیں تھے جس کا اوپر زمرہ iii میں ذکر آیا ہے' مگر ان کی ایک والدہ تھی جس نے انہیں جنم دیا اور اپنے دودھ سے ان کی پرورش فرمائی۔ اور بارہ سال تک ان کی نگہداشت کرتی رہی۔ چنانچہ قرآن میں آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا ۝ وَّبَرًّا ۢ بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا۔ (اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ جب تک زندہ رہوں نماز پڑھتا اور زکوۃ دیتا رہوں اور (مجھے) اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا بنایا ہے اور سرکش و بدبخت نہیں بنایا۔ سورۃ مریم آیات 32,31)

جسٹن مارٹیر' آئرینئس اور ملٹن' حضرت مریمؑ کو "حوا ثانی" قرار دیتے ہیں۔ اور حوا کی نافرمانی کا ذکر مسیحی ایمانیات کا مسلّمہ جزو ہے۔ (ملاحظہ ہو II کرنتھیون 3:11؛ تیمتھیوس کے نام پولس رسول کا پہلا خط 14:2 کتاب پیدائش 6:3-)۔ ان آیات میں کہا گیا ہے کہ آدم نے فریب نہیں دکھایا بلکہ عورت فریب کھا کر گناہ میں پڑ گئی۔

انجیل میں مریم کا نام' بطور صیغہ واحد غائب آیا ہے جس کے معنی ہیں "کڑواہٹ" اور یہ خوش اطواری اور شیرینی کا متضاد (Antonym) ہے' اس کے بارے میں سرکشی کا تاثر دینا مقصود ہے۔ جیسا "گنتی" کے باب 12 اور "استثنیٰ" کے باب 24 آیت 9 میں دیا گیا ہے۔

دوسری طرف قرآن نے حضرت مریم کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔ مثلاً سورۃ المآئدہ کی آیت 75 میں ارشاد ہے...... "مَاالْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلاَّ رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ۔ (مسیح ابن مریم تو صرف پیغمبر تھے۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے۔ اور ان کی والدہ (مریمؑ) خدا کی ولی اور سچی ولی تھیں۔) ان کے تین خصوصی امتیازات تھے۔

پہلا یہ کہ وہ ہارونؑ کے شجرۂ نسب میں بلند مقام رکھتی تھیں اور ان کے بارے میں

خدا کا وعدہ تھا کہ خاندانِ ہارون کو برکت عطا کرے گا۔ دوسرا یہ کہ وہ ایک راستباز خاتون تھیں جن سے خدا ہمکلام ہوا تھا۔ اور تیسرا یہ کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ تھیں' جنہوں نے ان کے رحم میں پرورش پائی اور ان کا دودھ پیا۔ (لوقا 27:11) اس لیے وہ اپنے بیٹے کی طرف سے انتہائی محبت وعقیدت کی مستحق تھیں۔ جب وہ طویل جدائی کے بعد (عیسیٰؑ) کے بھائیوں کے ہمراہ ان سے ملاقات کے لیے پہنچیں تو وہ اس وقت ایک بڑے مجمع میں تھے۔ توقع تو یہی کی جاتی تھی کہ یہ عظیم بیٹا والہانہ محبت واحترام کا مظاہرہ کرتا اور پورے مجمع کو اپنی عظیم ماں کی آمد کی اطلاع دیتا اور ان کا شایانِ شان لفظوں میں تعارف کراتا۔ مگر یہ سن کر کسے یقین آسکتا ہے کہ بیٹے نے ماں اور اپنے بھائیوں کو سب کے سامنے ڈانٹ دیا۔ کیا یہ طرزِ عمل ایسی شخصیت کے شایانِ شان ہوسکتا تھا جسے پوری انسانیت کے لیے ایک مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے؟

انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کی مبینہ تنگ مزاجی اور بے اصولی' کی ایک اور مثال یہ بیان کی گئی ہے کہ پطرس ان کا پسندیدہ ترین شاگرد تھا' اتنا پسندیدہ کہ اس سے انہوں نے یہ کہا...... ''اور میں بھی تجھ سے کہتا ہوں کہ تو پطرس ہے اور میں اس پتھر پر اپنا کلیسا بناؤں گا اور عالمِ ارواح کے دروازے اس پر غالب نہ آئیں گے۔ میں آسمان کی بادشاہی کی کنجیاں تجھے دوں گا اور جو کچھ تو زمین پر باندھے گا وہ آسمان پر بندھے گا اور جو کچھ تو زمین پر کھولے گا وہ آسمان پر کھلے گا'' (متی 18:16' 19) اور پھر جلدی ہی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ اسی پطرس سے کہہ رہے تھے۔ ''اے شیطان میرے سامنے سے دور ہو۔ تو میرے لیے ٹھوکر کا باعث ہے کیونکہ تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے'' (متی 23:16)

مسیحی دانشور طبقے کو اس امر کا کھلے دل کے ساتھ اعتراف کر لینا چاہئے کہ مصنفینِ انجیل نے عظیم نجات دہندہ سے ناخوشگوار طرزِ عمل منسوب کر کے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ قرآن نے حضرت عیسیٰ پر ان مصنفین کی غلط الزام تراشی پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وہ نہ تو اپنی والدہ سے تنگ مزاجی کے ساتھ پیش آئے' نہ اپنے شاگردوں اور نہ اپنے بھائیوں سے روکھے پن کے رویّے کے مرتکب ہوئے تھے۔ اور وہ اپنی والدہ سے ہمیشہ خندہ پیشانی اور عقیدت و احترام سے پیش آتے رہے۔ وہ اتنے عاقبت نا اندیش ہرگز نہیں ہوسکتے تھے کہ آسمانوں کی بادشاہت کی چابیاں پطرس کے حوالے کرنے کو تیار

ہو جاتے اور اگلے ہی لمحے اسے دھتکار دیتے کہ ''چل پیچھے ہٹ اے شیطان' تو میرے لیے باعث آزار ہے۔'' آسمانی باپ کے لیے اس وقت کتنا بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا ہو گا جب اس تک یہ دو متضاد بیانات پہنچے ہوں گے۔ وہ سوچتا ہو گا کہ کیا اسے آسمانی بادشاہت کی چابیاں اس کے حوالے کر دینی چاہئیں؟ اور کیا تمام انسانوں کی تقدیر شیطان کو سونپی جا سکتی ہے؟

ایک مارِ آستین حواری جو بارہ معتبر ترین شاگردوں میں سے تھا' اس کا نام یہودا اسقریوطی (Judas Iscariot) تھا' اس نے چاندی کے تیس سکے (سینٹ) وصول کر کے یسوع مسیح کو دشمنوں کو پکڑوا دیا (متی 26:21؛ مرقس 14:18؛ لوقا 22:47 اور یوحنا 3:18) اور ہمیں بتایا جاتا ہے کہ آخری دن وہ انصاف کے تخت پر بیٹھ کر قبیلوں کی قسمت کا فیصلہ کرے گا۔

یہاں یہودی فقیہوں اور کلیسا کے پادریوں سے ایک سادہ سا سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر یعقوب' اپنے زندگی بھر کے مبیّنہ دھوکوں اور فریب کاریوں سمیت' جو اس نے اپنے بھائی' اپنے معمر باپ' اپنے سُسر اور برادرانِ نسبتی کے ساتھ کیں' جنت میں جا سکتا ہے تو ایک عام قسم کا گنہگار کیوں نہیں جا سکتا؟ اگر پطرس اور یہودا اسقریوطی' آسمان پر انسانوں کی قسمتوں کا فیصلہ کریں گے' باوجودیکہ اول الذکر کو خود مسیحؑ نے شیطان کہا تھا تو پھر مسیحیت میں اخلاق کی کیا قدر و قیمت رہ جاتی ہے؟۔

اس کے برعکس قرآن مجید نے ان سب رسوا کن الزام تراشیوں کی مذمت کرتے ہوئے ان کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے اور تمام انبیاء اور ان کی قابل احترام ماؤں بشمول حضرت مریمؑ کی عزت و تقدس کو بحال کیا ہے' اس نے مریم کو برگزیدہ خاتون کہا اور ان کے نام ''Mariam'' (جس کو زہر آلود کر دیا گیا تھا) کو تبدیل کر کے ''Maryam'' کر دیا جس کے معنی ہوتے ہیں ''اچھی فطرت کے مطابق افزائش پانے والی۔'' قرآن ان کے بارے میں فرماتا ہے وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ (اس کی والدہ (مریم) خدا کی ولی اور سچی فرمانبردار تھی۔ سورۃ المآئدہ آیت 75)۔ وہ ''موٹی یا بدنما عورت'' نہیں تھی بلکہ زہد و تقویٰ کا مجسمہ تھی۔ سورۃ آلِ عمران کی آیات 36 اور 37 میں اس کی عبادت گزاری کا جس طرح ذکر آتا ہے وہی اس کی حقیقی صورت تھی۔ انجیلوں میں اس سے اس کے بیٹے کے سلوک کا جو ذکر آتا ہے' قرآن نے اس کی بھی سختی سے تردید کی اور بتایا: وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا۔ (اور مجھے اپنی ماں

کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا (بنایا ہے) اور سرکش اور بدبخت نہیں بنایا ہے......(سورۃ مریم آیت 32)

قرآن نے حضرت مریمؑ پر یہودیوں کی طرف سے لگنے والے الزامات کی نہ صرف تردید کی ہے بلکہ انجیلوں میں پائے گئے اسقام بھی دور کیئے اور ان کی ذومعنویت اور پیچیدگیوں سے بھی پاک کر دیا ہے۔

کرسمس یا عید میلادِ مسیح

دنیائے عیسائیت میں ہر سال ماہ دسمبر میں حضرت عیسیٰؑ کا یوم ولادت بڑی شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ اور بڑے اہتمام سے ''کرسمس ٹری'' سجایا جاتا ہے۔ کیا واقعی خدا کے ہاں ''بیٹا'' اسی ماہ میں تولّد ہوا؟ اس کا کسی کو بھی علم نہیں ہے۔ جب کسی بادشاہ یا حکمران کے گھر میں بیٹا ہوتا ہے تو پورے ملک میں اس کی دھوم مچ جاتی ہے اور بیرونی دنیا کو بھی وارثِ تخت کی ولادت سے مطلع کر دیا جاتا ہے۔ 20ویں صدی کے وسط میں شہنشاہ ایران محمد رضا پہلوی کے تخت کا وارث پیدا ہوا تو ایران میں قومی سطح پر اس کا یوم ولادت منایا گیا امریکہ کے آنجہانی صدر کی اہلیہ جیکولین کینیڈی نے ایک بیٹے کو جنم دیا تو اس کی پیدائش سے قبل اس کے ''صحیح وقت'' اور تاریخ کا بھی دنیا بھر میں اعلان کیا گیا۔ لیکن مقامِ حیرت ہے کہ تخلیق کائنات کے بعد خدا کے ہاں پہلی بار ''بیٹا'' پیدا ہوا تو کسی کو اس کی پیدائش کے بالکل ''صحیح وقت' دن اور تاریخ کا بھی دنیا بھر میں اعلان کیا گیا۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ تخلیق کائنات کے بعد خدا کے ہاں پہلی بار ''بیٹا'' پیدا ہوا تو کسی کو اس کی پیدائش کے وقت' دن اور مہینے' حتیٰ کہ سال کا بھی صحیح علم نہیں ہے۔ خواہ آپ تاریخ کی کتنی ہی معتبر کتابوں کی ورق گردانی کر لیجئے کسی بھی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ بہرحال جب وہ پیدا ہو ہی گیا تو ''خداوند عالم نے اسے کسی پارلر یا باغ عدن کے محل میں نہیں بلکہ پرانے کپڑے میں لپٹا اور چرنی (Manger) میں پڑا ہوا پایا کیونکہ کسی سرائے میں ماں بیٹے کو جگہ نہیں ملی تھی'' (لوقا 7:2)

عید میلاد کی تیاریاں

عیسائی ممالک میں کرسمس کی تیاریاں' عیدِ میلادِ نبی کی تیاریاں' اصل تاریخ سے

بہت پہلے شروع ہو جاتی ہیں۔ گلیوں، سڑکوں، بازاروں، مارکیٹوں، باغوں اور سرکاری و نجی عمارتوں کو سجانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، برقی قمقموں سے راتوں کو دنوں کی طرح روشن کر دیا جاتا ہے۔ کرسمس ٹری بنانے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے، ہر عیسائی گھرانے میں کرسمس ٹری بنتا ہے اس کی سجاوٹ میں ہر چھوٹا بڑا فرد حصہ لیتا ہے۔ دوسری طرف بار رومز، شراب خانوں، نائیٹ کلبوں اور سینما گھروں میں فحش فلموں کی نمائش بھی انہی تقریبات کا حصہ ہوتی ہے۔ والدین خوش خوش اپنے بچوں سمیت گروہ در گروہ ایسی اخلاق باختہ فلمیں دیکھنے جاتے ہیں، انہیں اس موقع پر یہ خیال ہی نہیں رہتا کہ کچے ذہنوں پر ان کے کتنے تباہ کن اثرات پڑیں گے۔ کلیساؤں میں منعقد ہونے والی خصوصی تقریبات میں شرکاء کو باور کرایا جاتا ہے کہ آج رحمتوں کی بارش ہو رہی ہے جو ان کے سال بھر کے گناہوں اور جرائم کو دھو ڈالے گی۔

ذہنوں میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یسوع مسیح کے یوم پیدائش پر انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کیا یہی مناسب طریقہ ہے کہ ہر وہ کام بے دھڑک ہو کر کیا جائے جسے انہوں نے گناہ قرار دیا تھا اور اس سے بچنے کے لیے سخت تاکید کی تھی۔

شعور اور بے شعوری میں تصادم:

عوام بعض اوقات بخشش کے آسان نسخوں کی مسلسل الاپ شروع کر دیتے ہیں اور کثرتِ تکرار کی وجہ سے وہی ان کا عقیدہ بن جاتا ہے، لیکن شعور کبھی کبھار غالب آ جاتا ہے اور خوش فہمی کی عوامی دیوار میں شگاف ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کرسچین کیلنڈر میں 1642 سے 1652 تک ''پیوریٹین ازم'' (پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے ایک طبقہ) کو عروج حاصل رہا جنھوں نے عید میلاد مسیح کے نام ہونے والے بے ہودگیوں کی سختی سے ممانعت کر دی۔ اور ایسا کرنے والوں کی گرفتاریوں اور انہیں قید و بند میں ڈالنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس طرح ان کا زور و شور کچھ عرصہ کے لیے تھم گیا۔ مگر تاریخِ عیسائیت مذہبی اصولوں کی تذلیل اور عروج کے واقعات سے پُر ہے۔ ''اعلیٰ چرچ''

"وسیع چرچ"، "کٹر چرچ" اور "انتہا پسند چرچ" کی کشمکش میں عوامیت ایک بار پھر جیت گئی اور آج ہم کرسمس کی تقریبات میں انہیں حرکتوں کا دور دورہ دیکھ رہے ہیں جن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں کو روکا تھا۔

مسیحی سکالرز کا موقف:

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ 25/دسمبر کو تولد نہیں ہوئے تھے جس کا اعتراف 20ویں صدی کے مسیحی سکالرز نے بھی کر لیا ہے۔ قرآن نے یہ بات چودہ سو سال پہلے ہی کہہ دی تھی۔ جیمز ہیسٹنگز نے اپنی لغت "Dictionary of Christ and Gospels" میں لکھا ہے کہ "کرسمس اور ظہور عیسیٰ کی یاد میں منایا جانے والا 6 جنوری کا تہوار "EPIPHANY"....... ایسٹر اور پینٹی کوسٹ کے بہت بعد منائے جانے لگے تھے اور غالباً 300 عیسوی تک یہ بالکل غیر معروف تقریبات تھیں" (یہ امر قابل ذکر ہے کہ "ایسٹر" حضرت مسیح کے قبر سے اٹھائے جانے کا دن ہے جو اکیس مارچ یا بعد ازاں بدر کامل کے ظہور کے بعد آنے والے پہلے اتوار کو منایا جاتا ہے جبکہ پینٹی کوسٹ (Pentecost) حواریوں پر روح القدس کے نزول کی یاد میں منایا جاتا ہے)

"انسائیکلوپیڈیا آف امریکہ" میں لکھا ہے کہ "عیسائی مشہور شخصیات کا یوم پیدائش منانے کی بجائے ان کا یوم وفات مناتے چلے آرہے تھے۔ پانچویں صدی میں مغربی چرچ نے انہیں سورج کی پیدائش کی رسوم (Mitharic rites) جو اہل فارس منایا کرتے تھے اور سیٹرنیلیا (رومنوں کی 17/دسمبر کی تقریب مسرت جو سیارہ زحل کا یوم پیدائش منانے کے سلسلے میں منعقد ہوتی تھی) منانے کا حکم دیا۔ کیونکہ انہیں یسوع مسیح کی پیدائش کی تاریخ کا کوئی یقینی علم نہیں تھا۔ جرمن اور کلٹی (Celtic) قبیلوں میں موسم سرما کی "انقلاب شمسی" (Soltice) کی تاریخیں سال کی اہم ترین تقریبات مسرت و شادمانی سمجھی جاتی تھیں (یعنی سورج کی خط استوا سے انتہا کی تاریخیں 21/جون اور 22/دسمبر) ان قبیلوں میں خوشی کی سب سے بڑی تقریب یُول (YULE) ہوتی تھی۔ عیسائیوں نے جرمن اور کلٹی کی تینوں خوشی کی تقریبات منانا شروع کر دیں۔ چنانچہ آج ان کی بہت سی تقریبات قبل از ولادتِ

مسیح کے واقعات کی یادگار ہیں۔ ''سیٹر نیلیا'' رومنوں کا جشنِ مسرت ہوتا تھا جو دسمبر کے وسط میں بے پناہ جوش وخروش سے منایا جاتا تھا''

چیمبرز انسائیکلو پیڈیا (نیو ایڈیشن) میں ''کرسمس'' کے عنوان سے ہمیں یہ عبارت ملتی ہے: ''مسیح کی پیدائش کے دن اور مہینے کے بارے میں ہمارے پاس کوئی مستند روایت موجود نہیں اور سال (سنہ) کے سلسلے میں بھی ویسا ہی ابہام پایا جاتا ہے۔ سینٹ کلیمنٹ آف الیگزینڈریا کے حسابی تخمینوں کے مطابق مہینہ اپریل یا مئی بنتا ہے۔ بعض ایسی تاریخیں انجیل کے اس بیان سے مطابقت رکھتی ہیں کہ گڈریے رات کو اپنے ریوڑوں کی نگرانی کر رہے تھے' لیکن 25/دسمبر' اس بیان سے میل نہیں کھاتا کیونکہ جوڈا کے پہاڑی علاقے میں یہ بے حد سردی اور بارشوں کے دن ہوتے ہیں۔ مغرب میں 25/دسمبر کا انتخاب غالباً دو وجوہ کی بنا پر کیا گیا: پہلی وجہ یہ کہ ہپولیٹس' ٹارٹولین اور فلکوشین کیلنڈر نے حضرت عیسیٰؑ کو ''مصلوب'' کرنے کی تاریخ 25/مارچ بتائی (جو' جولیس سیزر کیلنڈر میں سورج کے خط استوا کو قطع کرنے کا دن ہوتا ہے)' یا محض اندازے سے اسے تخلیقِ کائنات کے یوم سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 25/مارچ کو مصلوب کیا جانا قرین قیاس نہیں ہے لیکن چرچ کے حکام نے رومن مذہبی شخصیات کے حساب کتاب سے متاثر ہو کر اس تاریخ پر صاد کر دیا''

''ایام کرسمس'' کا انتخاب غالباً اس خیال کے تحت کر دیا گیا کہ ''راس الجدی'' (Winter solstice) کو چونکہ سال کا نقطۂ تغیّر مانا جاتا ہے اور تمام چیزیں سردیوں کے خوابِ مرگ کے بعد نئی زندگی اور نئی سرگرمیوں کی تیاریاں شروع کر رہی ہوتی ہیں اس لیے رومنوں کا تہوار 25/دسمبر کو منایا جاتا تھا۔ کلٹی اور جرمن قبائل قدیم زمانے سے اس موسم کو تعظیم وتکریم کا موسم سمجھتے تھے۔ سکنڈے نیویا کے قدیم باشندوں کا عقیدہ تھا کہ تمام دیوتا 25/دسمبر کو زمین پر اترتے ہیں اور 6/جنوری تک وہ انسانوں کی قسمتوں کو بدلنے کی تدابیر کرتے رہتے ہیں۔ ان دنوں کے بارے میں اس کے علاوہ بھی متعدد قدیم عقائد اور رسوم تھیں جو عیسائیت کے اندر راہ پا گئیں۔ کرسمس کی شام کو لکڑی کے لمبے لٹھے (Yule log) کو لگائی جانے والی آگ لتھوانیا کی ایک لوک داستان میں سے لی گئی ہے۔ ''گھروں کو سجانا''

مشرکوں اوربُت پرستوں (Pangans) کی رسوم سے لیا گیا ہے۔ اکاس پودا (Mistletoe) قدیم مصری پادریوں کا ایک مقدس پودا ہوا کرتا تھا۔ اس موقع پر تحائف کا تبادلہ رومنوں سے لیا گیا ہے جبکہ انگلینڈ میں کرسمس ٹری ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں اس کے جرمن شوہر کی وساطت سے متعارف ہوا (دیکھئے: ایوری مینز انسائیکلوپیڈیا' نیو ایڈیشن1958)۔

جب یوم ولادت منانا' شرک سمجھا جاتا تھا

''حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی صحیح تاریخ نہ تو انا جیل کی گواہی سے متعین ہوسکتی ہے اور نہ کسی مضبوط روایت سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ عیسوی عہد کی ابتدائی تین صدیوں کے دوران چرچ کی طرف سے یوم ولادت منانے کی سخت مخالفت کی جاتی رہی کیونکہ اسے مشرکوں اور بت پرستوں (Pagans) کی رسم سمجھا جاتا تھا۔ انگلستان میں ظہور عیسیٰؑ کے سلسلے میں ہونے والی چند تقریبات ''اپی فینی'' میں اگرچہ یوم ولادت کے شامل ہونے کا بھی کچھ نہ کچھ سراغ ملتا ہے' اس کے باوجود راسخ العقیدہ (Puritans) طبقے کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی رہی۔ 1642 سے 1654 تک اس عنوان سے چرچ سروسز اور جشن کی ممانعت کے لیے متعدد احکامات جاری ہوئے'' (ملاحظہ کیجئے ''Collier's Encyclopaedia'')

''انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا'' میں کرسمس کے زیر عنوان ہمیں یہ عبارت ملتی ہے:

''مرقس کے مطابق تعلیماتِ مسیح کا آغاز حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور ان کے بچپن کے واقعات سے نہیں ہوتا بلکہ ان کے بپتسمے سے ہوتا ہے۔ کلیسائے عظمٰی نے کرسمس کو ''اپی فینی'' کے بہت بعد میں جا کر اختیار کیا...... دوسری صدی میں پیدائشِ مسیح کی تاریخ کے ضمن میں بہت سی قیاس آرائیاں ہوتی رہیں جن کا کلیمنٹ آف الیگزینڈریا نے' اس صدی کے اواخر میں ذکر کیا ہے' اور ان کو توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی قرار دے کر ان کی سخت مذمت کی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ بعض وقائع نگاروں نے تاریخ پیدائش' عہد آگسٹس کا 28واں سال اور 25واں دن بتائی ہے۔ کچھ دوسروں نے 25/اپریل کی تاریخ

کا اندازہ لگایا ہے۔ کلیمنٹ نے خود 17/ نومبر اور سال ''3 قبل مسیح'' بتایا ہے۔ بعض لوگ بدھ کا دن' بعض جمعہ اور بعض اتوار کا دن اور 28/ مارچ بتاتے ہیں۔ کرسمس' چرچ کے اولین تہواروں میں شامل نہیں تھی اور پانچویں صدی سے پہلے اس پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا تھا کہ کیلنڈر میں اس کے لیے کون سی تاریخ مقرر ہونی چاہیے' کیا 6/ جنوری ہو' 25/ مارچ یا 25/ دسمبر ہو؟ مسیح کی تاریخ پیدائش ہمیشہ متنازعہ رہی تاہم جب آبائے کلیسا نے 349 سن میں اس یوم کو منانے کا فیصلہ کر لیا تو انہوں نے بڑی سوچ و بچار کے بعد موسم سرما کے سب سے چھوٹے دن کا انتخاب کیا جو لوگوں کے ذہنوں میں گہرے طور پر پیوست تھا اور ان کا اہم ترین تہوار تھا...... اس کی دوسری پیدائش (بپتسمہ) اس کی پہلی پیدائش کی بہ نسبت زیادہ مشہور ہوئی کیونکہ اس پر خداوند عالم خود اس کے باپ کے طور پر ظاہر ہوا' جبکہ وہ اپنی پہلی پیدائش پر فرضی طور پر یوسف نجار سے منسوب تھا۔ جو ہستی آسمان سے بہ آواز بلند کوئی اعلان کرتی ہے وہ اس آدمی سے زیادہ پُر وقار ہوتی ہے جو زمین پر رینگتا ہے اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے''

''کیتھولک انسائیکلو پیڈیا'' میں لکھا ہے: ''مسیح کی تاریخ پیدائش معلوم کرنے میں اناجیل سے کوئی مدد نہیں ملتی، ان میں جو تاریخیں دی گئی ہیں ان پر متضاد دعوے استوار ہوتے ہیں۔ مردم شماری سردیوں میں کرانا' ناممکن ہوتی' پوری آبادی کو حرکت میں نہیں لایا جاسکتا تھا۔ پھر سردیوں ہی میں اس کا منعقد ہونا ضروری تھا کیونکہ اس کے لیے صرف کھیتوں میں کام معطل کرانا پڑتا۔ لیکن ''لمپس'' نے صفحہ 219 پر لکھا ہے: سال کا کوئی بھی ایسا مہینہ نہیں ہے جس کے بارے میں بڑے بڑے معتبر لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہو کہ حضرت مسیح نے بس اسی مہینے میں جنم لیا ہے''۔

انسائیکلو پیڈیا بائبلیکا میں زیرِ عنوان ''NATIVITY'' میں لکھا گیا ہے:۔

اناجیل جدید میں سے صرف متی اور لوقا نے مسیح کی پیدائش اور بچپن کا کچھ تذکرہ کیا ہے لیکن اس سلسلے میں دونوں کے مندرجات میں تضاد اتنا زیادہ ہے کہ انہیں ہم آہنگ کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ متی کی مبہم اور غیر واضح عبارتیں شارحین کو چکرا کر رکھ دیتی ہیں۔ واقعات کے بارے میں تاریخ وار بیانات کو سمجھنے اور ان کی گتھیوں کو سلجھانے میں کئی

صدیاں بیت چکی ہیں لیکن کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ یہاں ہم ان کا صرف اشارتاً تذکرہ کرنے پر اکتفا کریں گے۔ جب انجیلِ متی پیدائشِ مسیح کو ہیروڈ ''دی گریٹ'' کے عہد میں اور اس کے جانشین آرچیلیس (Archilius) کی مصر سے واپسی کے ساتھ جوڑتی ہے تو اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ ''پیدائش'' اس سے چند سال قبل ہوئی ہوگی۔ جہاں تک فلسطین میں آگسٹس کے حکم سے ہونے والی مردم شماری کا تعلق ہے وہ گورنر شام ''پی سلپشس قیرینئس'' نے کرائی جو 6 عیسوی میں آرچیلاس کی معزولی سے قبل ممکن ہی نہیں تھی اور اس امر واقعہ کی تصدیق یہودی مؤرخ جوزیفس نے کی ہے۔ جہاں تک لوقا کے بیان کا تعلق ہے' اس کے مطابق قرینئیس کے حکم سے فلسطین میں مردم شماری 6 عیسوی سے قبل نہیں ہوسکتی تھی۔ تاہم لوقا کا بیان نہ صرف متی کے بیان سے متصادم ہے' بلکہ خود اس کے اپنے موقف سے بھی متصادم ہے کیونکہ وہ اپنے بیان کے ابتدائی حصے (1:5) میں اس واقعہ کو یہودیوں کے بادشاہ ہیروڈ کے زمانے میں وقوع پذیر ہوتا ہوا بتاتی ہے جبکہ دونوں واقعات کے درمیان 10 سال سے زیادہ کا فرق ہے۔ لہٰذا ہم پیدائشِ مسیح کی تاریخ کے بارے میں کسی حتمی اور قابل اعتبار نتیجے پر نہیں پہنچتے۔ اناجیل' ''یوم'' ولادت کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہتیں۔ چرچ نے محض کسی اساطیری مماثلت کی بنا پر اس کا تعین کر دیا ہے''

بشپ بارنیز لکھتا ہے: ''مزید برآں یسوع مسیح کی ولادت کے بارے میں ایسی کوئی مستند روایت موجود نہیں ہے کہ وہ واقعی 25 دسمبر کو پیدا ہوئے تھے۔ اگر ہم لوقا کی انجیل میں بتائے گئے واقعہ پیدائش پر اعتبار کرلیں تو اس کے یہ الفاظ: ''چرواہے بیت اللحم کے قریب اپنے ریوڑ کی نگرانی کر رہے تھے'' یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مسیح کی پیدائش سردیوں کے موسم میں نہیں ہوئی۔ کیونکہ جودیا کے پہاڑی علاقے میں رات کو ٹمپریچر اتنا کم ہو جاتا ہے کہ برفباری ہونا ایک عام بات ہے۔ بہت سارے بیانات اور حمایت و مخالفت میں دیئے گئے دلائل کے بعد 300 عیسوی میں ہمارے کرسمس کا دن تسلیم کرلیا گیا ہے۔'' بشپ بارنیز نے طویل بحث کے بعد کہا کہ 25 دسمبر' فارس کی روایات سے لیا گیا ہے۔ متھرا' ناقابل تسخیر سورج کا دیوتا ہے اور اس کے جشن کے لیے وہی دن موزوں ہوسکتا ہے جب سردیوں میں تقلبِ شمسی (Winter

Solstice) کے بعد سورج واضح طور پر اپنی طاقت کا اظہار کرنے لگتا ہے۔'' (Barnes: Rise of Christianity page 79)

یہ انکشاف بڑا اضطراب انگیز ہے کہ حضرت عیسیٰ اس تاریخ سے' جس سے ہم ان کی پیدائش کے دن شمار کرتے ہیں' چار سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ان کی پیدائش سے صدیوں بعد تک کسی نے ان کے یوم پیدائش کے تعین کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ حتیٰ کہ 526ء میں ایک رومی راہب ڈیانسٹیکس ایگزیجیکس (Dionysuis Exiguis) نے کچھ حساب کتاب کیا مگر وہ چار سال' ادھر اُدھر کر گیا۔ اس نے روم کے سالِ تاسیس کے حساب سے ولادتِ مسیح کا سال 754 (A.U.C.) ''دریافت'' کر لیا۔ لیکن ''ہیروڈ دی گریٹ'' جس نے بیت اللحم میں بے شمار بے گناہ انسانوں کو قتل کیا تھا اپریل 750 میں مر گیا۔ چنانچہ اس کی موت کے حوالے سے حضرت مسیحؑ کا یوم پیدائش سال 749 کے اختتام سے چند مہینے قبل یا بعد بنتا ہے۔

خلاصہ:

(1) ابتدائی دور کے عیسائی کرسمس کی تقریبات سے بالکل ناواقف تھے جیسے کہ قرآن کہتا ہے: مَالَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ' اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا۔ (اس بات کا نہ انہیں کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا' بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے وہ محض جھوٹ کہتے ہیں......سورۃ الکہف' آیت 5)

(2) چونکہ انہیں یومِ ولادت کے بارے میں کوئی یقینی علم نہ تھا اس لیے انہوں نے اہلِ فارس کے خدائے نُور (روشنی) مسراز (Mithras) کے یوم پیدائش کو اپنا لیا۔ جبکہ قرآن کہتا ہے: قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ۔ (کہو ''اے اہل کتاب' اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور ''سَوَاء

السَّبِیل "سے بھٹک گئے......سورۃ المآئدۃ آیت 77)

(3) اناجیل سے ولادتِ مسیح کی صحیح تاریخ کا تعین، ممکن نہیں ہے۔ جیسے کہ قرآن کہتا ہے: وَمِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْآ اِنَّانَصَارٰی اَخَذْنَا مِیْثَاقَھُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوْا بِہٖ۔ (اسی طرح ہم نے ان لوگوں سے پختہ عہد لیا تھا جنہوں نے کہا تھا کہ ہم "نصاریٰ" ہیں، مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ انہوں نے فراموش کر دیا......سورۃ المآئدۃ آیت 14)

(4) عیسائیوں نے اپنے سے پہلے زمانے کے مشرکین کی رسوم اور طور طریقے مستعار لے لئے۔ یُضَاھِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ (یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں، پہلے کے کافر بھی اسی طرح کی باتیں کہا کرتے تھے......سورۃ التوبۃ آیت 30)

(5) پہلے دور کے عیسائیوں کی طرف سے مشرکین اور بُت پرستوں کی رسوم منانے کی سخت مخالفت ہوا کرتی تھی (1642 تا 1652 ان کی رسوم منانے والوں کے لئے سزا مقرر تھی)۔ اس سلسلے میں قرآنی فیصلہ یہ ہے: ھٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَااتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اٰلِھَۃً ؕ لَوْلَا یَاْتُوْنَ عَلَیْھِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَیِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا۔ (ان ہماری قوم کے لوگوں نے اس کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں۔ بھلا یہ اُن (کے خدا ہونے) پر کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے۔ آخر اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوسکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے......سورۃ الکھف آیت 15)

(6) حضرت عیسیٰؑ کی تاریخ ولادت کے بارے میں متعدد تخمینے اور قیاس آرائیاں ہیں جس پر قرآن کا کہنا ہے کہ: فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَھُمْ بَیْنَھُمْ زُبُرًا ؕ کُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ۔ (تو پھر آپس میں اپنے کام کو متفرق کر کے جُدا جدا کر دیا جو چیز جس فرقے کے پاس ہے وہ اسی سے خوش ہو رہا ہے......سورۃ المومنون آیت 53) مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا ؕ کُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْن (اور نہ ہو جاؤ ان مشرکین میں سے جنہوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا ہے اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں، ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے، اسی میں وہ مگن ہے۔ سورۃ الروم آیت 32)

(7) یہ عقیدہ کہ یسوع مسیح 25/دسمبر کو پیدا ہوئے قطعی طور پر غلط ہے' اہل علم کے نزدیک یہ دن سورج کی پوجا کا دن ہوتا ہے۔

(8) یہ خیال کہ آپؑ 6/جنوری کو پیدا ہوئے' یہ بھی برف کے گولے کی طرح لڑھکتا ہوا' تصور ہے۔

(9) بعض وقائع نگاروں نے 20/مئی کا دن بتایا ہے' یہ بھی بالکل غلط ہے۔

(10) بعضوں نے 28/اپریل بتایا ہے' یہ بھی محض تُک ہے۔

(11) کلیمنٹ آف الیگزینڈریا نے 20/نومبر بتا دیا ہے۔

(12) بعض لوگ بدھ کا دن بتاتے ہیں۔

(13) بعض اتوار کا گمان ظاہر کرتے ہیں۔

(14) بعضوں نے جمعہ کے دن پر اصرار کیا ہے۔

(15) بعض ناآزمودہ کاروں نے 28/مارچ بتایا ہے۔

(16) حضرت مسیح کی ولادت کی صحیح تاریخ' صحیح مہینہ اور صحیح سال کبھی تسلی بخش طور پر نہیں طے ہوا۔

(17) حضرت مسیح کے یوسف نجار کی صُلب سے پیدائش کے دعویٰ پر کبھی توجہ نہیں دی گئی بلکہ اسے مسترد کر دیا گیا ہے۔

(18) اُن کی پیدائش دوم (یوحنا کے ہاتھوں بپتسمہ دیا جانا) معقول تو ہے مگر یہ بات عملاً ناقابل توجہ رہی ہے۔

(19) اگر وہ واقعی بپتسمے کے روز پیدا ہوئے تھے تو پھر سوال یہ ہے کہ دنیائے عیسائیت' یوسف نجار سے ان کی پیدائش کی یاد کیوں مناتی ہے؟

(20) اگر ان کی دو پیدائشیں تھیں' ایک یوسف نجار سے اور دوسری بپتسمے کے وقت خدا سے تو عیسائی یہ بات کیوں مانتے ہیں کہ مریم روح القدس کے بچے سمیت پائی گئی قبل اس کے کہ (یوسف اور مریم) اکٹھے ہوئے۔ (متی 18:1)

(21) لُوقا کا بیان نہ صرف متی سے متصادم ہے' بلکہ خود اس سے بھی متصادم ہے۔ جبکہ اس کے ابتدائی بیان (5:1) کے مطابق یہ واقعہ یہودیوں کے بادشاہ ہیرود کے زمانے

میں ہوا جو کہ ولادت مسیح سے چار سال قبل فوت ہو گیا تھا۔

(22) ولادت مسیح کے دن' تاریخ' مہینے اور سال کے بارے میں عیسائی علما اور فضلاء میں مفروضوں اور اٹکل پچوؤں کی بہتات ہے۔ ان کی قیاس آرائیاں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

ولادتِ مسیح کے بارے میں قرآنی فیصلہ

اس پس منظر میں اب قرآن' معجز بیان کی سچی وحی سُنیے: ''ان (عیسائیوں) کے پاس' اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے اور نہ ان کے آباؤ اجداد کے پاس تھا......اور وہ جو کچھ کہتے ہیں ایک کذب بیانی کے سوا کچھ نہیں ہے''۔(مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ...... اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا......سورۃ الکھف آیت 5)' قرآن نے یہ نادر واقعہ چودہ سو سال پہلے بتا دیا تھا' جسے مسیحیوں نے 20ویں صدی میں آکر تسلیم کیا ہے۔یعنی یہ دعویٰ کہ حضرت عیسیٰ 25/ دسمبر کو یا ''ایک سن عیسوی'' میں پیدا ہوئے' قطعاً غلط ہے۔وہ دراصل اس سے چھ سال قبل پیدا ہو چکے تھے۔قرآن نے دو سورتوں میں عیسائیت پر بحث کی ہے۔جس کے مطابق تاریخِ عیسائیت دو ادوار میں منقسم ہے۔عیسائی اپنے پہلے دور میں تہہ خانے میں چھپے ہوئے تھے' کیونکہ ان کے مخالفین جو اپنے جاہ وحشم کے لحاظ سے اپنے عروج پر تھے' ان پر شدید مظالم ڈھا رہے تھے لیکن اپنے اس دور مظلومیت میں وہ صرف ایک خدا کی عبادت کیا کرتے تھے۔قرآن کہتا ہے کہ ابتدائی دور کے حقیقی اہل علم نے جعلی دعویداران مسیحیت سے کہا:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (آخر اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوسکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے ......سورۃ الکھف آیت 15)

راہِ حق پر چلنے والے لوگ تین سو سال تک غاروں میں پناہ گزیں رہے' اس عرصے میں عیسائیت بھی گوشہ نشین رہی تاوقتیکہ شہنشاہ روم'' کانسٹینٹائن دی گریٹ'' نے عیسائیت قبول کر لی۔یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ 325 عیسوی میں دائرۂ عیسائیت میں داخل ہوا' اس کے ساتھ ہی عیسائیوں کا تہہ خانوں میں چھپنے کا زمانہ ختم ہوگیا۔اس ''(325)'' میں حضرت عیسیٰ کی

زندگی کے 25 سال بھی شامل ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ ''مصلوب'' کیے جانے کے وقت ان کی عمر 31 برس تھی۔ لہٰذا مسیحی کیلنڈر میں چھ سال کا گھپلا (Miscalculation) موجود ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ جبکہ قرآن کہتا ہے:

وَلَبِثُوا فِی كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوا تِسْعًا (اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور (کچھ لوگ مدت کے شمار میں) 9 سال اوپر بڑھ گئے...... سورۃ الکہف آیت 25)۔ عیسائیت کی تاریخ جو ان ''اصحابِ کہف'' کی کہانی میں ایک زیریں رو (Undercurrent) کی طرح چل رہی ہے، اب واضح طور پر سامنے آ چکی ہے۔ ایسی کوئی روایت یا حدیث موجود نہیں ہے جو ان کے غار میں رہنے کا عرصہ، پورے تین سو سال بتاتی ہو۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ عیسائیت کو اقتدار، کانسٹینٹائن کے تبدیلیٔ مذہب کی وجہ سے نصیب ہوا اور ساتھ ہی یہ عقیدۂ تثلیث گھڑ لینے کی وجہ سے اپنی پاکیزگی سے محروم ہو گئی، یہ عقیدہ 325 عیسوی سے نافذ العمل ہوا۔ اب اس پر تقریباً اتفاق ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے مشہور یوم پیدائش سے چھ سال قبل متولد ہوئے تھے۔ (جیسا کہ بشپ بارنیز نے تسلیم کیا، اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے)

لہٰذا قرآنی فیصلے کے مطابق آجکل ہم 2004ء میں سے نہیں بلکہ 2010ء میں سے گزر رہے ہیں۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام نے 2004 سال پہلے نہیں، 2010 سال پہلے جنم لیا تھا۔ بہ الفاظ دیگر 2010 برس پہلے وہ پوتڑوں میں لپٹے اور چرنی (Manger) میں پڑے ''ننھے خدا'' نہیں تھے بلکہ چھ سالہ لڑکے تھے اور یوسف نجّار کی کارپنٹری شاپ میں کھیل رہے تھے۔ اس کے کئی ثبوت موجود ہیں:

(1) لوقا کی انجیل میں جس مردم شماری کا ذکر آیا ہے وہ سن 1 عیسوی میں کرائی گئی تھی۔ (لوقا، 12:2)

(2) ''ہیرود دی گریٹ'' سن 4، قبل مسیح میں مرا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسوی کیلنڈر غلط ہے، اس میں ایک دو یا تین سال کی نہیں بلکہ 6 سال کی غلطی ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے اس غلطی کی نشاندہی کی ہے جس کا اس کے دشمنوں کو بھی اعتراف ہے مگر وہ تمسخر کا نشانہ بننے کے خوف سے اپنے کیلنڈر کو اس غلطی سے

پاک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

(3) قرآن کا ایک اور چشم کشا معجزہ بھی ہے جو ایک نہایت اہم سوال ہے اور جو جواب چاہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ سال کے کونسے مہینے میں دنیا میں تشریف لائے تھے؟ قرآن بتاتا ہے کہ جب حضرت مریم کو دردِ زہ شروع ہوا تو وہ پناہ لینے کے لیے ایک کھجور کے سائے میں پہنچیں۔ جب درد مزید بڑھا تو وہ اس کی شدت کی وجہ سے رونے لگیں تو خدا نے حکم دیا: وَهُزِّيٓ إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (اور کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلاؤ' تم پر تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی......سورۃ مریم آیت 25) یہ آیت اس سوال پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے کہ حضرت عیسیٰ نے کس مہینے میں جنم لیا تھا۔ یہ وہ مہینہ تھا جس میں کھجوریں پکتی ہیں' یعنی......ماہ اگست تھا۔

(4) درد کی شدت کی وجہ سے کھجور کے درخت کے نیچے پہنچنا بھی اپنے اندر گہرے معانی رکھتا ہے۔ یہ کہانی دنیا کی تین عظیم مذہبی شخصیتوں زرتشت' گوتم بدھ اور ابن مریم' عیسیٰؑ سے متعلق ہے۔ مریم عیسائیت کی علامت ہیں اور سارہ اور ہاجرہ یہودیت اور اسلام کی تمثیلی شخصیات ہیں۔ ''گلتیون کے نام خط'' (Galatians) میں لکھا ہے کہ مریم کا بچے کی پیدائش کا درد مسیحیت کو درپیش مسائل کی تمثیل ہے۔ جبکہ کھجور کا درخت اور کھجوریں اسلام اور اس درد کی دوا کی علامت ہیں۔ مریم (عیسائیت) درد اور تکلیف سے دوچار ہے یعنی گمراہ کن عقائد اور وہ لغو سوالات ہیں جو وقتاً فوقتاً کھڑے کر دیئے جاتے ہیں اور مسیحی سکالرز کو چکرا کر رکھ دیتے ہیں۔ اس کا علاج کھجوریں ہیں جو کہ اسلام کی علامت ہے۔ الہامی کتابوں میں کھجور کے درخت کا ذکر عظمت اور شان کی علامت کے طور پر آیا ہے۔ اس کے سدا بہار پتے اور وافر مقدار میں لذیذ پھل اسے ایک قسم کی راستبازی اور صداقت کی مظہر بنا دیتے ہیں' (دیکھئے زبور 12:92؛ مکاشفہ 9:7)

سلیمان اعظم اپنے محبوب محمدم (محمد) کے حسن کا گیت یوں گاتا ہے:

''تیری قامت کھجور کی مانند ہے میں نے کہا کہ میں اس کھجور پر چڑھوں گا اور اس

کی شاخوں کو پکڑوں گا'' غزل الغزلات 7:7 (solomon's songs)

عیسائیت کے جملہ اضطرابات' پریشانیوں' الجھنوں اور دردوں کا مداوا کھجور کے درخت یا اسلام کے سائے میں ہے' اسے اسلام کی پکی ہوئی کھجوروں سے مطلوبہ غذائیت بھرپور مقدار میں مل سکتی ہے۔ یہ بات کوئی ہماری اختراع نہیں ہے قرآن خود دعویٰ کرتا ہے:

اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَہٗ جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَاالْاَنْھٰرُ ۙ لَہٗ فِیْھَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَہُ الْکِبَرُ وَلَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَھَآ اِعْصَارٌ فِیْہِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۗ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ۔ (کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو۔ نہروں سے سیراب کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا اور وہ عین اس وقت ایک تیز بگولے کی زد میں آ کر جھلس جائے جبکہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کمسن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں۔ اسی طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے' شاید تم غور و فکر کر سکو......سورۃ البقرہ آیت 266)

عیسائیت کا پندرہ صدیوں کا روگ صرف اسلام کا امرت دھارا استعمال کرنے سے دور ہو سکتا ہے' جیسا کہ پہلے ثابت ہو چکا ہے' انجیلیں نہ صرف ایک دوسری سے عدم مطابقت رکھتی ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک خود اپنی بھی تردید کرتی ہے۔ اب قرآن مجید کے ان الفاظ پر غور کیجئے جو حضرت مریم کو دردزہ ہونے کے دوران کہے گئے۔ ''درخت کے تنے کو اپنی طرف کھینچئے تو پکی ہوئی کھجوریں آپ پر گرنے لگیں گی۔ (سورۃ مریم آیت 25)''۔ یہاں پکی ہوئی کھجوروں یا تر و تازہ کھجوروں کے لیے قرآنی الفاظ ''رطباً جنیاً'' آئے ہیں' یہ عربی کے صرف آٹھ حروف بنتے ہیں' ان حروف کی عددی قوت (جس کی تصدیق عبرانی سکالرز بھی کرتے ہیں) 325 ہے' کانسٹنٹائن کے عیسائیت قبول کرنے کا سال بھی یہی تھا' اسی طرح مسیحیت کی تعلیمات کے خالص ہونے کی حالت (Purity) کے خاتمے کا بھی یہی سال ثابت ہوتا ہے۔ عیسائیوں نے بالکل اسی سال توحید باری تعالیٰ کا عقیدہ ترک کر کے تثلیث کا عقیدہ اختیار کیا تھا۔ قرآن نے عیسائیت کے پرانے مرض کی صحیح ترین تشخیص کی ہے یہ مرض 1655 سال پرانا ہے۔ سال کے آٹھویں مہینے' اگست میں مسیح کی ولادت ہونے کا مزید ثبوت یہ ہے کہ ''رطبا

جنیا“ کے آٹھ حروف آٹھویں مہینے (اگست) کی نشاندہی کرتے ہیں جس میں ”جودیا“ میں کھجوریں پکتی ہیں۔ اس لیے مسیحیوں کو کھجور کے درختوں کے سائے میں آجانا چاہیے جو کہ اسلام کی علامت ہیں۔ یہی حضرت مسیحؑ اور دیگر انبیاء کا اصلی مذہب ہے۔ اللہ ان کی رہنمائی فرمائے۔

حضرت مسیح کی حیات نو

رپورتاژ: یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل (UPI)

دنیا بھر کے 80 کروڑ انسان اس ہفتے (1950 کا کوئی ویک اینڈ تھا) اس سلسلہ واقعات کی یاد منا رہے ہیں جو 1900 سال پہلے رومن ایمپائر کے ایک گمنام گوشے میں رونما ہوئے تھے۔ ان واقعات نے مسیحی عقائد کو جنم دیا تھا اور ان کا واحد تفصیلی ریکارڈ چند مخصوص کتابوں میں پایا جاتا ہے جنہیں عہد نامۂ جدید (NEW TESTAMENT) کہتے ہیں۔ ماڈرن سکالرز نے ان کتابوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ جس کی بنا پر بعض زُود حس عیسائی یہ خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ کہیں عہد نامۂ جدید ساقط الاعتبار نہ ہو جائے۔ کچھ لوگوں کی رائے اس کے برعکس بھی ہے اور غالباً وہی صحیح ہے۔ ''یونین تھیالوجیکل سیمیناری'' کے پروفیسر ارنسٹ ایف سکاٹ کا کہنا ہے کہ ''مواد کے تنقیدی جائزے اور واقعات کی چھان پھٹک سے عہد نامۂ جدید کے بارے میں ہمارے بہت سے تصورات تبدیل ہو چکے ہیں لیکن اس کے دعوے کو ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ یقینی استحکام ملا ہے''۔

معروف سکالرز کو اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ مسیح ناصری فی الواقعہ ایک تاریخی شخصیت تھے اور یہ کہ ان کا اپنے عہد کے حکمرانوں کے ساتھ اختلاف محض اس بنا پر ہوا کہ وہ بندوں کے خدا کے ساتھ تعلق اور بندوں کے باہمی تعلق کے بارے میں انقلابی تعلیمات کے علمبردار تھے۔ چنانچہ انہیں سنہ 30 عیسوی کے موسم بہار کے اوائل میں ایک دن یروشلم شہر کے باہر ایک پہاڑی پر ''مصلوب'' کر دیا گیا۔ اگر یہ کہانی وہیں ختم ہو جاتی تو دنیا کو غالباً مسیح ناصری کا کوئی پتہ ہی نہ چل سکتا۔ اس صورت حال سے دوچار ہونے کے بعد ان کے پیروکاروں کی

آنکھیں کھل گئیں اور وہ صلیب پر ان کی علانیہ تذلیل کی موت دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اس جگہ سے فوراً منتشر ہونے کے بعد انہیں جہاں جہاں بھی جگہ ملی چھپ گئے۔

تھوڑے عرصہ کے بعد وہی خوفزدہ مرد اور عورتیں یروشلم واپس پہنچے اور بڑی جرأت اور یقین کے ساتھ اعلان کرنے لگے کہ مسیحؑ جی اٹھے ہیں۔ صدیوں سے اس امر کی وضاحت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ شاگردانِ مسیحؑ مردہ کے زندہ ہو جانے پر کیسے یقین کرنے لگے تھے اور ایسے عقیدے کا انسان کے حوصلے پر کیا اثر پڑتا ہے؟ اس سلسلے میں ایک تھیوری' جس کے درست ہونے پر بہت سے لوگوں کو یقین ہے' یہ ہے کہ یہ شاگرد ''اجتماعی فریبِ تصور'' (MASS-HALLUCINATION) کا شکار ہو گئے تھے۔ اس تھیوری میں ایک مشکل یہ ہے کہ یہ بے شمار شہادتوں کو نظر انداز کرتی ہے اور شاگرد پہلے خود بھی متذبذب تھے تاوقتیکہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دوبارہ زندہ شدہ مسیحؑ کو دیکھا اور ان سے باتیں بھی کیں۔ بارہویں صدی کی ایک مقبولِ عام تھیوری یہ ہے کہ مسیحؑ کا صلیب پر انتقال نہیں ہوا تھا' وہ صرف بے ہوش ہوئے تھے۔ اور مقبرے کے اندر کی ٹھنڈک پہنچنے سے جی اٹھے۔ جرمن عقلیت پسند فلسفی ڈیوڈ فریڈرک سٹراس نے یہ تھیوری قبول نہیں کی اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ ''یہ بالکل ناممکن ہے کہ جس شخص کو چوری چھپے نیم مردہ حالت میں مقبرے سے نکالا گیا ہو وہ اچانک اپنے شاگردوں کو فاتحِ موت وقبر ہونے کا تاثر دینے کے قابل ہو گیا ہو''۔ آخری تھیوری وہ ہے جسے ماہرینِ مذہبیات ''فراڈ تھیوری'' کا نام دیتے ہیں۔ اس کے مطابق شاگردوں نے دوبارہ جی اٹھنے کی کہانی خود ایجاد کی تھی۔ ڈاکٹر جان سودر لینڈ بونٹل کہتا ہے کہ اس وضاحت کو قبول کرنے کے لیے بندے کو اس بات پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ ''رسول اپنے کمالات کی عظمت کو دوام بخشنے کے لیے خوشی خوشی شہید بنتے رہے ہیں''۔ آخر میں بس ایک امکان رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ شاگردانِ مسیحؑ تاریخ کے اس انتہائی تحیر خیز واقعہ کے صرف خود ہی عینی شاہد تھے۔

یہ انتہائی دردناک کہانیاں ہیں جن کے باعث عیسائیت عرصہ سے آہ وزاری کر رہی ہے اور جنہوں نے اسے قریب قریب موت کی دہلیز تک پہنچا دیا ہے۔ اور رسولوں نے صدیوں پہلے اس کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ یسعیاہ نے یہ الفاظ کہے تھے:

''اور وہ ہراساں ہوں گے۔ ان پر غمگینی اور جانکنی طاری ہو جائے گی۔ وہ ایسے درد

میں مبتلا ہو جائیں گے جیسے عورت بچے کو جنم دیتے ہوئے تکلیف میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ وہ سراسیمہ ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھیں گے اور ان کے چہرے شعلہ نما ہوں گے'' (یسعیاہ 8:13)......''سو میری کمر میں سخت درد ہے اور میں گویا دردِ زہ میں تڑپتا ہوں جیسے عورت بچے کی پیدائش کے وقت''۔ (یسعیاہ 3:21)......''اے خداوند' تیرے حضور میں ہم اس حاملہ کی مانند ہیں جس کے وضع حمل کا وقت نزدیک آ گیا ہو' جو دکھ میں ہے اور اپنے درد سے چلاّتی ہے......اے خدا تو ہمیں اس حالت میں دیکھ ہی رہا ہے۔(یسعیاہ 17:26)

آج بھی حضرت مریمؑ (عیسائیت) درد سے کراہ رہی ہے' جیسا کہ قرآن میں آتا ہے کہ دردِ زہ اسے کشاں کشاں کھجور کے درخت تک لے گیا تو اس نے کہا: (کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام نشان تک نہ رہتا......سورۃ مریم آیت 23)

شہد کی ایک توضیحی تصویر سے لے کر نبوّت تک

یہاں ہم ایک بار پھر مکھی کے طریقہء کار کی طرف آتے ہیں۔ مکھی کو شہد سازی کے ضمن میں خدا نے جو الہام کیا اس کا ذکر پیچھے آچکا ہے۔ اسے پہاڑوں چٹانوں اور درختوں میں چھتے بنانے‘ ہر قسم کے پھلوں کو کھانے اور اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں پر عاجزی سے گامزن رہنے کی تلقین کی گئی ہے‘ اور اس طرح وہ ایک ایسا مشروب تیار کرتی ہے جو شفاء لِلنّاس ہے اور خدا نے اس طریق کار میں سوچنے والوں کے لیے بہت سا سامانِ غور و فکر موجود ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان دونوں آیات کے آخری الفاظ بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ مکھیوں کا چھتہ اپنی ساخت‘ کے اعتبار سے ایک محل ہوتا ہے۔ اس کی ساخت متعدد دانشمندانہ قوانین‘ مختلف سائنسی صلاحیتوں‘ کام کے انوکھے طریقوں‘ انجینئرنگ کے حیرت انگیز کارناموں‘ کیمیا دانی اور حفظانِ صحت کے اصولوں کا مظہر ہوتی ہے۔ لٰہذا قرآن اپنے ان الفاظ کے ذریعہ ایک تفکر پسند ذہن کو خواہ وہ انجینئر کا ہے‘ ریاضی دان‘ سائنسدان‘ ماہر نفسیات‘ ماہر سماجیات یا ماہر معیشت کا ہے‘ دعوت دیتا ہے کہ وہ مکھی کی دانائی پر جو اس کی جبلّت یا خدائی الہام میں مضمر ہے‘ غور کرے۔ وہ ان اصولوں کے مطابق اپنی گوناگوں صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ایک ایسی چیز تیار کرتی ہے جو نہ صرف اس کے لشکر کی خوراک ہے بلکہ متعدد وٹامنز‘ معدنی نمکیات اور متنوّع خامروں (انزائمز) پر مشتمل ایک آبِ حیات بھی ہے۔ یہ خون کی متعدد بیماریوں‘ مثلاً اس کی قلت‘ اس کے بہاؤ میں کمی بیشی‘ دل کی دھڑکنوں کی بے قاعدگیوں اور اس کی تھکاوٹ وغیرہ دور کرنے کے لیے اپنے اندر کیلشیم‘ میگنیشیم‘ فاسفورس‘ سلیکا‘ آئرن اور کاپر کے خزانے لئے ہوتا ہے۔

قرآن حکیم نے شہد کے خواص بیان کرتے ہوئے اس کے شفائی اثرات کی طرف

واضح اشارات دیئے ہیں' ساری دنیا کے ماہرین اپنی اجتماعی کوششیں بروئے کار لا کر بھی ایسی نعمت کو وجود میں نہیں لا سکتے۔ مادی دنیا میں اس معجز نما شے کی خصوصیات بتا کر' خدا نے انسان کو روحانی دنیا میں کارفرما قوانین کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور کہا ہے کہ قرآن دنیا کی تمام الہامی کتابوں میں موجود بہترین ہدایات اور پندو نصائح کا جامع اور مکمل خلاصہ ہے۔ یہ خود کو ''جو شفاء کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ انسانیت کی جملہ روحانی بیماریوں کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ قرآن کو شہد کا مثیل (Analogous) قرار دیئے جانے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح ساری دنیا کے ماہرین مل کر بھی شہد جیسی چیز کو وجود میں نہیں لا سکتے اسی طرح قرآن جیسی کتاب لانا بھی دنیا بھر کے مصنفین کے بس کی بات نہیں ہے......''وَاِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔

(اگر تمہیں اس امر پر شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے' یہ ہماری ہے یا نہیں تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ' اپنے سارے ہمنواؤں کو بلا لو' ایک اللہ کو چھوڑ کر جس جس کی چاہو' مدد لے لو' اگر سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ......سورۃ البقرہ' آیت 23)

یہ ایک ایسا نادر الظہور واقعہ ہے کہ دشمنانِ اسلام بھی اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ سر ولیم مویئر اور تسدل (Tisdal) نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ''اسلام کے مصادر و منابع'' رکھا گیا ہے ہندو پنڈتوں نے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن' ان کے ویدوں میں سے نقل کیا گیا ہے۔ ان مصنفین کے مقاصد اگرچہ معاندانہ تھے تاہم ان کا یہ الزام خود قرآن کے اس دعوے کی توثیق کرتا ہے: رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ (اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتا ہے' جن میں بالکل صحیح آیتیں لکھی ہوئی ہیں......سورۃ البیّنہ۔ آیت 2' 3) یعنی وہ صحیح ہدایات پڑھ کر سناتا ہے جو انسان کی ہدایت کے لیے ضروری ہیں' خواہ پہلے بھیج دی گئی تھیں یا نہیں' اب قرآن کی صورت میں مہیا کر دی گئی ہیں۔

شہد اور قرآن یا شہد اور نبی اکرمؐ کے مابین اور بھی کئی قریبی مشابہتیں یا مماثلتیں دریافت کی جاسکتی ہیں' یہاں ان میں سے صرف چند کا ذکر کیا جارہا ہے:۔

(الف) مکھیوں کے شہر میں' ہر کوئی اپنی ساتھی کی رفاقت میں رہتی ہے۔ اگر وہ اپنے چھتّے سے الگ ہو جائے تو مر جاتی ہے کیونکہ وہ تنہائی میں رہ ہی نہیں سکتی۔ اس شہر میں "انفرادیت" اور "اشتراکِ عمل" کے مابین ایک خاص توازن رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اسلام اپنے پیروکاروں کو اتحاد اور یگانگت کی زندگی بسر کرنے کا درس دیتا ہے جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو......سورۃ آل عمران آیت 103)......اَیْنَ مَاتَکُوْنُوْا یَاْتِ بِکُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا ......(جہاں بھی تم ہو گے اللہ تمہیں پالے گا......سورۃ البقرۃ آیت 148)...... وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ شَطْرَهٗ (اور جہاں بھی تم ہو اسی کی طرف رخ کیا کرو......سورۃ البقرہ آیت 150)

(ب) مکھیوں کا چھتہ ایک ایسا شہر ہے جس کا ہر فرد اپنی برادری (کمیونٹی) کے مفاد کے لیے قربانی دینے کو تیار رہتا ہے۔ اسی طرح قرآن کہتا ہے: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَاللّٰهِ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ۔ (اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا' اللہ کے ہاں ان کے بہت درجے ہیں اور وہی کامیاب ہیں......سورۃ التوبہ آیت 20) اور رسول اللہ کو حکم دیا گیا ہے: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (کہو میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیّت' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے......سورۃ الانعام آیت 162)

(ج) ایک چھتے میں مکھیوں کے تین درجے یا زمرے ہوتے ہیں (i) ملکہ

(ii) کارکن مکھیاں اور (iii) یعنی مکھے جو شہد بنانے کی بجائے آرام کرتے ہیں' اور صرف بھنبھناتے ہیں' یعنی نکھٹو ہوتے ہیں۔ ملکہ باقی دو کی ماں ہوتی ہے لیکن قانون سے بالاتر وہ بھی نہیں ہوتی۔ چھتے کے قواعد کی پوری پابندی کرتی ہے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کو اسی اصول کے مطابق حکم دیا گیا: قُلْ اِنِّیٓ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَاتَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔قُلْ اِنِّیٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (کہہ دیجئے مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کروں اور یہ کہ تم' (اے پیغمبر) مشرکوں میں سے نہ ہونا۔ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ اگر میں پروردگار کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے (خوفناک) دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی......سورۃ الانعام آیت 14' 15)

(د) ملکہ نہ زیادہ فضول خرچ ہوتی ہے اور نہ زیادہ کنجوس۔ وہ عقلمند' معتدل مزاج اور دور اندیش ہوتی ہے۔ جیسا کہ نبیؐ کو خدا کی طرف سے حکم ملا تھا: وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا......(اور نہ تو اپنے ہاتھ کو گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ......سورۃ بنی اسرائیل آیت 29) ۔ یہاں ''ہاتھ کو گردن سے باندھنے'' کا مطلب اخراجات میں بے حد کنجوسی کرنا اور ''بالکل ہی کھلا چھوڑ دینے'' کا مطلب اتنی فضول خرچی کرنا ہے کہ تمام وسائل ضائع ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔

(ر) کارکن مکھیاں ملکہ کا اتنا احترام کرتی ہیں کہ وہ اس کی طرف پشت نہیں کرتیں بلکہ الٹے پاؤں واپس جاتی ہیں۔ اسی طرح قرآن میں حکم دیا گیا ہے:
یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہِ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ

النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ۔(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسولؐ کے آگے پیش قدمی نہ کرو (یعنی آگے بڑھ کر نہ چلو' مقدم نہ بنو تابع بن کر رہو) اور اللہ سے ڈرو' اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی آواز نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبیؐ کے ساتھ اونچی آواز سے بات کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو......سورۃ الحجرات آیات 1' 2)

الہامی کتابوں میں قرآن کا ذکر

یہاں ہم ایک بار پھر شہد کی مکھی کے لیے خدا کے الہام کا ذکر کرتے ہیں: قرآن مجید کی 16 ویں سورۃ النحل کی آیات 68 اور 69 میں آیا ہے:

وَاَوْحیٰ رَبُّکَ اِلَی النَّحلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتاً وَّمِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ۔ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلاً یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِھَا شَرَاب مُخْتَلِف اَلْوَانُہٗ فِیْہِ شِفَآء لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذَالِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ۔ (اور دیکھو تمہارے ربّ نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں، اور درختوں میں، اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں، میں اپنے چھتے بنا، اور ہر طرح پھلوں کا رس چوس، اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔)

ان آیات میں قرآن مجید غور و فکر کرنے والے انسانوں کو شہد کی مکھی کی عادات اور اس کے طریق کار پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مکھی بظاہر ایک معمولی سا کیڑا ہے جس کے پورے جسم میں ایک بھی ہڈی نہیں ہے اور وہ ہر قسم کے مہروں سے بھی محروم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نتائج اخذ کرنے اور دلائل دینے کی قوت بھی نہیں رکھتی۔ لیکن ان شدید محرومیوں کے باوجود وہ اپنا چھتہ بنانے کے لیے انجینئرنگ کے ایک انتہائی پیچیدہ نظام کو وجود میں لاتی اور اسے چلاتی ہے۔ پھر کیمسٹری کے ایک ماہر پروفیسر کی طرح شہد کے ہر قطرے کے اندر متعدد غذائی اجزا پیک کرتی ہے جو قسم قسم کے پھولوں سے چوس چوس کر وہ لائی ہوئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ اپنے تیار کردہ مائع کے اندر سورج کی

روشنی سے لی ہوئی کرنوں کو مقید کر دیتی ہے۔ اس کی یہ پراڈکٹ مسلمہ طور پر صحت وتندرستی کے ضامن اور قوت بخش اجزا کا مجموعہ ہے۔

ایک ذہین شخص، جس نے مکھی کی اس صنعت کاری کا بغور مشاہدہ کیا ہو، جانتا ہے کہ اس چھوٹے سے کیڑے نے علیم وخبیر اور قادر مطلق خدا کے الہام کے مطابق عمل کر کے ایک ایسی چیز تیار کر دکھائی ہے جسے دنیا کے نامور ترین سائنسدانوں کی کوئی بھی ٹیم وجود میں نہیں لا سکتی۔ اسی طرح اس سے یہ نتیجہ بھی آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ساری نسلِ انسانیت مل کر بھی خدا کی بھیجی ہوئی وحی کے ایک لفظ کے برابر بھی کوئی چیز نہیں لا سکتی۔ نبی اکرمؐ نے شہد کی مکھی ہی کی طرح کسی سکول یا کالج سے تعلیم حاصل نہیں کی لیکن وحیٔ باری تعالیٰ کے مطابق ایسی کامل اور بلند پایہ تعلیمات پیش کر دی ہیں کہ انسانوں کے وضع کردہ سینکڑوں مشکل ترین نظاماتِ تحریر ان کی ہمسری نہیں کر سکتے۔ ان نظامات میں سے بعض بڑی پردہ داری سے معبدوں میں مُقفل پڑے ہوئے تھے یا کسی دشمنِ اصلاح اور ابہام پرست (obscurantist) شخصیت کے گھر میں ذخیرہ کر دیئے گئے تھے جن پر اسقفوں، پروہتوں یا پنڈتوں کی اجارہ داری تھی۔ ان میں سے بعض نظاموں میں ایک لفظ بھی علیحدہ کر کے نہیں لکھا جا سکتا تھا کیونکہ وہ پورے جملے یا تحریر کا جزوِ لاینفک تھا جو علامتی زبان میں لکھی گئی تھی۔ انہیں ''منتر'' (Mantras) کہا جاتا تھا اور یہ اسلام کی آمد کے بہت بعد مروّج ہوئے تھے۔ اس سے پہلے انہیں کرم سمہیتا (Karam Sahita) کہا جاتا تھا۔ ان میں پورے پورے جُملے ایک ''نشان'' سے ظاہر ہوتے تھے جو اپنے اندر مخصوص معنی رکھتا تھا۔ ایسی مبہم زبان لکھنا اور اس سے مفہوم اخذ کرنا صرف تربیت یافتہ پروہتوں اور پنڈتوں کا کام ہوتا تھا جو بعض اوقات مضحکہ خیز غلطیوں کے بھی مرتکب ہو جاتے تھے مگر عام آدمی اس سے بے خبر رہتا تھا لیکن ایک نبی اُمّی نے جو ایک بے حد پسماندہ اور جاہل ملک ''عرب'' میں متولّد ہوئے، ہندوستان میں ویدوں، چین میں کنفیوشس کی کتابوں، ایران میں زرتشت کی تعلیمات اور اسرائیل کے انبیاء کی تعلیمات کا خلاصہ نکال کر اور اس میں بہت سی اصلاحات کر کے وقیع اضافوں کے ساتھ اپنی تعلیمات پیش کر دیں۔ یہ ایک عظیم الشان کام تھا جو سکالروں کی کئی نسلیں مل کر بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ہم یہ دعویٰ کرتے ہوئے قرآن کے بہت جوشیلے وکیل کا کردار ادا نہیں کر رہے ہیں، یہ دعویٰ خود قرآن نہایت زور

دار اور فلک شگاف لفظوں میں کر رہا ہے اور اس دعوے کو سابق پیغمبروں پر اترے ہوئے صحیفوں کی بھرپور تائید حاصل ہے۔ ہم اپنے دعوے کی تائید کے طور پر سابق صحیفوں کی عبارات اور مخالفینِ اسلام کی بھی شہادتیں پیش کر رہے ہیں۔

(1) آسمانی کتابوں میں سے قرآن سب سے آخر میں نازل ہوا' اس لیے وہ یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ سابقہ آسمانی کتب کا مصفیٰ ترین ترقی یافتہ ترین خلاصہ ہے۔

(2) کسی دوسری الہامی کتاب نے خالص ترین شہد کی مانند ہونے کا دعویٰ پیش نہیں کیا۔

(3) سابقہ کتابوں میں قرآن مجید کو خالص ''شہد'' کہا گیا ہے۔

(4) قرآن کریم واحد آسمانی کتاب ہے جس نے تمام سابقہ آسمانی صحیفوں کی صداقتوں کی پُرزور الفاظ میں توثیق و تصدیق کی ہے۔

(5) تمام سابق آسمانی صحیفوں میں نبی اکرمؐ کے دعوے کے سچا ہونے کی تصدیق کی گئی ہے۔

(6) عبرانی' آرمینائی اور عربی میں شہد کے لیے ایک عمومی لفظ ''الدبس'' یا ''دیبوش'' ہے۔ عہد نامۂ عتیق میں یہ لفظ تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ (i) صحرائی مکھیوں کا جمع کیا ہوا شہد (ii) پالتو مکھیوں کا بنایا ہوا شہد اور (iii) انگوروں کا رس۔

عبرانی زبان میں شہد کے لیے اس کے رنگ کے اعتبار سے ''دیبوش'' بولا جاتا ہے' اس کا عربی مترادف ''دِبس'' ''دیبوس'' اور ''دیبس'' ہے۔ عہد نامہ عتیق میں ''دیبوش'' کا لفظ اس کے اصل معنیٰ ''شہد'' کے علاوہ بطور استعارہ ''کلام خدا'' کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہ زیادہ تر مصر سے اسرائیلیوں کے خروج کے ضمن میں استعمال ہوا' مثلاً اس اخراج کے بعد ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ انہیں ایسی زمین میں بسایا جائے گا جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان وعدوں کا کتابِ خروج (EXODUS)' کتابِ احبار (LEVITICUS)' کتاب گنتی (NUMBERS) اور استثناء (DEUTERONOMY)[1] میں بار بار اعادہ کیا گیا

(1) خروج 8:3' 17' 5:13' 3:33 گنتی 27:13' استثناء 9:26' 15' 8:8' 3:6 احبار 24:20 ......

ہے۔ پھر کتاب یشوع (JOSHUA) کتاب یسعیاہ (ISAIAH)' کتاب یرمیاہ (JEREMIAH) اور کتاب حزقی ایل (EZEKIEL) میں ان کا ذکر اس طرح آیا ہے جیسا کہ یہ پورے کر دیے گئے تھے[1]۔ اس کے بعد ان کتابوں میں ایسی عبارتیں بھی ملتی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ انہیں ارض موعود سے ان کی بداعمالیوں کی بنا پر نکال دیا گیا تھا' لیکن اس سلسلے میں جو بات ذہن نشین رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اسرائیل کو جس حد تک ملک عطا کیا گیا تھا اور جتنا عرصہ وہ اس میں مقیم رہے بہت تھوڑا سا تھا۔ حضرت موسیٰ جن سے کہ بار بار یہ وعدہ کیا گیا تھا انہوں نے اس ملک میں قدم ہی نہیں رکھا جس کا سبب ان کے پیروکاروں کا بزدلانہ رویّہ تھا۔ اسرائیلی چالیس سال تک جنگل و بیابان میں بھٹکتے رہے اور موسیٰ اسی عرصۂ مشکلات و مصائب دنیا سے چل بسے تھے۔ کمانڈر جوشوا جسے موسیٰ اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے، وہ فلسطین کے کافی حصے پر قابض نہیں ہو پایا تھا کہ اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ یہودا (Judas) نے سخت لڑائی کے بعد فلسطینیوں سے تھوڑا سا علاقہ چھین لیا اور اسے اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں بانٹ دیا۔ پھر اسرائیلیوں میں کسی حد تک قابل ذکر پہلا حکمران ساؤل (saul) سامنے آتا ہے لیکن اس کا زیادہ تر وقت فلسطینیوں سے لڑتے اور یہودیوں کی داخلی کشمکش سے نبرد آزمائی میں گزر گیا۔ کوئی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کے اور حضرت داؤدؑ کے درمیان ٹھن گئی۔ داؤدؑ جب تک زندہ رہے حالات پُرامن رہے۔ ان کے بیٹے اور جانشین حضرت سلیمان علیہ السلام تھے۔ وہ پہلے اسرائیلی تھے جنھوں نے ایک بڑے حکمران کی حیثیت اختیار کی۔ لیکن ان کا سیاسی اقتدار زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکا' ان کی وفات کے بعد بادشاہت کا تار و پود بکھر گیا۔ ماسوائے دو قبیلوں کے باقی دس قبیلوں نے بغاوت کر دی اور پھر سے بُت پرستی اختیار کر لی۔

حضرت سلیمان کا دور صرف چالیس برس رہا' یہی سرزمین' ارضِ موعود تھی یہودیوں کی پوری تاریخ حکمرانی اسی سے وابستہ تھی' اس میں واقعی دودھ اور شہد کی نہریں بہتی رہیں۔ یہ خدا کی طرف سے ان پر ایک خاص عنایت تھی اور اسرائیلیوں کے ایک چنیدہ قوم کی کہانی اسی حد تک تھی۔ یعنی چار سو سال تک یہ چنیدہ لوگ مصر میں غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے' پھر مصر سے خروج کے بعد چالیس برس صحرا نوردی میں گزارے اور مزید 400 سال' یعنی 451 قبل مسیح

(1) یشوع 6:5 زبور 44:105 II سلاطین 32:18 یرمیاہ 5:11؛ 22:32

سے 1015 قبل مسیح تک' اس ملک میں' جہاں انہیں جائے پناہ ملی تھی وہاں کے لوگوں سے بھی لڑتے رہے اور آپس میں بھی گتھم گتھا رہے۔ ایک طویل کشمکش کے بعد انہیں جو حاکمیت نصیب ہوئی صرف 40 برس تک رہی۔ جس کے بعد وہ نہایت تیزی کے ساتھ تنزل و انحطاط کا شکار ہو گئے۔ تو کیا اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ان کی کل زندگی میں یہی وہ چالیس سالہ عرصہ اقتدار ہے جس کے لیے خدا نے پہلے حضرت ابراہیمؑ سے' پھر حضرت موسیٰؑ سے اور متعدد دیگر اسرائیلی نبیوں سے باری باری وعدے کیے۔ اگر ہم عہد نامہ عتیق کے نقطۂ نظر کو قبول کریں تو خدا ان کے اس عرصہ اقتدار میں بھی حضرت سلیمانؑ سے کوئی زیادہ خوش نہیں تھا کیونکہ وہ بُت پرستی کی چمک دمک سے مسحور ہو کر عقیدہ توحید سے مبینہ طور پر روگردانی کے مرتکب ہو گئے تھے۔ جس کی سزا کے طور پر خدا نے اسرائیل سے فلسطین چھین لیا' عظیم معبد (ہیکل) مسمار کرا دیا اور یہودیوں کو پابند سلاسل کر کے بابل میں مقید کرا دیا۔ بعد ازاں یہ بدقسمت لوگ ہزاروں سال تک دنیا بھر میں بھٹکتے رہے' قید و بند کی صعوبتیں اور گونا گوں اذیتیں جھیلتے اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں دھکیلے جاتے رہے۔ اور کبھی عزت اور سکون کی زندگی نہ پا سکے۔ بے پناہ دولت اور غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہونے کے باوجود بدقسمتی نے کبھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ان کی بھاری اکثریت اب بھی ''خدا کی زمین'' اور خدا کے دین سے دھتکاری ہوئی زندگی بسر کر رہی ہے اور پوری دنیا ان کے غلط رویے کی وجہ سے ان سے دلی طور پر متنفر ہے۔ ان کے اپنے مذہب کے مطابق سچا اسرائیلی وہ ہے جو ''خدا کی زمین'' کا رہائشی ہو' یہ وہی زمین ہے جو ''یہوواہ'' کا خصوصی ٹھکانہ تھی۔ (یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ امریکی ہفت روزہ رسالہ ٹائم 1960 میں یہودی صدر کا ایک فرمان شائع ہوا جس میں اس نے کہا کہ فلسطین سے باہر رہنے والے یہودی حقیقی یہودی نہیں سمجھے جائیں گے) جب یہ صورت حال پیدا ہو گئی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ارضِ مقدس سے' جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں اسرائیلیوں کو کیوں نکال دیا گیا اور یہ مقدس انعام اتنی جلدی ہمسایہ ممالک عراق' ایران اور افغانستان کے مسلمانوں کو کیوں عطا کر دیا گیا؟ تاریخ نے اس کا بالکل واضح جواب دے دیا کہ اسرائیلی حق پرستی کے راستے سے بھٹک چکے تھے جس کی بنا پر وہ خدا کے غضب کا نشانہ بن گئے اور یہ انعام آلِ ابراہیم کی ایک دوسری شاخ...... مسلمانوں کو عطا کر دیا گیا جو اس کے صحیح طور پر مستحق

تھے۔ اگر ہم اس کی مزید وضاحت کریں تو جو بات سامنے آتی ہے' یہ ہے کہ شروع میں یہ وعدے حضرت ابراہیمؑ سے کیئے گئے اور پھر حضرت موسیٰؑ سے ان کا اعادہ کیا گیا۔ مختصر عرصہ کے لیے بنی اسرائیل ان وعدوں کی شرطیں جزوی طور پر پوری کرتے رہے لیکن پیروکارانِ محمدؐ نے یہ بہتر طور پر نبھائیں۔

(7): شہد کے بارے میں عہد نامۂ عتیق کی دوسری عبارتیں وہ ہیں جن میں یہ لفظ خدا کی طرف سے وحی اور الہام کا مفہوم دیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ جملہ کہ "عمانویل دہی اور شہد کھائے گا" (یسعیاہ 15:7)۔ یہاں عمانویل سے مراد حضرت محمدؐ ہیں۔ اس نقطے پر قارئین کو اس کتاب میں "عہد نامہ عتیق کی پیشگوئیاں" کے عنوان سے بحث پر نظر ڈالنا ہوگی جو نبی اکرمؐ کی آمد کے سلسلے میں ہے۔ عہد نامے میں شہد کا خدا کی طرف سے وحی اور الہام کے طور پر ذکر آنے کی ایک اور مثال یہ ہے:

"اس کے دور میں دودھ کی فراوانی کی وجہ سے لوگ مکھن کھائیں گے کیونکہ ہر ایک جو اس ملک میں بچ رہے گا مکھن اور شہد ہی کھایا کرے گا" (یسعیاہ 22:7)۔ "دانا آدمی کی کہی ہوئی باتیں شہد سے بھرے ہوئے چھتے کی مانند ہوتی ہیں"۔ امثال 24:16۔ ایک اور جملہ جو سلیمان نے ادا کیا' یہ ہے: "اے میری زوجہ تیرے ہونٹوں سے شہد ٹپکتا ہے شہد اور شیر تیری زبان تلے ہیں" (غزل الغزلات 11:4 Songs of solomon) اسی کتاب میں وہ اپنے محبوب کا نام کو "محمدم" کا نام دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے الفاظ شہد کی مانند ہوں گے۔ (غزل الغزلات 16:5) داؤدؑ اس نبیؐ کے پاس پہنچنے والی وحی کو شہد سے زیادہ شیریں قرار دیتا ہے۔ "وہ شہد کے قطروں سے بھی زیادہ شیریں ہیں"۔ زبور 10:19) یہ وحی جو شہد سے زیادہ میٹھی ہے' قرآن کریم ہے اور جس نبیؐ سے وہ منسوب ہے عہد نامہ عتیق میں اس کا ذکر "محمدم" کے طور پر آیا ہے۔

(8): عہد نامۂ عتیق ہو یا جدید' وید ہوں یا بدھ مذہب کی کتابیں' ان میں سے کسی کا اپنے بارے میں بے مثل یا لاثانی ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ لوگوں نے ان کے ناموں سے ازخود کتابیں تصنیف کر لی ہیں اور ان کے اعتماد کو مجروح کر کے رکھ دیا ہے۔ بائبل میں بیسیوں کتابوں کا ذکر ہے جن میں سے مواد نکال لیا گیا ہے یہ کتابیں خدا کی

نازل کردہ نہیں ہیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا انجیلوں کی تعداد بڑھتی رہی' ساتھ ساتھ مسیحی فرقوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ عہد نامہ جدید میں کتابوں کی تعداد کے مسئلے پر کیتھولکس اور پروٹسٹنٹس کے درمیان سنگین اختلافات موجود ہیں۔ پہلے ویدوں کی تعداد 1131 تھی اور اب صرف دس کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کے برعکس قرآن مجید نے اپنے مخالفین کو ایک کھلا چیلنج دیا ہے کہ وہ اس کے متن میں کسی معمولی سے انحراف کی نشاندہی کر دیں یا اس جیسی کوئی چھوٹی سی کتاب بھی لکھ دکھائیں جو ادبی اعتبار سے' یا معانی کی وسعت و گہرائی کے لحاظ سے یا ہدایات کی جامعیت کے حوالے سے اس کے مقابلے میں رکھی جاسکے۔ اس عظیم آسمانی کتاب کی ہر آیت کے اندر معانی کی بے مثال دولت مضمر ہے جو انسان کو زندگی کی حقیقت' صفاتِ خداوندی' وحی کے مقاصد' الہام کے دائروں' ایک ہی ماخذ سے تمام روشنیوں کے پھوٹنے سے آگہی بخشتی ہے۔ دنیا بھر کے دانشمند اور پڑھے لکھے لوگ تو ایک طرف رہے' خود عربوں نے بھی جو شاندار علمی اور ادبی روایات کے علمبردار ہیں قرآن کے اس چیلنج کا جواب دینے میں اپنی ناکامی کا اعتراف کیا ہے۔ قرآن کے متن میں اس چیلنج کا کئی جگہوں پر اعادہ کیا گیا ہے اور اس نے پورے طمطراق سے اعلان کیا ہے کہ کوئی بھی انسان اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکتا۔

(۹): حضرت داؤد کہتے ہیں: ''خدا کے قوانین راست ہیں' وہ دل کو فرحت پہنچاتے ہیں۔ خدا کا حکم بے عیب ہے۔ وہ آنکھوں کو روشن کرتا ہے...... وہ شہد سے بلکہ چھتے سے گرنے والے قطروں سے بھی زیادہ شیریں ہے۔ نیز ان سے تیرے بندوں کو آگاہی ملتی ہے۔ ان کو ماننے اور یاد کرنے میں بڑا اجر ہے۔ کون اپنی بھول چوک کو مان سکتا ہے۔ تو مجھے پوشیدہ عیبوں سے بھی پاک کر'' (زبور باب 8' آیات 8'12) یہ آیات واضح طور پر قرآن سے متعلق ایک پیشنگوئی ہیں۔ ان میں جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے وہ اسی قرآن مجید سے متعلق ہیں۔ مثال کے طور پر ان میں خدا کے قانون یعنی اس کی شریعت کا ذکر ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بالکل پاکیزہ ہے' وہ آنکھوں کو روشنی بخشتی ہے اور دل' شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ اسے توجہ سے پڑھنا اور یاد رکھنا چاہیے۔ اس حقیقت کو ہر کوئی جانتا ہے کہ کسی نے بھی عہد نامہ عتیق یا جدید کو یاد یعنی حفظ نہیں کیا۔ جبکہ قرآن کو پورے کا پورا حفظ کرنے والے ہر زمانے اور ہر دور میں لاکھوں کی تعداد میں موجود رہے ہیں۔ انجیل کے بارے میں خدا کا

کوئی وعدہ نہیں کہ وہ اسے معدوم ہونے' اس میں ردوبدل ہونے یا کسی اور قسم کی انسانی مداخلت سے محفوظ رکھے گا' جیسا کہ اس نے قرآن کے سلسلے میں کر رکھا ہے۔عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید کی کتابوں کے اندر ان کے مصنفین کے خیالات اور افکار واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔پیغمبروں کی باتیں غائب کے صیغے میں ہیں اور ان سے متعلق چیزیں بھی اسی صیغے میں دی گئی ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مصنف' متعلقہ پیغمبر سے ایک الگ شخصیت ہے۔ دوسری طرف' جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سلیمانؑ نے واضح طور پر اپنے محبوب کو ''محمدم'' کہا ہے جو کہ بلاشبہ ''محمد'' ہی کے نام کی ایک شکل ہے' اس کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ اُس کی باتیں شہد کی طرح میٹھی ہوں گی۔عبرانی زبان میں لفظ ''دیبوش'' شہد کی اس قسم کے بارے میں استعمال ہوتا ہے جسے مکھیاں کھجور سے نکالتی ہیں (فرانسس براؤن: عبرانی انگلش لغت) یہ واضح طور پر سرزمین عرب اور قرآن کی طرف اشارہ ہے۔

(10): یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ مختلف علاقوں اور قوموں میں پھیلی ہوئی رسمیں اور رواج محض کسی اتفاق یا حادثے کے طور پر پیدا نہیں ہو جاتے۔مثلاً آتش پرست شعلوں کا جو احترام کرتے ہیں' ہندو زنار یا جینو پہنتے ہیں یا سر پر بالوں کی ایک لٹ رکھتے ہیں۔یہودی' مسلمان اور بعض افریقی قبائل ختنہ کراتے ہیں' یا بعض اقوام بچوں کی پیدائش کے موقع پر چند رسوم مناتے ہیں جو مسلمانوں کے ہاں عقیقہ کہلاتی ہیں' وہ تاریخ کے کسی واقعہ کی یادگار ہوتی ہیں۔ختنہ اور نوزائیدہ بچوں کے تالو پر انگلی سے شہد لگانا' خدائے واحد کی پرستش اور قرآن کی تدریس کے عزم کی علامات ہیں۔شہد قرآن کی علامت ہے۔ابتدائی دور کے عیسائی بھی بپتسمہ کی رسم مناتے ہوئے بچے کے تالو پر شہد لگاتے تھے۔ڈغاسکر اور دکن کے ہندوؤں میں بھی ایسی رسمیں پائی جاتی ہیں۔ہندو شاستروں میں شہد دیوتاؤں کی پسندیدہ خوراک مانا جاتا ہے۔ اور یہ خبیث روحوں کو بھگانے کی علامت بھی ہے۔شہد کے استعمال کا ایک اور موقع شادی کی تقریبات ہیں جو بندھن مضبوط رہنے کی تمنا کا اظہار ہے۔ہندوؤں اور عیسائیوں میں عورت کو مرد کے نروان یا نجات پانے کی تمنا کا اظہار ہے۔ہندوؤں اور عیسائیوں میں عورت کو مرد کے نروان یا نجات پانے کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے' تیاگ' جوگ اور رہبانیت اختیار کرنا' اسی تصور یا عقیدے کا نتیجہ ہوتا ہے۔عورت کو حقیر جاننا نفس کی پاکیزگی کی علامت ہے۔ہندوؤں

کے بڑے رشی اور بدھوں اور عیسائیوں کے بعض روحانی رہنما ساری زندگی مجرّد (بغیر شادی کے) گزار دیتے ہیں۔ عہد نامہ جدید میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے کہ ''آدم نے فریب نہیں کھایا بلکہ حوّا فریب کھا کر گناہ میں پڑ گئی''...... ''ٹیموتھی''......(تیمتھیُس کے نام پولس رسول کا پہلا خط باب 2' آیت 14)

(11): سنسکرت میں شہد کے لئے لفظ ''مدھو'' استعمال ہوتا ہے۔ رگ وید میں کوئی ایسی کتاب نہیں جس میں اس کی طرف اشارہ موجود نہ ہو۔ ماسوائے ساتویں کتاب کے' ہر ایک میں کسی نہ کسی طرح شہد کی تعریف کی گئی ہے۔ پہلی' آٹھویں' نویں اور دسویں کتاب میں شہد کی تعریف میں کافی گانے لکھے ہوئے ہیں۔ ان منتروں کا مطالعہ کرتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ دیوتاؤں دریاؤں' پانی' رس اور دودھ کے لیے بھی ''مدھو'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

مدھو کا لفظ دیگر زبانوں میں بھی کم وبیش انہی معنوں میں آیا ہے مثال کے طور پر اینگلو سیکسن ...... ''میڈو'' (Medu) ڈچ زبان میں ''میڈے'' (Mede)' آئس لینڈ کی زبان میں ''میجوتھر'' (Mjothr)' ڈنمارک کی زبان میں ''میوڈ'' (Miod)' ویلش میں ''میڈ'' (Medd)' ڈنمارک کی زبان میں ''میوڈ'' (Miod)' ویلش میں ''میڈ'' (Medd)' یونانی میں ''میتھو'' (Methu) اور روسی زبان میں ''میڈ'' (Med)۔ جو لوگ سنسکرت کی قدامت پر یقین رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ان سب زبانوں میں پائے جانے والے ان الفاظ کی جڑ ''مدھو'' ہے۔ مثال کے طور پر ہم وید میں پڑھتے ہیں ''توام راجاسی پرادیواسُتنم'' جس کے معنی یہ ہیں ''تم تمام قدیم دنیاؤں کے راجہ یا دیوتا ہو'' (رگ وید 47:3؛ نرکت 8:4) یہ الفاظ دیگر ''مدھو'' کو ''مدھو'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ تمام قدیم صفات عالیہ اور اقدار کا جوہر یا خلاصہ مانا جاتا ہے۔ بالکل یہی دعویٰ قرآن مجید کا ہے جو کہتا ہے: رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ (خدا کا پیغمبر ہے جو پاک اوراق پڑھ کر سناتا ہے جن میں مستحکم آیات لکھی ہوئی ہیں..... سورۃ البیّنہ آیت 2' 3) یعنی قرآن مجید پہلے اتاری ہوئی کتابوں اور تعلیمات کا خلاصہ ''جوہر'' یا ''ست'' ہے جسے ہمیشہ رہنا ہے اور اس کی حفاظت کا انتظام کر لیا گیا ہے۔

آریاؤں اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ وید اس دنیا کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی آ گئے تھے لامحالہ ان میں ان آسمانی صحیفوں کی کوئی بات شامل نہیں ہو سکتی تھی جو انسانی تاریخ کے بعد کے

ادوار میں نازل ہونے والی کتابوں میں تھیں۔ لہٰذا یہ دعویٰ قرآن ہی کر سکتا تھا کہ وہ اس سے پہلے اتری ہوئی تمام آسمانی کتابوں کا خلاصہ پیش کر رہا ہے۔ قرآن نے خود کو جو ''مھیمن'' (محافظ) کہا ہے' اس کے متعدد اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس نے ان کی اچھی باتوں کو اپنے اندر شامل کر کے انہیں دوام بخش دیا ہے۔ (وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْکِتَابِ وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ۔ (پھر اے نبیؐ ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور ''الکتاب'' میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے' اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے......سورۃ المآئدۃ آیت 48)۔ دوسری تمام آسمانی کتابیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی مداخلت کی وجہ سے ردوبدل اور تحریف و ترمیم کی شکار ہو گئیں لیکن قرآن نے سابق ادوار کی تمام آسمانی تعلیمات کے ضروری اجزا کو اپنے اندر سمو کر محفوظ کر لیا' خدا نے اس میں انہی باتوں کو شامل کرایا' جو وقتی ضرورتوں سے ہی متعلق نہیں تھیں بلکہ نسل انسانی کی آئندہ ضروریات سے بھی تعلق رکھتی تھیں۔

(12): سنسکرت کے لفظ ''مدھو'' کے ایک اور معنیٰ ''جیت لینا'' اور ''غلبہ پا لینا'' بھی ہے یہ ایسی قوت کی موجودگی پر دلالت کرتا ہے جو کسی کتاب یا نظام فکر سے وفاداری کی بنا پر کسی کے خلاف ڈٹ جاتی ہے۔ یعنی مقابلے میں آجاتی ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن پوری شدت سے دعویٰ کرتا ہے کہ وہ تمام دیگر تعلیمات اور نظامہائے زندگی پر غالب آ کر رہے گا۔ هُوَالَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ۔ (وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو......سورۃ التوبہ آیت 33)

(13): یسکا احاریہ کے مطابق لفظ ''مدھو'' ''دھمتی'' کی ضد (نرکت 31:10) ہے لیکن جب ہم اچھی طرح غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ''مدھو'' ''محد'' (Muhd) کی بدلی ہوئی صورت ہے خود مسلمان بھی کبھی کبھار اسے (Muhd یا Mohd) لکھتے ہیں (نروکت 1:2) اور اسے لفظ ''محمد'' کا قائم مقام سمجھتے ہیں۔

(14): مدھو کے بارے میں رگ وید کا پہلا منتر (دعا) اس طرح شروع ہوتا ہے

.... پیارے ناراسنا' اے شیریں دہن' میں اس قربانی کے ذریعے تجھ سے مناجات کرتا ہوں ...." اس منتر میں "نراسن" کا لفظ قابل غور ہے نروکت (نروکت 6:8) میں اس کے معنی "نرائے پرسنسیو بھاوتی" ہیں یعنی "لوگوں کی آنکھ کا تارا" (قابل تعریف) ہے۔ یہی "محمد" کے معنی ہیں۔

(15): "نراشنز پریام" کے معنی پیارے محبوب کے ہوتے ہیں۔ جس سے مراد ہے "لوگوں کا پیارا اوران کے لیے باعث رحمت" جس کی دوسری صورت "رَحْمَةً لِّلْعَالمین" ہے۔ قرآن میں نبی کریم کو یہی خطاب دیا گیا ہے۔

(16): قرآن کی ایک خصوصیت "شیریں کلامی" یا شہد جیسا شیریں کلام ہونا ہے۔ شہد کو کئی امراض کے لیے شفا کہا گیا ہے' اس مماثلت سے دیکھا جائے تو قرآن کو ذہن کے کئی روگوں کے لیے شفا کہا گیا ہے۔ یہ ذائقے میں میٹھا ہے اور بہت سے جسمانی امراض کے لیے شفا ہے۔

(17): جن دلائل کی بنیاد پر قرآن کو "مدھو" کہا گیا ہے' ان میں سے پہلی دلیل یہ ہے کہ یہ تمام سابق الہامی کتابوں کا "جوہر" یا "ست" ہے۔ اس میں سابق کتابوں کے لیے احترام کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں کیونکہ وہ سب خدا کی طرف سے تھیں۔ کوئی مسلمان ان کی بے حرمتی کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ جو مسلمان ان پر ایمان نہ رکھتا ہو وہ صحیح مسلمان کہلا ہی نہیں سکتا۔ یہ بات بجائے خود نسل انسانی کی وحدت یعنی سب کے اولادِ آدم و حوا ہونے کا ثبوت ہے اور نبی اکرمؐ پوری انسانیت کے لیے رحمت کا پیغام لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے۔ کوئی پیغام اس سے بڑھ کر میٹھا (یعنی مانند شہد) نہیں ہو سکتا کہ نسل انسانی ایک مشترک برادری کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلام اسی اشتراک کی بنیاد کو مضبوط بنانا چاہتا ہے جو ایک نہایت معقول اور دیرپا بنیاد ہے۔ جتنے لوگ اس کے دائرے کے اندر آ جاتے ہیں' خواہ وہ کسی رنگ و نسل کے ہوں یا کوئی بھی ذات پات اور زبان رکھتے ہوں ان سب کو مساوی حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ سابق الہامی کتابیں آج جس شکل میں پائی جاتی ہیں انہیں دیکھ کر یہ ہرگز یقین نہیں آتا کہ یہ تمام انسانوں کے لیے برادری کی ایک مشترک بنیاد فراہم کر سکتی ہیں۔ ان کا پیغام' ایک ہی ماخذ سے پھوٹتا ہوا ہرگز محسوس نہیں ہوتا۔ عہد نامہ عتیق اور جدید' وید اور

زنداویستا'' کو اتنی بری طرح مسخ کر دیا گیا ہے کہ انہیں بمشکل ہی خدائی منبع (SOURCE) کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے ان میں شامل کی گئی کثافتوں کو نکال کر انہیں پھر سے وہی حیثیت دے دی ہے کہ وہ جملہ عالم اسلام میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جا رہی ہیں۔ جیسے شہد کی مکھی پھول پھول میں سے رس نکال کر اسے ایک ایسے ظرف میں ذخیرہ کر دیتی ہے کہ جہاں وہ ہر اندرونی و بیرونی اثر سے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے اسی طرح قرآن کے اندر موجود وحی نے دنیا بھر سے سچائیاں اور صداقتیں اپنے اندر سموئی ہوئی ہیں۔ اس میں تمام نسل انسانی کی ثقافتی و تہذیبی اور اخلاقی تاریخ کا ماحاصل موجود ہے۔ ان کے خالص اجزاء یہاں انتہائی خوبصورت ترتیب کے ساتھ پائے جاتے ہیں' جو کوئی بھی ہدایت کا طالب ہو' اسے یہ شہد خالص کی طرح تیار ملے گی۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت' اب اس میں اپنی من مانیاں شامل نہیں کر سکتی۔ دوسرے مذاہب کے بعض پیروکار قرآن مجید اور نبی اکرمؐ کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اپنے دلی بغض اور تعصب کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن ایک سچا مسلمان اپنے دل میں تمام نبیوں کے لیے احترام اور محبت کے جذبات پاتا ہے' انہیں خدا کے منتخب و چنیدہ بندے قرار دیتا ہے۔ ان کے جتنے اقوال اور جتنی تعلیمات اس کے سامنے آتی ہیں وہ ان کے سامنے احترام سے سر جھکا دیتا ہے۔

(18): کسی شخص کی شیریں کلامی لوگوں کی نگاہ میں اس کے قابل تعریف ہونے کا حتمی ثبوت ہوتی ہے۔ آپؐ مکی معاشرے میں بے حد ہر دل عزیز تھے' ہر کسی کے کام آتے تھے اور اتنے قابل بھروسہ تھے لوگ اپنی امانتیں آپ کے پاس جمع کرا کر مطمئن ہو جاتے تھے کہ بس ہمارا مال محفوظ ہو گیا۔ اسی بنا پر آپ صادق اور امین مشہور ہو گئے۔ لیکن جب آپ منصبِ نبوت پر فائز ہو گئے اور اپنی پیغمبری کا دعویٰ کر دیا تو مخالفتوں کا ایک شدید طوفان امڈ آیا۔ کل تک جو لوگ آپؐ کی تعریف میں رطب اللسان تھے وہ جانی دشمن بن گئے اور آزمائشوں کا ایک طویل دور شروع ہو گیا۔ مصیبتوں اور ابتلاؤں کے اس عالم میں بھی آپؐ نے شیریں کلامی اور توازن و اعتدال ترک نہ کیا۔ مستقل مزاجی اور پامردی کے اس عظیم پیکر نے بالآخر میدان مار لیا اور لوگوں نے آپ کی باتوں پر کان دھرنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ جان نثاروں کی بہت بڑی تعداد آپؐ کے گرد جمع ہو گئی۔ حتیٰ کہ شمشیر زنوں کے تابڑ توڑ حملوں اور تیروں کی بارش کے

دوران وہ آپؐ کے گرد ایک انسانی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ جب فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوئے تو آپؐ نے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیا۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ آپؐ کے مشن کی کامیابی آپ کی شیریں کلامی' آپ کی ثابت قدمی' وحی خداوندی کی قوت' آپؐ کے کردار کی بلندی آپؐ کی قوتِ استدلال اور نصرتِ الٰہی کا نتیجہ تھی۔ آپ کی تعلیمات سراسر بنی نوع انسان کے مفاد میں تھیں۔ رگ وید نے آپؐ کی شیریں کلامی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایسے انسان کے لیے قربانی دینے کا جذبہ اپنے آپ امنڈ آتا ہے۔

(19): ویدک رشیوں کا یہ پُرخلوص اعتراف ہے' غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی نسلوں کی غیر معمولی تعداد نبی اکرمؐ پر ایمان لے آئی اور ہندوستان میں اسلام پھیلانے کا باعث بنی۔

(20): شق نمبر 14 جس رشی کی دعا کر ذکر کیا گیا ہے اس کا نام میدا تیتھی ولد کنوارشی تھا' اس کی ایک اور دعا کا ترجمہ یوں ہے: اے شہد پیش کرنے والے تیرے الفاظ بے حد جانفزا ہیں' تو ہمیں برکت عطا فرما''۔ یہاں شہد پیش کرنے والے کے لیے سنسکرت کا لفظ ''مدھومتی'' تھا۔ سنسکرت کے سوتر گرنتھ میں یہ ''محمد'' کا ہم معنی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس آنے والے ''استاذ'' کی پیشگوئیاں کتنے رشیوں نے کی ہوں گی۔ ہم اسے خدشے کے پیش نظر کہ ہم پر ان لفظوں کی من مانی تعبیر کا الزام لگ سکتا ہے ہم اس نقطے کے بارے میں ایک مغربی مستشرق کا یہ جملہ نقل کرتے ہیں......''مدھومتی' کا مطلب ہے' محمد کلک'' (Monier William: Sanskrit-English Dictionary p.780 OXFORD-1899)

(21): ''مدھو'' کے ایک معنی ''موسم بہار'' کے ہیں' یہ وہ وقت ہے جب شہد کی مکھیاں سردیوں کی طویل نیند سے بیدار ہوتی ہیں کتابوں میں جہاں نبی اکرمؐ کی صداقت پر درختوں کی گواہی کا ذکر آتا ہے بتایا جاتا ہے کہ آپؐ موسم بہار کے آغاز میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی طرح آپ پر مندرجہ بالا ''منترا'' کا اطلاق اس مفہوم میں بھی ہوتا ہے۔

(22): اگر مدھومتی کے معنی ''شہد پیش کرنے والا'' کیے جائیں تو ''منترا'' کے تیسرے لفظ ''کاشا'' کے معنی چابک یا کوڑے کی بجائے تقریر یا کلام کیے جانے چاہئیں۔ یہ معنی ''نرکت'' میں دیئے گئے ہیں (نرکت 19:9) اس ''تقریر'' یا کلام سے مراد قرآن ہے۔

(23): پھر ایک لفظ ''آشوینا'' (Ashvinau) آتا ہے جس معنوں کے بارے میں لغت نویسوں کے مابین اختلاف رائے پایا جاتا ہے لیکن اس کا لغوی مفہوم ''گھوڑوں والا'' ہے اور اب ساری دنیا جانتی ہے کہ سرزمین عرب اور وہاں کے لوگوں کا گھوڑوں کے ساتھ خاص تعلق ہے۔ سنسکرت میں لفظ ''اشوؔ'' وہی ہے جو عربی میں ''اشہب'' یا ''شہاب'' ہے اور فارسی میں ''اسپ'' ہے۔ گھوڑوں سے عربوں کی محبت ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ویدوں نے گھوڑوں کے لیے ''اروا'' کا لفظ بکثرت استعمال کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب اور گھوڑے تقریباً ہم معنی سمجھے جاتے تھے (رگ وید 1:104:1؛ 3:149:1؛ 5:152:1؛ 14:27:10؛ 12:163:1) رگ وید میں ''اروا'' کا لفظ تقریباً بیس دفعہ گھوڑے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مذہبی کتابوں کے متون سے یہ مفہوم لینا بالکل بجا ہے کہ عربوں اور مسلمانوں کو بھارت آکر ان خطوں میں اسلام کا پودا لگانے کی دعوت دی گئی ہے۔

(24): اس نکتے تک تو منتروں کا مطلب سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ لیکن لفظ ''آشونیا'' میں تعداد ''واحد'' نہیں' بلکہ تثنیہ یا دو کی شکل میں آتی ہے۔ دو افراد یا دو چیزیں۔ ''اشویناؤ'' کے معنی دو گھوڑوں والا نکلتے ہیں۔ اس صورتحال نے سنسکرت کے علما کو سخت مشکل میں ڈال دیا۔ وہ یہ طے نہیں کر سکے کہ یہاں کون سے دو خدا یا دیوتا مراد ہیں۔ لیکن یسک اچاریہ جس کی ویدوں کی لغت مسلمہ طور پر معیاری اور معتبر سمجھی جاتی ہے' اس نے اس سے مراد ''آسمانی دیوتا'' لی ہے۔ (دیکھئے نرکت 1:12) تاہم اس بارے میں خاصا اختلاف رائے ہے کہ کون سے دو آسمانی دیوتا مراد لیے جاسکتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس جوڑے میں سے ایک دیوتا آسمانی اور دوسرا' زمینی مراد ہے۔ بعضوں نے اس سے سورج اور چاند مراد لیے ہیں۔ ایک رائے دن اور رات کا مفہوم لینے کے بارے میں ہے اور بعضوں نے اس کا مطلب ''ایک راجہ'' کی طرف اشارہ لیا ہے جس کے پاس دو عمدہ اور مشہور گھوڑے ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس ساری بحث کے باوجود بعض اہم سوالوں کا جواب نہیں ملا ہے۔ مثلاً کیا ان دو دیوتاؤں میں سے ایک آسمان میں اور دوسرا زمین پر ہے یا دونوں آسمان پر یا دونوں زمین پر ہیں؟ اور ان میں سے ہر ایک' آدھے آسمان یا آدھی زمین پر قابض ہے۔ یہ سوالات اس لیے پیدا ہوئے کہ ''نرکت'' نے کہا ہے کہ ان کا ٹھکانہ آسمان میں ہے۔ ''منترا'' اشوینا کو دعوت دیتا

ہے کہ وہ آئے اور آ کر ان کی بھینٹ (sacrifice) میں سے سوما (نشہ آور مشروب) سے بھرے ہوئے پیالے پیئے۔ مزید برآں ''سوما'' کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں ہے کہ یہ رس کیا ہے؟ اور کس پودے یا بُوٹی سے کشید کیا جاتا ہے؟ سنسکرت کے عالموں اور پنڈتوں نے ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے کئی مفروضے تیار کئے ہیں لیکن کوئی تشفی بخش حل پیش نہیں کر سکے۔ ان مشکل سوالوں کے جواب کے لیے آیئے قرآن سے رجوع کرتے ہیں۔ اس عظیم کتاب کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ دیگر آسمانی کتب کی پیدا کردہ پیچیدگیوں کو بہت آسانی کے ساتھ حل کر دیتی ہے۔ قرآن ہمیں خود دعوت دیتا ہے فَسْئَلُوٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے۔ سورۃ النحل آیت 43) اشویناؤ کون ہے؟ جب ہم یہ سوال قرآن سے پوچھتے ہیں تو ہمیں اس کا فوری اور شافی جواب مل جاتا ہے۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا (1) وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (2) وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا (3) وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا (4) وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا (5) وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (6) وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا۔ (سورج اور اس کی دھوپ کی قسم' اور چاند کی قسم جب کہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے اور دن کی قسم جب کہ وہ (سورج کو) نمایاں کر دیتا ہے اور رات کی قسم جب کہ وہ (سورج کو) ڈھانک لیتی ہے۔ اور آسمان کی اور اس کی ذات کی قسم جس نے اسے قائم کیا اور زمین کی اور اس کی ذات کی قسم جس نے اسے بچھایا اور نفسِ انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا۔ سورۃ الشمس' آیات 1 تا 7)۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ نرکت میں اشویناؤ کے جتنے بھی معنی دیئے گئے ہیں' ان آیات میں وہ پوری طرح موجود ہیں اور تمام مشکلات بھی حل کر دی گئی ہیں۔ ''نفسِ انسانی کو ہموار کیا'' کا جملہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ انسانوں میں کوئی نہ کوئی ایسا بھی ہونا چاہیئے جس نے انسانوں کے لئے ممکن ارتقائی عمل میں کاملیت کا اعلیٰ ترین درجہ حاصل کر لیا ہو۔ ان آسمانی صحیفوں میں ایسے شخص کو سورج کہا گیا ہے' ویدوں میں اس کا ذکر ایسے سورج کے طور پر کیا گیا ہے جو اندھیری رات کے عین درمیان نکل آیا ہو۔ جس طرح مادی دنیا کا سورج پوری کائنات کو روشن کر دیتا ہے اسی طرح انسان کامل بھی پوری دنیا کی روشنی اور ہدایت کا سبب بن جاتا ہے۔

جس طرح چاند' سورج سے روشنی اخذ کرتا ہے' وہ خدائے تعالیٰ سے روشنی اخذ

کرے گا جو کہ ہر قسم کی روشنیوں کا آخری اور حتمی منبع ہے۔ وہ روز روشن کی طرح انسان کو خدا کی خوشنودی کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لانے کی تلقین کرے گا اور ان کے لیے اسی طرح امن وسکون کے اسباب مہیا کرے گا جیسے رات انہیں آرام وسکون فراہم کرتی ہے۔ وہ اپنی خوبیوں' محاسن اور اعمال صالحہ کے لحاظ سے ''آسمانی'' ہوگا اور اپنے عجز و انکسار اور بندگانِ خدا سے ہمدردی کے لحاظ سے ''ارضی'' ہوگا۔ وہ انسانِ کامل کی ان تمام خوبیوں سے متصف ہوگا جو نسل انسانی کے جوہرِ خالص کا نمائندہ بننے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ وہ واحد فرد ہوگا جو ایسی تمام خوبیوں کا مجموعہ ہوگا کہ وہ بظاہر متضاد دکھائی دیں گی جبکہ حقیقت میں کوئی تضاد نہیں ہوگا۔

(25): مدھو کے سلسلے میں رگ وید کا تیسرا منتر ایک رشی کے یہ الفاظ ہیں' ''ہماری تمام تعریفیں اور دلی عقیدت اس ذات کو پہنچیں جس کی زبان شروع ہی سے شہد کی طرح میٹھی تھی'' یہاں ویدک رشی اپنے جذباتِ عقیدت و محبت کا اظہار اپنے اس محبوب رہنما اور سردار کے لیے کر رہا ہے جس کی شیریں مقالی شہد کی طرح میٹھی' خالص اور گاڑھی ہے اور جس کی تعلیمات ان تمام آسمانی کتابوں کا خلاصہ ہیں جو خدا صدیوں سے بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لیے بھیجتا رہا ہے۔ اب پوری دنیا میں جو واحد آسمانی صحیفہ ان شرائط پر پورا اترتا ہے وہ صرف قرآن ہے جو خود بھی دعویٰ رکھتا ہے کہ وہ خدا کی تمام نازل کردہ ہدایات کا مجموعہ یا خلاصہ ہے۔

(26): ایک اور ویدک رشی کہتا ہے...... ''اے آشینا ہمیں رزق دے' ہمیں اپنا کلام عطا کر جو شہد کے قطروں کی طرح کان میں پڑتا ہے۔'' (رگ وید منڈالۂ اُشکت 157' منتر 4)۔ اگر ویدوں نے خود وہ تقاضے پورے کئے ہوتے جو ان رشیوں کے پیش نظر تھے تو انہیں اس ہستی سے ایسی دعائیں کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ انہیں ایسا کلام ملے' جو صحت کے لیے مفید تر اور جو روحانی خوشیوں سے بھرا ہوا خزانہ ہو۔ ہم دعا اسی چیز کے لیے کرتے ہیں جس کی ہمارے پاس کمی ہوتی ہے۔ ایک راستباز شخص ایسی چیز کا طلب گار ہوتا ہے جو اس کی روحانی ترقی کے لیے درکار ہو۔

(27): لیکن مطلوبہ مصفّٰی اور شیریں ترین شہد کہاں سے ملتا ہے؟ اس سوال کا جواب

ویدوں نے دیا ہے۔ ''کاش میں اس محبوب کی محل سرا میں پہنچ سکوں جہاں دیوتاؤں کے پجاری خوشی خوشی زندگی گزارتے ہیں' جہاں کے چشمے امرت کے کنوؤں کے مانند ہیں جن کی وسعت وشنو کے نشانِ قدم کے برابر ہے۔ یہاں وشنو سے مراد سورج ہے جو پوری زمین کو اپنے تین قدموں سے ناپ لیتا ہے۔ لیکن یہ ناپنا دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ (i) صبح' دوپہر اور شام......یعنی ایک قدم صبح' ایک دوپہر کو اور ایک شام کو۔ (ii) ایک قدم مشرق میں پڑتا ہے' ایک قدم زمین کے وسط میں اور ایک مغرب میں جا پڑتا ہے۔ تیسرا طریقہ وقت کی پیشرفت یا سورج کی حرکت ناپنے کا ہے۔ جس کے تین ادوار (Periods) ہوتے ہیں۔ یعنی ماضی' حال اور مستقبل۔ آریائی نسل کے عقیدے کے مطابق وشنو (سورج) کے پہلے اور دوسرے قدم سے مراد صبح اور دوپہر تھی۔ اور اب تیسرا قدم سرزمین عرب میں پڑنے کا وقت آ گیا تھا جہاں سے شہد کا چشمہ ابلنے والا تھا۔ ان تمام پہلوؤں' تعبیروں اور قرائن سے یہ اسلام کی آمد کی پیشگوئی تھی۔ ہندو لٹریچر میں وشنو' سورج کے معنوں میں آتا ہے جبکہ قرآن مجید میں حضرت محمدؐ کو سراجاً منیراً (چمکتا ہوا سورج) کہا گیا ہے جس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار مذہبی کتابوں کے جوہر کو تین مرحلوں میں یکجا کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب شہد کا ایک حقیقی چشمہ بن گئی ہے۔ اس تعبیر کے سوا ان منتروں سے کوئی مربوط معنی نکلنا ممکن نہیں ہے۔

(28): ویدک علوم کی ایک شاخ شہد کے بارے میں ہے جسے مدھولا کہا جاتا ہے۔ یہ سانپ کے زہر کا تریاق (Antidote) ہے اور اسے دافعِ زہر کے علاوہ دافع شیطان بھی کہتے ہیں۔ اس پر غور و فکر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مدھولا ''الحمد'' کی ایک منقلب صورت ہے جو قرآن مجید کی پہلی سورۃ کا پہلا لفظ ہے۔ ویدک رشی نے اس پیشگوئی کو ایک پُر اسرار معمہ بنانے کے لیے غیر معمولی زیرکی اور چالاکی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی نیت یہ دکھائی دیتی ہے کہ اصل راز انسانی مداخلت اور رسائی سے محفوظ رہے اور اپنے خاص وقت پر جا کر کھلے۔ سنسکرت اور عربی کے بہت سے الفاظ ایک دوسرے کے برعکس یا منقلب ترتیب رکھتے ہیں۔ ایسے الفاظ کی تعداد تقریباً 500 ہے۔ سورۃ الفاتحہ (سنسکرت میں صرف ایک ''ہ'' ہائے ''ہوز'' ہوتی ہے' اس لیے ''ح'' حائے حطی کا کام بھی ہائے ہوز سے لیا جاتا ہے) ایک عدیم النظیر سورۃ ہے جو نہ صرف پورے قرآن کا خلاصہ پیش کر دیتی ہے بلکہ ایک صحتمند انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے ایک

فلسفۂ اخلاق کا بھی جوہر (ست) سامنے لے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان جب بھی نماز پڑھتے ہیں اس کی ہر رکعت میں یہ سورۃ پڑھنا لازمی ہوتا ہے۔ ویدوں میں مدھولا کو انسانی شر کے زہر کا علاج اور جہنم کے سات دروازوں کے بند ہو جانے کی ضمانت بتایا گیا ہے۔ سورۃ الفاتحہ (سورۃ الحمد) میں سات آیتیں ہیں۔ وید صرف نام کا ذکر کرتے ہیں اور وہ بھی منقلب (Inverted) صورت میں۔ لیکن قرآن پوری سورۃ کا متن پیش کر دیتا ہے۔ وید اس میں انسان کے لئے فوائد بیان کرتے ہیں جبکہ قرآن' اس سورۃ کو اس کے عظیم الشان معنوں سمیت بیان فرما دیتا ہے۔

(29): اب چند منتروں کو لیجئے۔ ان کے ترجمے کی بنیاد سینا اچاریہ کی شرح ہے۔
''سب کچھ دیکھنے والا سورج مشرق سے نکلتا ہے جو تمام نادیدہ چیزوں کے لیے تباہ کن اور تمام زہروں کا قاطع اور تمام شرور کا دافع ہے'' (رگ وید)...... ''سورج بہت اوپر آ چکا ہے اور اس نے تمام زہروں کو زائل و بے اثر کر دیا ہے۔ یہ نادید چیزوں کے لیے تباہ کن ''اودیتا'' اور تمام ذی روح چیزوں کی بھلائی کے لیے طلوع ہوتا ہے'' (رگ وید)۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے' یہ منتر ''زہریلی'' چیزوں کو ''تریاق'' میں تبدیل کرنے کا ذریعہ مانے جاتے ہیں جو کہ زندگی کو بچاتے اور اسے تقویت دیتے ہیں۔ ایک عام قاری کے لیے ان منتروں کو سمجھنا بہت مشکل بات ہے جب تک وہ یہ نہ جان لیں کہ ان فاضل پنڈتوں نے ان سے کیا مطلب لیا ہے سنسکرت کے سکالروں اور ویدوں کے کلاسیکی شارحین نے بتایا ہے کہ اگر سورج کے قرص (Disc) کی فرضی تصویر بنائی جائے اور پھر زہریلی چیز کو اپنی چوتھی انگلی کے ساتھ اس کے سامنے لٹکا دیا جائے تو اس چیز کا زہر خارج ہو جائے گا۔ سانپ کے کاٹے اور بچھو کے ڈنک کا علاج بھی اسی طریقے سے کیا جاتا ہے' ہم نے اس ''سواستکا'' (سنسکرت زبان میں' اس لفظ کے معنی خوش قسمتی کے ہیں) پر بحث ''پُر اسرار رسوم'' کے زیر عنوان کی ہے زہریلی چیزوں کو فرضی سورج کے سامنے لٹکانے سے ان کا زہر خارج ہو جانا وغیرہ چیزیں باتیں کیا محض وہم یا توہم پرستی نہیں ہیں۔

اب اس طرف آیئے کہ ہم ان منتروں کی کیا تعبیر کرتے ہیں؟ سورۃ ''الحمد'' (فاتحہ) میں فی الحقیقت ان تمام غلط تصورات اور گمراہ کن عقائد کا تریاق موجود ہے جو انسان

کی انفرادی و اجتماعی زندگی اور اس کی روح کے لیے زہر کا اثر رکھتے ہیں۔ یہ غلط تصورات اور گمراہ کن عقائد وہ ہیں جو خدا کی موجودگی' کائنات میں انسان کی حیثیت اور انسان اور اس کے خالق کے مابین صحیح تعلق کے حوالے سے ہیں۔ متذکرہ بالا منتروں میں جس چیز پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ سورج سب انسانوں پر یکساں اور بلا امتیاز اپنی روشنی ڈالتا ہے خواہ وہ برہمن ہو' کھشتری ہو' ویش ہو یا شودر' اسرائیلی ہو یا غیر اسرائیلی' مسیحی ہو یا غیر مسیحی۔ حقیقی سورج جو تمام انسانوں کو مساوی طور پر اور بلا امتیاز روشنی سے منوّر کرتا ہے' ربُّ العالمین کا تصور ہے جو سورۃ الحمد (فاتحہ) میں دیا گیا ہے یعنی وہ ساری کائنات کا' پیدا کرنے والا ہے' سب کا پالنے والا ہے اور سب کی نشوونما کرنے والا ہے۔ تمام انسان خواہ وہ سفید فام ہوں یا سیاہ فام' عیسائی ہوں یا غیر عیسائی' اسرائیلی ہوں یا غیر اسرائیلی اس کی نظر میں سب یکساں ہیں۔ حضرت محمدؐ نے جو اس سورج کے نور سے منوّر ہوئے انسانوں کو گمراہ کن تصورات کے زہر سے پاک کیا ہے اور ان کے اعمال کو درست کیا' اس طرح وہ پوری نسل انسانیت کے لیے رحمتوں اور برکتوں کا منبع بنے۔

مکہ مکرمہ...... مسلمانوں کا روحانی مرکز

اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے ایک ایسا مرکز وجود میں لایا جائے جس میں اس کا ہر فرد بلاتفریق رنگ ونسل اورعقیدہ اپنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے۔ اوران زنجیروں اور رکاوٹوں کو توڑ دے جو اس کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہوں۔ تاکہ انسانوں میں مشترک برادری' مساوات اور ہمدردی کے احساسات پیدا ہوں اور وہ متحد ہو کر خدائے واحد کی عبادت کریں جو پوری کائنات کا خالق اور مالک ہے اور ہر فرد آزادی سے ان بنیادی قدروں کے فروغ کے لیے کام کر سکے جو انسانی تہذیب کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ عربی زبان میں اس قسم کے شہر کو ''بلد'' کہتے ہیں۔ ''البلد'' سے مراد ایک ایسا شہر یا بستی ہے جو واضح حد بندیوں یا چہار دیواری کے اندر ہو' اور چہار دیواری ایسی ہو کہ بیرونی دشمنوں کی جارحیت کے خلاف بھی ضمانت ہو اور اندرونی بدامنی پر قابو پانے میں بھی مدد دے سکتی ہو۔ آبادی ایسی ہو کہ اس کے شہریوں کے مابین ہمدردی اور یگانگت کے جذبات پائے جاتے ہوں۔ الراغب: ''بلد'')

قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ اسلام کی جائے ولادت مکہ میں یہ سب خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں اور وہ مطلوبہ معیار کی بہترین مثال ہے۔ جیسے یروشلم تمام اسرائیلیوں کے لیے ایک خاص قسم کے شہر کی علامت ہے مکہ بھی ایک خاص قسم کے شہر اور شہریت کی علامت ہے جس سے ایک منفرد نوعیت کی سماجی اور مذہبی اقدار وابستہ ہیں۔

جیسے کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ ''البلد'' سے مراد ایسا شہر ہے جس کے چاروں طرف حفاظتی دیوار ہو۔ اس قسم کے مضبوط دفاعی انتظامات والے شہر مدتِ مدید سے دنیا کے ہر

ملک میں کافی تعداد میں تعمیر ہوتے رہے ہیں تاہم ایک مشہور کہاوت ہے کہ جس گھر کا مالک' خود اپنے مکان کی تباہی چاہتا ہو وہاں چوکیدار کی ہوشیاری کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ بہت سے لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جب زمین پر انسانی نسل آباد ہونے لگی ہے یا جب سے انسانی تاریخ لکھی جانے لگی ہے' صرف ایک شہر ایسا آباد ہوا ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے سنبھالی ہے اور وہ معجزاتی طریقے سے اس کا تحفظ کرتا رہا ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس پر دشمن کبھی حملہ آور نہیں ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ کئی بڑی طاقتوں نے اپنے اپنے وقتوں میں اسے تباہ و برباد کر کے زیر قبضہ لانے کا خواب دیکھا ہے لیکن اس شہر نے اپنی فوجیں اور دیگر دفاعی ساز و سامان نہ رکھنے کے باوجود اپنی حفاظت کی ہے اور غیر مرئی قوتوں نے یہ کام اتنے حیرت انگیز طریقے سے کیا ہے کہ بڑی بڑی حملہ آور قوتیں سخت ہزیمت سے دوچار ہو کر پیچھے ہٹیں اور سال ہا سال اپنے زخموں کو سہلاتی رہیں۔ اس شہر میں اس معجزے کے علاوہ بھی کئی اور نمایاں خصوصیتیں ہیں جن کا قرآن کی سورۃ البلد میں مختصر مگر بہت جامع طور پر ذکر آیا ہے۔ تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ "البلد" سے مراد مکہ شہر ہے جو کہ قبلہ ہے (یہ وہ سمت ہے جس کی طرف دنیا بھر کے مسلمان منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں) اور پوری مسلم دنیا کا مذہبی مرکز ہے۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ انسانی تاریخ میں اور بھی شہر رہ چکے ہیں جو متبرک مقام اور جائے امن مانے جاتے تھے۔ ہم مسلمان بطور اصول' دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے مقدس مقامات کا احترام کرتے ہیں' خواہ دوسرے مذاہب کے لوگ' اسی طرح مکہ کا احترام نہ بھی کرتے ہوں۔ یروشلم' اجودھیا' طوس' بلخ' بابل' گیا اور مکہ وہ شہر ہیں جہاں دنیا کے بڑے بڑے مذاہب نے جنم لیا اور انھوں نے انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ پر بے پناہ اثرات مرتب کیے۔ ان مذاہب نے اپنے اپنے ادوار میں دنیا کا نقشہ تبدیل کر دیا اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوئے۔ آیئے اب ہم ان شہروں کی چند نمایاں خصوصیات پر روشنی ڈالیں۔

یروشلم:

یہ بہت ہی قدیم شہر ہے' اتنا قدیم کہ کوئی شخص یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ پہلے

کب وجود میں آیا تھا۔ تاہم اس کی معلوم تاریخ' 2500 سال قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے جب حضرت نوحؑ کا ایک بیٹا "سام" (شام) عرب سے نقل مکانی کر کے یہاں آکر' آباد ہو گیا تھا۔ تقریباً 1400 سال قبل جب حضرت موسیٰؑ کے فوجی کمانڈر یوشع بن نون نے فلسطین پر حملہ کیا' اس سے پہلے یہاں مصری حکام فرمان روائی کر رہے تھے۔ جب حضرت داؤد نے اسے فتح کیا تو یروشلم میں متعدد مذہبی اور ثقافتی روایات پائی جاتی تھیں۔ لفظ "یروشلم" اپنے اندر اس کے بانی کے داخلی جذبات کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے صحیح تلفظ کے بارے میں خاصے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہ دو حصوں...... "یرو" یا "جیرو" اور "سلم" سے مل کر بنا ہے۔ پہلے حصے کے معنی قصبہ یا شہر کے ہیں اور دوسرے حصے سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں امن پایا جاتا ہو۔ یا یہ لفظ "شامی" زبان کا ہے جس میں "یر" کے معنی قصبہ اور "سلم" کے معنی "پرامن" کے ہیں۔ عربی اور شامی دونوں زبانوں میں "یر" اور "سلم" کے معنی "قصبہ امن" کے ہیں۔ اس کا عربی تلفظ "یُورسلَمُ" (تاج العروس) ہے۔ ایک اور رائے یہ ہے کہ "یرو" جمع "شلم" ہے جس کے معنی ہیں ایسی جگہ جہاں اسلام کو غلبہ حاصل ہے۔ ایک اور معنی ہیں وہ جگہ جس کی بنیاد امن و سلامتی پر رکھی گئی۔ جب حضرت داؤد نے اسے فتح کیا تو یہ اسرائیلی حکومت کا صدر مقام بن گیا۔ تاہم جو کوئی بھی اس کا بانی یا مؤسس تھا' اس کا نام اسی نے رکھا اور وہ اسے فی الحقیقت ایک گہوارہ امن بنانے کا متمنی تھا۔ یروشلم ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے اور خدا کا وعدہ بھی ہے کہ اسے دنیا بھر کے پہاڑوں سے بلند تر بنایا جائے گا۔ (یسعیاہ 2:2) لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ خدا کا ہر وعدہ چند شرائط کے ساتھ مشروط ہوا کرتا ہے۔ جب کسی بستی کے لوگ خود ہی امن کی پرواہ نہ کریں تو خدا کا وعدہ منسوخ ہو کر رہ جاتا ہے۔

مکہ کے سمتِ نماز' یعنی قبلہ بننے سے پہلے' مسلمان یروشلم کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ 1000 قبل مسیح میں جب حضرت داؤدؑ نے اسے فتح کیا' تو انہیں یہاں سے بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا اور ان کے لیے یہاں شاندار محلات تعمیر ہوئے۔ ان میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد ایک روز اچانک انہیں خیال آیا کہ جب اسرائیل کے خداوند (لارڈ گاڈ) خیموں میں زندگی گزار رہے ہیں مجھے ان شاندار محلات میں قیام کرنا' زیب نہیں دیتا۔ اس پر انہوں نے خدا کی عبادت کے لیے ایک شایانِ شان "معبد" تعمیر کرنے کے لئے تین بار کوشش کی مگر

تینوں بار ناکام رہے۔ جس پر خدا نے انہیں سختی سے تنبیہہ کی جو ان الفاظ میں تھی: ''جا اور میرے بندہ داؤد سے کہہ' خداوند یوں فرماتا ہے کہ کیا تُو میرے رہنے کے لیے ایک گھر بنائے گا؟ کیونکہ جب سے میں بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لایا آج کے دن تک کسی گھر میں نہیں رہا بلکہ خیمہ اور مسکن میں پھرتا رہا اور جہاں جہاں میں سب بنی اسرائیل کے ساتھ پھرتا رہا کیا میں نے کہیں کسی اسرائیلی قبیلہ سے جسے میں نے حکم کیا کہ میری قوم اسرائیل کی گلہ بانی کرے' یہ کہا کہ تم نے میرے لیے دیودار کی لکڑیوں کا گھر کیوں نہیں بنایا؟'' (2 سیموئیل 7:5' 6' 7)

عہد نامہ عتیق میں یہ کہیں بھی دعویٰ نہیں کیا گیا کہ ''معبد'' (ہیکل) خدا کے حکم پر عمل درآمد کرتے ہوئے تعمیر کیا گیا تھا۔ درحقیقت معاملہ یہ تھا کہ حضرت داؤدؑ نے جتنی بار بھی ہیکل کی تعمیر کا ارادہ کیا کوئی نہ کوئی واقعہ ہو جاتا رہا جس کی وجہ سے وہ اس میں ناکام رہے۔ اس طرح وہ اسے تعمیر کئے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد حضرت سلیمانؑ نے اپنے والد کی دم نزع کی خواہش پوری کر دکھائی۔ اس کی تعمیر اس لیے بھی ضروری تھی کہ اسرائیل کی دنیاوی قوت کے لیے ایک مرکزی نقطہ فراہم ہو سکے۔ سلیمانؑ نے کام شروع کیا تو اس میں صنوبر اور دیودار کی لکڑی دل کھول کر استعمال کی اور اس میں سونے چاندی کے نقش و نگار پر بے پناہ اخراجات کئے۔ معبد کو بیش قیمت فرنیچر اور مرصع فرش سے سجایا گیا۔ ہزاروں ہنرمند کاریگروں اور کارکنوں نے سات سال میں جب اسے مکمل کیا تو بہت بڑے پیمانے پر جشن منایا گیا۔ اس میں دو قسم کی خوشیاں شامل تھیں' ایک تو یہ کہ اسرائیل نے 500 سالہ دشت نوردی کے بعد جائے قرار پائی اور خدا کے لیے موزوں ترین گھر تعمیر کرنے میں کامیاب ہوئے اور دوسری یہ کہ ان کے پرانے دشمن فرعون کی بیٹی نے اسرائیل کے بادشاہ سے شادی کر لی۔ اس موقع پر ایک بڑا چھتر یا ''کینوپی'' (CANOPY) بنائی گئی جس کی چھت کے اندر ستاروں کا مکمل نقشہ بنایا گیا۔ سلیمانؑ نے اسی خوبصورت کینوپی تلے اپنی نئی ملکہ اور محبوبہ کے ساتھ شادی کی پہلی رات گزاری۔ اسرائیل نے تو اس پر خوشی منائی لیکن خدا نے اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کیونکہ سلیمانؑ نے ایک غیر ملکی شہزادی کو اپنی بیوی بنا لیا تھا کیونکہ مذہباً اس کی اجازت نہیں تھی۔ (1 سلاطین 1:11' 9' 14' 31' 41؛ II تواریخ 29:9؛ نحمیاہ 26:13؛ استثناء 3:7' 4؛ خروج' 16:34؛ عذرا' 2:9)

معبد (ہیکل) کے افتتاح کے لیے مقررہ دن پر سلیمانؑ کو صبح سویرے اٹھنا تھا تاکہ وہ اس کے کھل جانے کا اعلان کر سکیں اور سب کے سامنے خدا کا شکر ادا کر سکیں۔لیکن آدھی رات کو ان کی آنکھ کھل گئی اور ''چھتر'' (کینوپی) پر منقش ستاروں کے نقشے پر نظر ڈالی تو انہیں وقت کے بارے میں مغالطہ لگ گیا۔ اور وہ پھر سو گئے۔ اتنا سوئے اتنا سوئے کہ معبد کے افتتاح اور اظہار تشکر کے لیے مقررہ وقت گزر گیا۔معبد کی چابیاں ان کے تکیئے کے نیچے ہی پڑی رہیں۔ اور کوئی شخص گھر کے اندر داخل نہ ہو سکا۔اس سے بھی زیادہ بری بات یہ ہوئی کہ دوسری بار کی نیند کے دوران سلیمانؑ نے خواب میں دیکھا کہ ایک شہتیر سمندر میں بہتا ہوا آیا اور وہیں آ کر جم گیا' کچھ سرکنڈے وغیرہ بھی لڑھکتے آئے جو اس سے لپٹ گئے اس طرح ایک جزیرہ بن گیا۔ کچھ دیر بعد اس میں ایک بادشاہ نمودار ہوا جس نے یروشلم میں داخل ہو کر اسے تباہ و برباد کر دیا۔ جب سلیمانؑ دوبارہ جاگے تو انہیں مقررہ وقت گزر جانے کا احساس ہوگیا' جس کی وجہ سے تقریب چند گھنٹوں کی تاخیر سے منعقد ہوئی۔لیکن معبد کے کھل جانے کے اعلان سے پہلے ہی ''جیہوواہ'' نے اس خواب میں اس معبد کی دشمن کے ہاتھوں تباہی کی پیشگوئی کر دی تھی۔ یہ خواب دراصل اس امر کی اطلاع تھی کہ اس معبد میں کیا ہونے والا ہے۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ یہاں بار بار تباہی آتی رہی۔کوئی بھی پچاس سالہ دور ہنگاموں اور تباہیوں کے واقعات کے بغیر نہیں گزر سکا' یہ ساری تباہ کاریاں اسرائیل کے دشمنوں کے ہاتھوں ہوئیں۔

سلیمانؑ کے بعد ان کا بیٹا ''رحبعام'' (Rehobaoam) ان کا جانشین بنا تو اسرائیلی قبیلوں کے درمیان شدید کشمکش شروع ہوگئی۔ دس قبیلوں نے بغاوت کر کے سماریہ میں اپنا مرکز قائم کر لیا۔صرف دو قبیلے رحبعام کے ماتحت رہے۔ بات یہیں تک نہیں رہی۔ اس کے اقتدار کے پانچویں سال مصر کے بادشاہ سیسق نے یروشلم کو لوٹا۔تاریخ کی اتنی شہادتوں کو سامنے رکھ کر ہم یروشلم کو جائے امن کیسے کہہ سکتے ہیں؟۔ اس بارے میں عہد نامہ عتیق کا کہنا یہ ہے:

''اور رحبعام بادشاہ کے اقتدار کے پانچویں برس میں مصر کے شاہ سیسق نے یروشلم پر چڑھائی کی اور اس نے خداوند کے گھر کے خزانوں اور شاہی محل کے

خزانوں کو لوٹ لیا بلکہ اس نے سب کچھ لے لیا اور سونے کی وہ سب ڈھالیں بھی لے گیا جو سلیمانؑ نے بنائی تھیں" (1 سلاطین 25:14' 26) ۔ اس کے بعد شاہ یہوآس (Jehoash) نے یروشلم میں لوٹ مار کی (2 سلاطین 13:14' 14) 586 قبل مسیح میں بابل کے نصر بخت نے حملہ کر کے اسرائیلیوں کو قیدی بنا لیا (1 سلاطین 25:24) ۔ 532 قبل مسیح میں معبد دوبارہ تعمیر ہوا یا اس کی مرمت وغیرہ کرائی گئی۔ لیکن اس کے بعد جلد ہی یونانی حملہ آور ہو گئے ۔"

بالآخر 186 قبل مسیح میں انٹونیوز نے یہاں مشتری (Jupiter) کا مجسمہ کھڑا کر دیا اور اسرائیل کی کتابیں تلاش کر کے یکجا کیں اور انہیں آگ لگا دی۔ یسوع مسیح نے بھی معبد (ہیکل) کی مکمل تباہی کی پیشین گوئی کی تھی (متی کی انجیل 1:24' لوقا 7:21)۔ پھر نسبتاً کچھ امن کا دور گزرا لیکن اس کے بعد رومنوں نے یروشلم پر حملہ کر دیا۔ 70 قبل مسیح میں ٹائیٹس نے اسے برباد کر دیا۔ پھر جب یہودیوں نے سر اٹھایا تو ہیڈریان (Hedrian) ان پر قہر بن کر نازل ہو گیا (134 ق۔م)۔ اس طرح یہ مقدس شہر ایک بار تباہ ہو گیا۔ تاریخ کی گواہی بالکل واضح ہے کہ اگر یروشلم نے کبھی سکھ کا سانس لیا تو وہ انہیں صرف مسلمانوں کے عہد اقتدار میں نصیب ہوا تھا۔

اجودھیا.....ہندوؤں کا محفوظ ترین شہر

ہندوؤں کی تاریخ میں اجودھیا بے حد متبرک شہر ہے۔ ویدوں میں کئی ایسے گانے ملتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ "یہ شہر خدا کا گھر ہے" (اتھروید) اور اس میں دیوتاؤں کی کئی بستیاں ہیں۔ بعد ازاں رام چندر کے باپ راجہ دسرتھ کے زمانے میں یہ بہت خوشحال اور پُرعظمت شہر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ جس کا ذکر والمیکی کی رامائن میں ملتا ہے۔ اس کے دوسرے تمام شہروں' قصبوں اور دیہات سے افضل و برتر ہونے کے اسباب کا تفصیلی ذکر "وایوپوران" میں زیر عنوان "اجودھیا مہاتم" آتا ہے۔ اجودھیا' اودھ کی راجدھانی (دارالحکومت) ہوا کرتی تھی۔ یہ دریائے سرجو جسے آج کل دریائے گوگرہ کہتے ہیں' کے کناروں پر آباد ہوا تھا۔ اس کی باقیات اجودھیا کے اردگرد فیض آباد میں اب بھی بکثرت ملتی

ہیں۔ بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ اس کی بنیاد ''منو جی'' نے رکھی تھی۔ اگر یہ درست ہے تو پھر یہ بہت ہی قدیم شہر ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کی وسعت اور خوشحالی کے بارے میں کئی مبالغے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً اسے راجاؤں کے محلات باغوں' پارکوں اور کھیل کے میدانوں کا شہر کہا جاتا تھا جس میں ہر گھر میں گھوڑوں اور ہاتھیوں کے اصطبل ہوا کرتے تھے۔ اس کے گرد مضبوط چار دیواری ہوتی تھی اور یہ بیرونی حملہ آوروں کی دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج کے خلاف بڑی کامیابی سے مقابلہ کر سکتا تھا۔ رام چندر کا والد دسرتھ ہر لحاظ سے بہت نیک پارسا منصف مزاج اور رحمدل حکمران ہوا کرتا تھا۔ راجہ کے ساتھ ساتھ اس شہر میں فاضل برہمنوں کی بھی بڑی عزت وتوقیر کی جاتی تھی' برہمن' کشتری اور ویس آپس میں اچھے تعلقات رکھتے تھے اور پُر امن زندگی گزارتے تھے۔ صداقت و دیانت کی کا دور دورہ تھا۔ یہ شہر اندرونی اور بیرونی ہر لحاظ سے مقدس سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے اجودھیا' یعنی بلاؤں سے محفوظ شہر کہا جاتا تھا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ رامائن کی تاریخی اہمیت بہت کم ہے کیونکہ الف لیلہ کی داستانوں کی طرح یہ بھی جنوں بھوتوں اور روحوں کی بے سروپا کہانیوں پر مشتمل ہے' یہاں مبینہ طور پر ایسے انسان بھی رہتے تھے جو اپنا روپ بدلنے' اور کسی بھی جانور کی شکل اختیار کرنے پر قادر ہوتے تھے۔

اجودھیا کے بارے میں دوسرا ذریعہ معلومات وید ہیں جن میں سے اتھر وید کا حوالہ پیچھے دیا جا چکا ہے۔ ویدک منتروں کا مطالعہ کرتے وقت اجودھیا کے متعلق ہمیں یہ سطور ملتی ہیں۔ ''اجودھیا' دیوتاؤں کا شہر ہے' جس کے خلاف کوئی بھی صف آرائی کرنے والا کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس میں آٹھ بڑی بڑی تماشہ گاہیں یا وسیع وعریض میدان اور نو دروازے ہیں۔ اس میں ایک ''ذخیرۂ نور'' ہے (مذہبی لوگ اپنی عبادت گاہوں کو ایسے ہی نام دیا کرتے ہیں) جو خیرہ کن روشنی اور چمک دیتا ہے۔ یہ روشنی اتنی پُر اسرار ہے کہ کوئی اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے اس شہر کو ناقابل تسخیر بنا دیا ہے۔ یہاں بھگوان خود نمودار ہوتا ہے......''

ایک طرف تو ہمیں اس شہر کی عظمت اور ناقابل تسخیر ہونے کے اتنے بلند بانگ دعوے ملتے ہیں اور دوسری جانب تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ بیرونی حملہ آوروں نے اس شہر کو تہس نہس کر دیا۔ یونانیوں' ایرانیوں' افغانیوں' مغلوں اور انگریزوں نے یکے بعد دیگرے اسے

اپنے گھڑ سواروں کے ذریعے پامال کر دیا۔ آج چند کھنڈرات کے سوا یہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا جو ماضی کی عظمتوں کی یاد دلا سکتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال داخلی انتشار و بدامنی اور بیرونی حملہ آوروں کی عسکری قوت کا مقابلہ نہ کر سکنے کا نتیجہ تھی۔ اس کی تباہی کے اسباب کا خود رامائن کی عبارتوں سے پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ یہاں کی آبادی کی اکثریت غلام مردوں اور غلام عورتوں (لونڈیوں) پر مشتمل تھی۔ ذات پات نے معاشرے کو کئی ٹکڑیوں میں بانٹ دیا تھا۔ امیر طبقے میں عیاشی اور شراب نوشی عام تھی۔ جوا بازی' دھوکہ دہی اور دھونس دھاندلی نے صحت مند روایات کو مسخ کر کے' نا قابل برداشت بنا دیا تھا۔

وہ ''گیا'' کہاں ہے جہاں بُدھ نے نروان پایا تھا؟

''گیا'' ایک اور مقدس شہر ہے جو کسی زمانے میں صوبہ بہار کے لیے باعثِ عظمت وسطوت سمجھا جاتا تھا' اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی یروشلم اور اجودھیا کی ہے۔ کسی زمانے میں یہ شہر اس طاقتور بادشاہ کا صدر مقام تھا جو وسیع علاقے پر فرمانروائی کرتا تھا۔ اور بدھ مت کے پیروکار ہندوستان' افغانستان اور وسطی ایشیا تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ عظیم مذہب جو بعد ازاں برما' چین اور جاپان تک پھیل گیا' اس نے یہیں جنم لیا۔ بدھ یہاں کیلئے کے ایک پرانے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا گیان دھیان میں مصروف تھا کہ اسے اچانک ایک روشنی نظر آ گئی ہے۔ جو اس کے مذہب کی بنیاد بن گئی۔ ''بدھ مت کے پیروکار اور ہندو' اسی لیے ''گیا'' کو مقدس سمجھتے ہیں۔ بدھوں کا عقیدہ ہے کہ اس شہر کی یاترا کرنے والے شخص کے نہ صرف اپنے پاپ دھل جاتے ہیں بلکہ اس کے آباؤ اجداد کے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ ہندو اسے اس لیے متبرک جانتے ہیں کہ ان کے عقیدے کے مطابق نسلِ انسانی کے مورث اعلیٰ برہما کے کچھ گناہوں کا تعلق بھی ''گیا'' سے تھا۔ اس وقت ''گیا'' کے نام کے دو شہر ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے کافی قریب ہیں۔ ایک ہندوؤں کا ہے اور دوسرا بدھوں کا۔ تبت کے بدھوں کا عقیدہ ہے کہ یہ ''گیا'' اصلی ''گیا'' کی صرف ایک علامت کے طور پر رہ گیا ہے۔ جبکہ اصلی ''گیا'' کو آسمان پر اٹھا لیا گیا ہے۔ (جیمز ہیسٹنگز: انسائیکلوپیڈیا آف ریلجین اینڈ ایتھکس جلد ششم صفحہ 186)۔ بدھوں کے ''گیا'' میں کیلئے ایک قدیم درخت 2400 سال کا

ہو چکا ہے جو ان کے لیے بے حد مقدس درخت کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ہندوؤں کا کہنا ہے کہ جو درخت مہا تما بدھ سے فی الحقیقت کوئی نسبت رکھتا ہے وہ پیپل کا درخت ہے اور وہ ہندوؤں کے ''گیا'' میں ہے۔ اشوک اعظم نے اپنے زمانے میں ''بدھ گیا'' میں ایک بہت بڑی عبادت گاہ بنائی تھی جس پر ایک لاکھ سونے کے سکے لاگت آئی تھی۔ اور شہر کے ارد گرد ایک مضبوط فصیل بھی تعمیر کرائی گئی تھی جسے ہر لحاظ سے نا قابل تسخیر بنا دیا گیا تھا۔ لیکن زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ وہ شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔ جب چینی سیاح فاہیان ہندوستان آیا تو اس نے اس کے کھنڈرات کو بھی تباہ شدہ حالت میں پایا۔ جب ہندوؤں نے بدھ مت کے خلاف بغاوت کی تو انہوں نے نہ صرف اس مذہب کو یہاں سے باہر نکال پھینکا بلکہ اس کے تمام اثرات کا بھی صفایا کر دیا۔ سیلون کے بدھوں نے کسی نہ کسی طرح اُس کیلے کے اصل درخت کی ایک شاخ حاصل کر کے اپنے ملک میں گاڑ دی جو جلدی جڑ پکڑ گئی اور تناور درخت بن گئی' یہ آج بھی موجود ہے۔

خدا کا مثالی شہر

یروشلم' بابل' طوس' بلخ' اجودھیا اور گیا' تاریخ کے مختلف ادوار میں' مختلف قوموں کی نظر میں ''خدا کے گھر'' ہوا کرتے تھے اور وہ آج بھی دنیا کے عظیم مذاہب کے معروف مراکز ہیں۔ اپنے اپنے دور میں وہ خدا کی طرف سے انسانوں کے لیے ''روشنی کے مینار'' کہلاتے تھے۔ لیکن ماسوائے مکّہ کے کوئی بھی ایسا مقدس شہر نہیں جو تباہ و برباد ہو کر مٹی کا ڈھیر نہ بن گیا ہو۔ ان کے ناقابل تسخیر ہونے اور ان کی خوشحالی کے بارے میں آسمانی وحی کی پیشگوئی کے دعووں کے باوجود ہم آج ان کے بکھرے ہوئے کھنڈرات صفحۂ ہستی پر پارہے ہیں جو اپنی زبانِ حال سے گزشتہ عظمتوں کی داستان سنا رہے ہیں۔

کیا ''یروشلم'' کے معنی ''محفوظ اور پُر امن'' شہر نہیں؟ کیا ''اجودھیا'' کے معنی ''ناقابل تسخیر شہر'' نہیں؟ کیا ''گیا'' کے معنی یہ نہیں کہ ''دوسرے شہروں کا اس شہر والوں کے ہاتھوں مسخر ہونا مقدر ہو چکا ہے'' تاہم تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یہ سب کے سب حملہ آور افواج کے گھوڑوں کے سموں تلے روندے جا چکے ہیں اور ان کے کھنڈرات سے صرف ماہرینِ آثار قدیمہ ہی جان سکتے ہیں کہ ماضی کی ثقافتیں کیا ہوا کرتی تھیں؟ اس پس منظر میں آیئے اب مکہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔

1: مکہ' ان سب کے مقابلے میں ایک الہامی اور وجدانی عکس پیش کرتا ہے' یہ واحد متبرک شہر ہے جس کا تقدس مجروح ہونے سے ہمیشہ محفوظ رہا ہے۔ پوری تحریری تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ کسی حملہ آور فوج کے قدم اسے چھونے نہیں پائے۔ جہاں تک تاریخ اور روایات ہمیں معلومات فراہم کرتی ہیں' اس شہر کی بنیادیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھی تھیں جو عہد نامۂ عتیق پر ایمان رکھنے والوں کے لئے بزرگ ترین ہستی تھے اور جن کا یہودی اور عیسائی

دونوں برابر احترام کرتے ہیں۔ ہندو مذہبی لٹریچر اور روایتی اعتقادات میں انہیں "برہماجی" (Brahmaji) اور پارسی لٹریچر اور روایات میں انہیں "مہاباد" کہا جاتا ہے عہد نامہ عتیق کے اس ابراہام (ابراہم)' ہندو لٹریچر کے "برہما" اور پارسی روایات کے "مہاباد" کو "خدا کا ایک گھر" خواب میں دکھایا گیا جو ایک خشک اور بنجر صحرا میں گھری ہوئی اور انتہائی کم گنجان آبادی میں واقع تھا۔ اسی خواب میں انہیں مزید مطلع کیا گیا کہ اس جگہ پر خدا کا یہ گھر مدتِ مدید سے ہے لیکن انسانوں کی نگاہ سے اوجھل رہا ہے۔ اس طرح مکہ ان تمام قوموں کے لیے ایک مقدس شہر ہے جو اپنا روحانی نسب حضرت ابراہیمؑ سے جوڑتے ہیں۔ جو نہ صرف پیغمبر تھے بلکہ خانوادۂ پیغمبری کے جدّ امجد بھی تھے۔ انہوں نے یہ گھر انہی قدیم بنیادوں پر استوار کیا جو انہیں خواب میں دکھائی گئی تھیں۔

2: عام طور پر بڑے شہر' بشمول ان شہروں کے جو مذہبی' ثقافتی اور سیاسی مراکز کہلاتے ہیں' سازگار جغرافیائی اور موسمیاتی حالات کی بنا پر وجود میں آتے ہیں لیکن اس صحرائے عرب میں یہ مقدس گھر ایسی وادی میں تعمیر ہوا جو بالکل خشک و بنجر تھی جہاں ضروریاتِ زندگی نہ ہونے کے برابر تھیں اور کوئی ایک سازگار سبب بھی موجود نہ تھا کہ جس کی بنا پر ایک تاریخی شہر وجود میں آ جاتا۔ اس مقدس گھر کی کہانی ایک کمزور سی خاتون کی آمد سے شروع ہوتی ہے جس نے اپنے شیر خوار بچے کو اٹھایا ہوا تھا۔ اس کا شوہر کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ حضرت ابراہیمؑ تھے۔ وہ اپنی بیوی اور بچے کو لے کر اس بنجر قطعہ زمین پر پہنچے جہاں قدیم مقدس گھر تھا۔ ان کے پاس صرف چند دن کے لیے اشیائے خوراک تھیں۔ انہوں نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کے لیے کیا' انہیں یہاں لانے کا مقصد اس قدیم گھر کو انسانی تاریخ کے مرکز کے طور پر واپس لانا اور خدائی سکیم کے مطابق اسے اس کا مقدر رشدہ کردار ادا کرنے کا موقع دینا تھا۔ جب ابراہیمؑ اپنی اس جرأتمند بیوی اور اس کی گود میں لیٹے شیر خوار بچے کو اس بیابان میں بے یار و مددگار چھوڑ واپس جانے لگے تو بیوی نے بس ایک ہی سوال پوچھا...... "کیا آپ کو ایسا کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے"؟ تو اس شفیق شوہر کی زبان شدتِ جذبات کی وجہ سے صرف اتنا نکل سکا "ہاں"۔ یہ سن کر وہ صابر و شاکر خاتون بولی...... "اگر ایسا ہے تو اللہ ہمیں تباہ نہیں ہونے دے گا" اور وہ فولادی عزم کے ساتھ آئندہ آنے والے حالات کے لیے تیار ہو گئی۔

3: تاریخ بتاتی ہے کہ بعد ازاں اُسی جگہ سے پانی کا ایک چشمہ پھوٹ نکلا جوان بے یارومددگار ماں بیٹے کے لیے ایک خطیر سرمایہ حیات ثابت ہوا۔ بعد ازاں یہاں سے گزرنے والے کاروانوں کے لیے یہ ستانے اور آرام کرنے کی ایک اچھی جگہ بن گئی۔ چشمے پر ڈیرہ لگانے والے مختلف کاروانوں نے آپس میں اشیا کا تبادلہ شروع کر دیا' پھر ہوتے ہوتے یہ ایک تجارتی مرکز بن گیا۔ پانی استعمال کرنے والے لوگ اس ماں بیٹے کے لئے وسیلہء روزی بن گئے۔ چند برسوں میں وہ بچہ جوانی کی منزلیں طے کرنے لگا۔

4: تقریباً اسی زمانے میں ابراہیمؑ پھر ادھر آ گئے تا کہ یہ دیکھ سکیں کہ جس بیوی اور بچے کو انہوں نے تقدیر کے حوالے کر دیا تھا وہ اب کس حال سے گزر رہے ہیں؟ انہیں اچھے حال میں دیکھ کر ان کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اسی دوسرے دورے کے دوران باپ نے بیٹے کے ساتھ مل کر اس مقدس گھر کی' اس کی پرانی بنیادوں پر' دوبارہ تعمیر شروع کر دی۔ کھجور کے تنوں کو بطور ستون اور پتوں کو عارضی سی چھت بنانے کے لیے استعمال کیا۔ اس کام کو کوئی پُراسرار تقریب نہیں بنایا گیا اور نہ مختلف قسم کی خوشبودار بوٹیاں جلانا ضروری سمجھا گیا۔ نہ سونے چاندی کے سامان کی نمائش کر کے یہاں آنے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ خدا کا قدیم اور مقدس گھر تھا جو اس وقت 125 سال پرانا تھا۔ لیکن ابراہیمؑ اور ان کے نوجوان بیٹے اسماعیلؑ نے نہایت خلوص کے ساتھ اسے دوبارہ تعمیر کیا تا کہ یہاں خدا کی عبادت کی جا سکے۔

5: دورانِ تعمیر باپ بیٹا مترنم لہجے میں' جیسا کہ مزدور کاریگر کچھ نہ کچھ گاتے رہتے ہیں یہ کلمات کہتے رہے "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ۔ ("اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے' تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے ربّ ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیعِ فرمان) بنا' ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم (مطیع) ہو......سورۃ البقرہ آیات 127' 128)

6۔ بوڑھے باپ نے اس موقع پر یہ دعا بھی مانگی تھی۔ "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِناً وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ"۔ ("اے میرے رب اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں کو ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے"......سورۃ البقرہ آیت 126) قدرتی بات ہے کہ

جب بھی کوئی شخص کوئی عمارت بناتا ہے یا کسی شہر کی تعمیر کے لیے بنیادیں رکھتا ہے تو اس کے دل میں اسی قسم کی خواہشیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس بوڑھے شخص کی دعا کو درجۂ قبولیت ملنے میں دیر نہ لگی اور خدا نے جواباً فرمایا...... ''وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى''......(اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا اور (حکم دیا کہ) جس مقام پر ابراہیم کھڑے ہوئے تھے اس کو نماز کی جگہ بنا لو......سورۃ البقرہ آیت 125)۔ اس طرح ابراہیمؑ نے جو دعائیں مانگی تھیں' ان کا ہر ہر لفظ قبول ہوا اور اس کے اثرات سامنے آئے۔ اور یہ آبادی رفتہ رفتہ ایک عظیم شہر بن گئی جہاں دنیا کے کونے کونے سے لوگ کھینچے ہوئے اس کی طرف جانے لگے' ہر رنگ اور ہر نسل اور ہر زبان بولنے والے لوگ جوق در جوق آنا شروع ہو گئے۔ ان میں غربا بھی تھے' امیر بھی' محکوم بھی اور حکمران بھی' جو سب ایک ہی خدا اور پوری انسانیت کے خالق کے سامنے جھکنے کے لیے آ رہے تھے۔ ان کا تانتا اب تک بندھا ہوا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ خدا کے اس گھر' یعنی بیت اللہ میں آنے والوں کی تعداد جتنی بڑھتی رہی' اس کے گرد شہر کی خوشحالی اور اہمیت میں بھی آئے دن اضافہ ہوتا رہا۔

7: اگر مکہ پر دشمن حملہ آور نہیں ہوا تو کہنے والے بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ یہ محض اتفاق سے محفوظ رہ گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ طاقتور دشمنوں نے کئی بار اس پر حملہ کیا اور ہر بار ''مخصوص'' قسم کے حالات پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے دشمن پسپا ہوتے رہے۔ یہاں کے لوگوں کے پاس انہیں پسپا کرنے کے لیے درکار فوجی قوت نہیں تھی' انہوں نے کھلم کھلا اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیا لیکن ان کے اندر یہ یقین کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ خدا اپنے گھر کی خود حفاظت فرمائے گا۔ چنانچہ ہر دفعہ ایسا ہی ہوا کہ کوئی ''خاص قسم'' کے حالات رونما ہو گئے اور دشمن کو پسپا ہو جانا پڑا۔ اس سے لوگوں کا یقین مزید بڑھ گیا کہ کوئی خفیہ قوت موجود ہے جو اس کی حفاظت کا بندوبست کر دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا معجزہ ہے جس کی تاریخِ انسانی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

8: چار عظیم فوجی قوتوں نے مختلف اوقات میں اس کے خلاف چڑھائی کی۔ یہ عرب کی سرحدوں پر رہنے والی قوتیں تھیں' یونانی' رومی' ایرانی اور اہلِ حبشہ۔ سکندرِ اعظم کی عسکری

ذہانت ایک مسلمہ امر تھی۔ یورپ' افریقہ' ایران' افغانستان اور ہندوستان میں کوئی بھی نہیں تھا جو اس کے مقابلے میں آ سکتا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس نے ہر طرف فتوحات کا ڈنکا بجانے کے بعد جب مکہ کو زیر کرنے کی بات سوچی تو موت نے اسے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ البوس گولوس سے لے کر نیرو تک بھی رومی شہنشاہ جزیرہ نمائے عرب کو زیر تسلط لانے کا خواب دیکھتے رہ گئے۔ ابن قتادہ نے لکھا ہے کہ رومی بادشاہ نے قصی کو مکہ پر گرفت مضبوط کرنے کے لیے مدد دی کیونکہ اسے امید تھی کہ یہ رومیوں کے زیر اثر رہے گا لیکن مکہ میں آ کر وہ اس سے بالکل بے نیاز اور خودمختار ہو گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد الاسد قبیلہ کے عثمان بن الحوارث نے عیسائیت قبول کی تو رومی بادشاہ نے اسے تاج پہنا دیا اور اس خیال سے مکہ بھیجا کہ اہل مکہ اسے اپنا حکمران تسلیم کر لیں گے مگر انہوں نے اس امر کے باوجود اسے قبول نہ کیا کہ وہ رومنوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل مکہ شام اور فلسطین کے ساتھ تجارت کی وجہ سے روزی کما رہے تھے جہاں رومنوں کی حکمرانی تھی۔ ابو عامر' درویش نے اہل مکہ کو رومنوں کے حملے کی دھمکی دی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ عرب رومنوں کے خلاف مدافعت کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ عین اسی وقت رومنوں اور ایرانیوں کے مابین لڑائی چھڑ گئی جس کی وجہ سے رومنوں کو عرب کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ ملا۔

عرب کے باہر تیسری فوجی قوت ایرانیوں کی تھی' اور وہ اتنے مضبوط تھے کہ انہوں نے کئی بار رومنوں کو شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ مشرق کی جانب ان کے مقبوضات افغانستان میں اور کچھ ہندوستان میں تھے' سرزمین عرب میں یمن بھی اس کی وفاداری کا دم بھرتا تھا۔ شہنشاہ ایران نے اس زعم میں کہ مکہ بھی اس کے ہاتھ میں ہے' یمن میں اپنے گورنر کو حکم دیا کہ وہ آدمی بھیج کر' پیغمبر خدا ہونے کا دعویٰ کرنے والے کو شاہی دربار میں حاضر کرے۔ اگر وہ آنے سے انکار کریں تو ہتھکڑی پہنا کر لایا جائے۔ لیکن جونہی یہ شاہی فرمان جاری ہوا رومنوں اور ایرانیوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ بعد میں اسے اس طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی نہ ملی۔

جب شاہ حبشہ نے مکہ کی شہرت اور خوشحالی دیکھی تو حسد سے آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے طاقت کے بل بوتے پر ایک مذہبی مرکز قائم کرنے اور مکہ کو تباہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کا کام اس نے گورنر یمن کو سونپ دیا۔ اس گورنر کا نام ابراہہ تھا۔ جس نے

صنعا میں ایک مسیحی کلیسا تعمیر کر کے ایک نیا مرکز قائم کر دیا۔ اور ایک زبردست پروپیگنڈہ مہم کے ذریعہ عربوں کو مکہ سے دور بھگانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ساتھ ہی اس نے اس مقدس شہر پر حملے کے لیے لشکر تیار کر لیا جس کے پاس ہر قسم کے اسلحہ کے علاوہ ہاتھیوں کی بھی بڑی تعداد تھی۔ عرب ہاتھیوں سے خائف تھے کیونکہ انہیں ان کے خلاف لڑائی کا نہ کوئی تجربہ تھا اور نہ قدم جما کر لڑنے کی ہمت کر سکتے تھے۔ جونہی یہ لشکر دور سے دکھائی دیا تو سردارانِ مکہ میں سے ایک معتبر ترین شخصیت عبدالمطلب نے فیصلہ کیا کہ شہر خالی کر دیا جانا چاہیے کیونکہ اتنی بڑی قوت کے خلاف لڑنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ سارا شہر خالی ہو گیا۔ جب ابراہہ نے کسی کو میدان میں نہ پایا تو وہ پریشان ہو گیا' اس کے آدمیوں نے عبدالمطلب کے اونٹ پکڑ لئے جو قریب ہی کسی جگہ پر چر رہے تھے۔ ابراہہ نے رؤسائے مکہ کو بات چیت کے لیے طلب کیا اور کہا کہ اگر آپ کو کوئی بات کرنی ہے تو کر لیجئے' میں ہر بات سننے کے لئے تیار ہوں' آپ اپنا وفد بنا کر بھیجئے۔ جب وفد سامنے آیا تو عبدالمطلب نے کہا کہ تمہارے آدمی میرے اونٹوں کو پکڑ لائے ہیں' آپ یہ اونٹ واپس دلا یئے۔ ابراہہ نے جواب دیا' ''اچھی بات ہے'' اور دل میں سوچا کہ یہ لوگ بات چیت کے لیے تیار ہو گئے ہیں اب یہ بھی ممکن نظر آتا ہے کہ اصل منصوبے کو پُر امن ذرائع سے منوایا جا سکتا ہے۔ پھر بولا'' آپ لوگوں نے عجیب وغریب درخواست پیش کی ہے۔ میں تو اتنی بڑی فوج اسی لئے لایا ہوں کہ تمہارے اس مقدس شہر کو پامال کر دوں' میں تمہیں موقع دینا چاہتا ہوں کہ مجھ سے کوئی معاہدہ کر لو لیکن اس نازک موقع پر آپ نے کوئی بات کہی ہے تو وہ یہ ہے کہ ہمارے اونٹ واپس کر دیے جائیں''۔ عبدالمطلب نے کہا'' جی ہاں' یہ بالکل ٹھیک ہے میں نے اونٹ اس لیے مانگے ہیں کہ یہ میرے ہیں جہاں تک کعبے کا تعلق ہے' اس کا آقا اور مالک کوئی اور ہے جو جانتا ہے کہ وہ اسے دشمنوں سے کیسے بچائے گا'' ابراہہ اس جواب اور اس کے انداز سے بڑا متاثر ہوا اور بالآخر وہی کچھ ہوا جس کی طرف عبدالمطلب نے اشارہ کیا تھا۔ ابراہہ کی زبردست فوج جو ایک کیمپ میں تھی طاعون قسم کی بیماری کے اچانک حملے سے تتر بتر ہو گئی' ہزاروں موقع پر مر گئے باقی فرار ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہاتھیوں پر ابابیل نے کنکریاں برسائیں جو ان کے پنجوں اور چونچوں میں پکڑی ہوئی تھیں۔ جس جس ہاتھی کو وہ لگتیں وہ گر کر ہلاک ہو جاتا تھا۔

یہ تاریخی واقعات ہیں جن کا انکار کسی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ پوری تاریخ میں مکہ کوئی قابل ذکر فوجی قوت نہیں رہا۔ طاقتور فوجیں کسی نہ کسی وجہ سے اس پر حملہ آور ہوتی رہی ہیں لیکن کسی کو اس شہر میں قدم رکھنے کی مہلت نہیں ملی۔ تمام دوسرے مقدس شہروں کو ان کے پیروکار ناقابل تسخیر سمجھتے رہے ہیں' تباہ ہو گئے یا ان کی آبادی کا انخلا عمل میں آ گیا اور ان کی عظمت خاک کا ڈھیر بن گئی۔ دوسری طرف مکہ مضبوط فوجی دفاع نہ رکھنے کے باوجود صحیح معنوں میں ناقابل تسخیر بنا رہا اور آج تک ایسا ہی چلا آ رہا ہے۔ یہ ایک معجزہ ہے جسے وہی لوگ سمجھتے ہیں جنہیں خدا نے عقل وخرد عطا کی ہو۔

8: حضرت سلیمانؑ نے جو ہیکل (معبد) تعمیر کیا تھا آج موجود نہیں ہے' نہ اجودھیا اور نہ ''گیا'' موجود ہے' ان سب کی برکات مکہ میں خانہ کعبہ میں منتقل ہو چکی ہیں۔ وہ نہ صرف محفوظ ہے بلکہ ان شاءاللہ آئندہ بھی محفوظ رہے گا۔ طلبائے تاریخ کے لیے یہ ایک معجزہ ہے اس کو بچانے میں اللہ تعالیٰ کی منشا کا دخل ہے جس نے دشمنوں کو اس سے دور رکھا ہے۔

9: لیکن مکہ کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ یہ امن وسلامتی کی جگہ ہے اور ایسی جگہ ہے جسے کبھی کوئی دشمن فتح نہیں کر سکا' اس کے ایک دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ یہ اپنے تمام دشمنوں کی گردنیں توڑ دے گا۔ لہٰذا آیئے اس شہر کی تاریخ کا مطالعہ کریں تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ یہ اپنے اندر مضمر معنوں کے مطابق دشمنوں کی گردن توڑ سکا ہے یا نہیں۔ جب تاریخ کو دیکھتے ہیں تو سب سے پہلے یونانی فاتح' سکندر اعظم آتا ہے جس نے یکے بعد دیگرے مُلک مُلک فتح کرتے ہوئے اپنے دور کی دنیا کا سیاسی نقشہ تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ اس وقت کوئی بھی ایسی فوجی قوت نہیں تھی جو اس کے حملے کو پسپا کر سکتی۔ لیکن اس نے جونہی مکہ کی طرف میلی آنکھ اٹھائی' خدائی ہاتھ نے فی الواقعہ اس کی گردن توڑ کر رکھ دی۔ رومنوں نے بہت سے یورپی ممالک اور افریقہ اور ایشیا کے بہت سے حصے فتح کر لیے لیکن جونہی انہیں عرب کو فتح کرنے کا خیال آیا ان پر اہل فارس ٹوٹ پڑے اور عملاً جنگی اہمیت کے حامل شہر قسطنطنیہ کی دیواروں تک جا پہنچے۔ کچھ عرصہ بعد جب اہل فارس نے عرب پر حملے کا منصوبہ بنایا تو ان کے خلاف رومی اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ یہ اس معجزے (کہ کوئی مکہ کو فتح نہیں کر سکا) کا منفی پہلو ہے' اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اگرچہ مکہ کے پاس کوئی فوجی صلاحیت نہیں تھی' اپنے دفاع کے

لیے کسی قسم کی باقاعدہ فوج نہیں تھی نہ سونا چاندی تھی اور نہ خزانہ تھا تاہم اس نے دو عشروں کے مختصر عرصے میں ایک طوفان کی طرف مغرب میں رومن ایمپائر اور مشرق میں ایرانی ایمپائر کو ملیا میٹ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں نے اپنی تہذیب اور ثقافت کی بالادستی قائم کر دی۔ اہل مصر اور اہل حبشہ کو بھی ان کے سامنے جھک جانا پڑا۔

10: قرآن نے کتنے خوبصورت انداز میں ایک مختصر سی سورۃ ''البلد'' میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس قدیم شہر کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس شہادت کی بنیاد پر ایک دلیل آگے بڑھائی ہے۔ بہت سے لوگ سوچتے ہیں کہ یہ کائنات محض حادثے یا اتفاق سے ظہور میں آ گئی ہے لیکن یہ سوچ بالکل غلط اور بے ہودہ ہے۔ اس مقدس شہر کی تاریخ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس مادی دنیا کی تخلیق کے پیچھے خدا کا ہاتھ ہے۔ 125 سالہ ابراہیمؑ اور ان کے جواں سال بیٹے اسماعیل نے خدا کی ہدایت پر کعبے کو اس کی پرانی بنیادوں پر تعمیر کیا' یہ کام انہوں نے کسی تیسرے انسانی وسیلے کی مدد کے بغیر انجام دیا۔ دوران تعمیر وہ بار بار دعا کرتے رہے کہ خدا ان کی اس قربانی اور محنت کو شرف قبولیت بخشے۔ انسان کو روحانی مدارج پر فائز ہونے کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے' خدا کا گھر بھی ایک سادہ سی عمارت تھی جس میں نہ بیش قیمت لکڑی استعمال ہو سکی' نہ سونا چاندی اور قیمتی پتھر استعمال ہوئے جیسا کہ یروشلم' اجودھیا' گیا اور بابل کی عمارتوں میں ہوا تھا۔ نہ ہی مکہ کے پاس اپنے دفاع کے لیے کوئی مستقل فوج تھی۔ اس کے باوجود خدا کا گھر اور اس کے اردگرد آباد شہر مکہ مسلسل ترقی کرتا رہا۔ جو صدیوں سے قائم و دائم ہے جبکہ دیگر متذکرہ شہر جو مقدس اور ناقابل تسخیر سمجھے جاتے تھے' تباہ و برباد ہو گئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ ان معبدوں میں رہنا پسند نہیں کرتا جنہیں ان کے تعمیر کرنے والے اپنی شان و شوکت کے اظہار کے لیے بناتے ہیں۔ وہ انسان میں خلوص اور سادگی کو پسند کرتا ہے' وہی سادگی اور خلوص جس کا پیکر ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ تھے اور جس کا اظہار بیت اللہ کی تعمیر میں ہوا' یہ واقعہ کہ یہ عظیم گھر ہر قسم کی آفتوں اور بیرونی حملوں سے محفوظ رہا ہے' خدا کی زبردست قدرت اور طاقت کی موجودگی کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔

11: بیت اللہ ان قوتوں کے لیے ایک مرکز اور ایک علامت کے طور پر تعمیر ہوا

جنہوں نے بنی نوع انسان کو مختلف زنجیروں کی جکڑ بندیوں' مثلاً رنگ و نسل وغیرہ کی تعصّبات' سے نجات دلانا تھی جو مختلف طبقوں میں مال و دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کی بنا پر وجود میں آ گئی تھیں۔ وَمَآ اَدْرٰکَ ما العَقَبَةُ ۔ فَکُّ رَقَبَةٍ۔ اَوْاِطْعَام فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ۔ یَتِیمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْمِسْکِینًا ذَامَتْرَبَةٍ۔ (تم کیا سمجھے کہ وہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا.....سورۃ البلد آیات 12 تا 16)۔ یہ چند بنیادی اور مستقل اقدار ہیں جن کی علامت بیت اللہ ہے۔ لہٰذا یہ ہمیشہ نا قابل تسخیر رہے گا۔ اسلام ایسی دنیا وجود میں لانا چاہتا ہے جس میں رہنے والے سب کے سب امن و سلامتی سے زندگی گزاریں اور ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے محفوظ رہیں۔

زرتشتوں اور اہلِ بابل کے مقدس شہر

بابل' شامیوں کے مذہبی نظام سے تعلق رکھنے والوں کے لیے ایک مقدس شہر ہے۔ اس کے آثار اب بھی بغداد کے گردونواح میں بکھرے پڑے ہیں۔ بابل اگرچہ آج صفحۂ ہستی سے نابود ہو چکا ہے مگر بابلی تہذیب نے انسانی تاریخ و تمدن پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ دن اور رات کو 24 گھنٹوں میں تقسیم کرنا' گھنٹے کو 60 منٹوں میں اور ہر منٹ کو 60 سیکنڈوں میں تقسیم کرنا' بابل کے ذہین سائنسدانوں کا کارنامہ تھا۔ بابل کے معلق باغات' اس کی رصد گاہیں (Observatories) جو اجرام فلکی کی گردش کا مطالعہ کرتی تھیں اور انہیں انسانوں کے مقدر سے جوڑنے کی کوشش کرتی تھیں انہی سائنسدانوں کی مساعی کا حصہ تھیں۔ انہوں نے تحریر کی زبان کو ترقی دی' بڑے بڑے مجسمے نصب کر کے فنِ تعمیرات کو فروغ دیا' کئی ممالک نے ان کے علوم و فنون سیکھ کر اپنے ممالک کے کلچر کو فائدہ پہنچایا۔ رفتہ رفتہ ان کے پڑوسی ایرانی ان سے بھی آگے بڑھ گئے' انہوں نے دریا کا رخ تبدیل کر دیا اور شہر کے اندر داخل ہو کر اسے زیروزبر کر دیا۔ اس طرح ایک اور ''خدا کا گھر'' (باب' ایل) صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔

ایرانی شہنشاہیت ایک اور عظیم فوجی قوت کے طور پر ابھر آئی۔ اس نے کئی بار رومنوں کو شکست دی اور روم کی فصیلوں تک جا پہنچی۔ اس نے یونان کو بھی اپنے قدموں تلے

روند دیا۔ مشرق میں اس نے ہندوستان کے کئی حصوں کو بھی تاراج کیا۔ پھر عرب ایک عظیم قوت بن کر ابھر آئے جنہوں نے ان کے معبدوں میں ہمیشہ جلتی ہوئی آگ کو بھی بجھا دیا۔ مغرور ایرانیوں کے نزدیک عرب خانہ بدوش' دیگر وحشت گروں سے کسی طرح بھی بہتر نہ تھے۔ لیکن انہوں نے طوس اور بلخ میں آتش پرستوں کے عظیم معبدوں کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا جہاں صرف سچے اور واحد خدا کی عبادت ہونے لگی۔

نبی اکرمؐ کی صداقت پر درختوں کی گواہی

قرآن کریم کہتا ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ ۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ ......(کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔ یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں.....سورۃ ابراہیم آیات 24'25)

اہل فکر کے لیے قرآن نے ہر قسم کی دلیل دی ہے' تا کہ ان پر خدا کے وجود' اس کے کلام اور حضرت محمدؐ کے مشن کی صداقت واضح کی جاسکے۔ ان دلائل میں سے بہت سے مذہبی افکار کو سائنسی اور نفسیاتی فکروں کے ساتھ شامل کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ تینوں اقسام کے افکار' ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ اور ایک دوسرے کے اس طرح موید ہیں کہ کسی صحیح الفکر شخص کے لیے انہیں قبول کئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ اہل کتاب کو نبی اکرمؐ کے مشن کی طرف بلانے اور اس کی سچائی کی جانب متوجہ کرنے کے لئے قرآن نے ایک ''چوطرفہ'' (Quadrilateral) دلیل پیش کی ہے اور اسے اتنی مضبوط بنا دیا گیا ہے کہ اس کو مسترد کرنے کے کوئی گنجائش ہی باقی نہیں ماسوائے اس صورت کے کہ سننے والے کا ضمیر ہی مردہ ہو چکا ہو اور اس کے اندر کی ضد' تعصبات اور دشمنی کے جذبات نے ضمیر کا گلا دبا کر اسے ہمیشہ کے لئے سلا دیا ہو۔

اوپر کی سطور پر میں ''چوطرفہ دلیل'' کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کی ذرا وضاحت کی ضرورت ہوگی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسئلہ زیر بحث پر چار پہلوؤں یا چار زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک سابق پیغمبر نے اپنے پیروکاروں کو حضرت محمدؐ کی آمد کی خوشخبری سنائی۔ اس کے چند ہزار سال بعد اس سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی کے طور پر آنے والے پیغمبر نے اس پیشین گوئی کی تصدیق کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا ابھی وقت نہیں آیا لیکن اس کا آنا یقینی ہے۔ پھر ایک اور سلسلۂ نبوت سامنے آتا ہے جس کے ظہور کا ملک' اس کی زبان اور اس کا زمانہ پہلے سلسلۂ نبوت سے بالکل مختلف ہے۔ اس نے بھی یہ پیشین گوئی پوری شدومد کے ساتھ دوہرائی۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ہی شخص یا ہادیٔ موعود (Promised Teacher) کے بارے میں ہمارے پاس دو دوستوں اور دو مخالفوں کی گواہی موجود ہے لیکن وہ بات ایک ہی کہتے ہیں۔ جب دو مخالف یا رقیب ایک نقطے پر متفق ہو جائیں تو پیشگوئی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ یہ وہ گواہی یا شہادت ہے جس میں دو دوست یعنی اسرائیلی سلسلۂ پیغمبراں کا پہلا قانون دہندہ (Law giver) اور اس سلسلے کا آخری پیغمبر اور دو مخالفین یعنی آریائی نسل کے دو نبی' متفق الرائے پائے گئے ہیں۔ لیکن یہ دو دوست اور دو مخالفین ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک نہ صرف انسان کا محسن اور خیر خواہ ہے بلکہ خدا کی طرف سے ایک مشن پر بھی مامور ہے اور وہ سچائی وصداقت کے لیے جان دینے کو بھی تیار رہتا ہے۔ جس طرح سینکڑوں نابیناؤں کی گواہی' ایک بینا شخص کی گواہی سے متضاد ہونے کی وجہ سے اپنی وقعت کھو دیتی ہے۔ اسی طرح ایک رسول اور ایک پیغمبر کی گواہی عام لوگوں کی گواہیوں سے مقابلے میں بیحد طاقتور اور بیحد قابل اعتبار ہوتی ہے۔ جب ایک معاملے میں دو مخالفوں کی گواہی بھی یکساں ہے تو ہمارے موقف کی مضبوطی میں مزید استحکام پیدا ہو جاتا ہے اور پیشین گوئی کی صحت کی تائید مزید ہو جاتی ہے۔ روشن دن کی روشنی میں مزید استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہمارے پاس ایک صداقت ہے جس پر ہمارے دو مخلص دوستوں اور دو مخالفین میں کامل اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے مابین دیگر نقاط پر بہت سے اختلافات موجود ہیں۔ یہ اس امر کا ٹھوس ثبوت ہے کہ یہ اتفاق رائے محض اتفاقاً پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک نے دوسرے کی نقل اتاری ہے۔

دونوں کے درمیان اگرچہ شدید رقابت ہے اور ایک دوسرے سے بہت سی چیزوں پر سخت اختلافات رکھتے ہیں۔ زمانے کے لحاظ سے بھی ان کے مابین بہت فاصلہ ہے مگر ان کا مقصد ایک ہی ہے' یعنی وہ یہاں ایک ہی بات کہہ رہے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے اس پیشینگوئی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور دوسری انفرادی پیشگوئیوں پر کہیں زیادہ فوقیت رکھتی ہے۔ تاہم معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد یہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہی پیشگوئی جس کی تصدیق دو رقیبوں نے کی تھی اس کی صحیح تعبیر حضرت محمدؐ کی بعثت سے سامنے آ گئی ..... اور یہ زیر بحث پیشگوئی کا چوتھا زاویہ یا چوتھا پہلو ہے۔ لیکن یہ محض اس کے اعادے یا دوہرانے کا معاملہ نہیں۔ کیونکہ یہ ایک ان دیکھی اور انجانی حقیقت کے بارے میں اپنے اندر بہت سی معلومات اور جانکاری رکھتا ہے اور خداوند تعالیٰ کے معجزے کی روشن ترین نشانی ہے۔ بہ الفاظ دیگر ایک شریعت کے مؤسس نے اس واقعہ کے رونما ہونے سے ہزاروں سال پہلے خدا کی طرف سے عطا کردہ علم کی بنیاد پر یہ خوشخبری سنا دی تھی۔ پھر ایک اور پیغمبر نے جو سینکڑوں سال بعد آیا اس کی تصدیق کر دی۔ بعد ازاں ایک اور پیغمبر ایک اور ملک میں مبعوث ہوا جو ایک اور نسل سے تعلق رکھتا تھا اور بالکل ہی مختلف زبان میں بولتا تھا' نے اس کی توثیق کر دی اور اس زبان میں کی جو اس کی زبان میں اس پر اتاری گئی تھی۔ اور اب قرآن کا یہ دعویٰ جو اس پیشگوئی کی تکمیل سے قبل کیا گیا بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ باوجود اس امر کے کہ یہ نبی اُمّی تھا' یعنی وہ کوئی کتاب خود پڑھ نہیں سکتا تھا اور ان لوگوں میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا جو سب کے سب اسی کی طرح بے پڑھے لکھے تھے' اس نے وہی پیشینگوئی دوہرائی۔ اس ماحول میں تو جعل سازی کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہ تھا کہ وہ پہلے سے کی ہوئی پیشگوئی کا از خود مصداق بن کر کھڑا ہو جاتا۔ اس قسم کی پیشینگوئی جو حالات کے ماوریٰ ہو ان لوگوں کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہے جو مختلف خطوں اور زبانوں میں اتارے گئے آسمانی صحیفوں کا مناسب حد تک علم رکھتے ہیں۔

ایک جامع دلیل:

قرآن مجید کہتا ہے: وَاِنَّ لَكُمۡ فِى الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَةً ‌ؕ نُسۡقِيۡكُمۡ مِّمَّا فِىۡ بُطُوۡنِهٖ مِنۡۢ بَيۡنِ فَرۡثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيۡنَ۔ (اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی

ایک سبق موجود ہے۔ان کے پیٹ میں گوبر اور خون کے درمیان سے ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں یعنی خالص دودھ' جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔سورۃ النحل آیت 66)

نبی اکرمؐ کے مشن کی صداقت کے سلسلے میں قرآن مختلف قسم کی شہادتیں اور عقلی دلائل پیش کرتا ہے۔ان دلائل کے علاوہ آپؐ کے دعویٰ نبوت کی حمایت میں ایک انتہائی سادہ اور گھریلو قسم کی دلیل بھی دی گئی ہے جسے عالم فاضل لوگوں کے ساتھ ساتھ اجڈ اور گنوار بھی سمجھ سکتے ہیں۔ان میں سے ایک سادہ مثال تو وہی ہے جو متذکرہ بالا قرآنی آیت میں آئی ہے۔ جیسے کہ کہا گیا ہے کہ گوبر اور خون کے درمیان سے خالص اور مصفّٰی دودھ نکال کر انسانوں کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔سادہ لوح دیہاتی اور اجڈ ترین انسان بھی گوبر اور صاف وصحتمند دودھ کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔اس کے بالکل مماثل ایک ہندو منطق اور فلسفہ پر مبنی کہاوت ''گومے پیا سیوت'' ہے جس کے معنی ہوتے ہیں کہ'' گائے کے گوبر اور دودھ کی دلیل بہت سادہ اور مضبوط ہوتی ہے'' بہ الفاظ دیگر کوئی آدمی خواہ کتنا ہی سادہ اور غیر تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو گوبر اور دودھ کو الگ الگ شناخت کر ہی سکتا ہے اور اس معاملے میں کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔

اب درخت کی طرف آیئے۔درخت روئے زمین میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور انسان کا ان سے' شروع ہی سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔آغازِ تاریخ سے جب خدا نے باغ عدن پیدا کیا' اس نے دو درختوں کو بنیادی اہمیت کے حامل قرار دیا' ......''نیکی اور بدی کے درمیان فرق و امتیاز کا درخت'' اور ''زندگی کا درخت''۔ یہ دونوں ''درخت'' آپس میں ایک ''سلسلۂ اسباب'' (chain of causation) کے ذریعہ منسلک ہیں۔ انسانی زندگی' ان دونوں کے درمیان واضح فرق سمجھنے کے حوالے سے طے ہوتی ہے اور اسی فرق پر مبنی اعمال کی بنا پر تشکیل پاتی ہے۔اگر شیطان کے گمراہ کن اثرات سے یا مسیحی عقیدۂ کفارہ (Atonement) کی بے خودی اور سرمستی سے سرشار ہونے کی وجہ سے ''فرق و امتیاز'' کا درخت جڑوں سے ہی اکھڑ جائے یا تباہ ہو جائے تو انسانی زندگی کا درخت بھی مر جائے گا اور سوکھ کر صرف چولہے کا ایندھن بننے کے قابل رہ جاتا ہے۔قرآن کی محولہ بالا آیت میں خیر و شر کے مابین فرق کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے' کیونکہ انسانی زندگی کا درخت اسی بنیاد پر نشوونما اور حیاتِ دوام پاتا ہے......اللہ نے انسان کو ایک تندرست و توانا اور فائدہ مند درخت سے تشبیہ دی

ہے اور ایک کامل فرد اور ایک مفید درخت کو انسانیت کی تکمیل کے لیے بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔

مذہبی صحیفوں کی شہادت

مذہبی صحائف' عہد نامۂ عتیق' ژنداویستیا' ویدوں اور بودھ مت کی کتابوں میں ہمیں انجیر' زیتون' سیب' سرو' صنوبر' میپل' دیودار' شاہ بلوط' اخروٹ' بید مجنوں' کیلے' گولر' پیپل اور سوملاٹا کے درختوں کا ذکر ملتا ہے اور ان کی خصوصیات کے حوالے بھی آتے ہیں۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں انجیر' زیتون اور شجرۃ مبارکۃ کا حوالہ بھی کسی کسی معاملے میں بطور گواہی آتا ہے۔ ویدک لٹریچر میں بھی سوملاٹا اور پیپل کے درختوں کے حوالے ملتے ہیں۔ بدھ مت کے لٹریچر میں کیلے کے درخت کی طرف کافی اشارے ملتے ہیں جس کے ٹھنڈے اور راحت افزا سایہ تلے بیٹھ کر بدھ مت نے ''نروان'' یعنی آواگون کے چکر سے روح کی نجات پائی تھی۔ بدھ مت پھیل جانے کے بعد جب بدھوں اور برہمنوں کے درمیان تصادم شدت اختیار کر گیا تو ہندوؤں نے کیلے کے اس اصل درخت کو تباہ کر دیا لیکن بدھوں سے اس سے حاصل کردہ ایک پودا ''انوورایور'' (سری لنکا) میں کاشت کر لیا جو اب بھی موجود ہے' اسے دنیا کا قدیم ترین مانا جاتا ہے۔ اس کی عمر بائیس سو سال سے کچھ زیادہ بتائی جاتی ہے۔ زرتشت اور پارسی تقریباً سبھی درختوں کو متبرک سمجھتے ہیں۔ ہندوؤں کا عام عقیدہ ہے کہ دیوتا درختوں میں رہتے ہیں اور یہ کہ درخت وجودِ خداوندی کا مظہر اعظم ہیں۔ لیکن مختلف مذاہب کے صحیفوں میں سے متبرک درختوں کو بطور شہادت پیش کرنے سے قبل' ہم اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا یہ درخت واقعی کچھ کہنے کی قابلیت رکھتے ہیں یا یہ محض من گھڑت کہانیاں اور فرضی باتیں ہیں جو بلاوجہ مقبول ہو گئی ہیں۔

قرآن میں آتا ہے ''اَصْلُھا ثابِت'' یعنی جہاں کہیں یہ درخت جڑ پکڑتا ہے' وہاں ثابت قدمی سے جما رہتا ہے یہ انسان کی طرح نہیں کرتا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہے۔ یہ تنک مزاج اور ریخ بین لوگوں کی طرح قسمت کی سختیوں کے شکوے شکایتیں بھی نہیں کرتا اور اپنے روز اول سے لے کر آخر تک دلجمعی سے وہ کام کرتا رہتا ہے جو اسے سونپا گیا ہوتا

ہے۔ اس کی جڑوں کا کام اور مقصد درخت کو مضبوطی سے جمائے رکھنا اور زمین کی سنگلاخ تہوں اور اندھیروں میں سے خوراک کھینچ کھینچ کر تنے، شاخوں اور پتوں کو پہنچاتے رہنا ہے جیسا کہ ماں اپنے بچوں کے لیے کرتی رہتی ہے اور کمال درجے کی قربانی اور بے لوثی کا مظاہرہ کرتی ہے جس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی' انسان کی نظروں سے ان کی یہ انتھک جدوجہد پوشیدہ رہتی ہے یہ جدوجہد سراپا خلوص ہوتی ہے اس میں ظاہر داری یا منافقانہ خود نمائی کا ایک شائبہ تک نہیں ہوتا۔ تاہم یہ محنت پھولوں اور پھلوں کی شکل میں رنگ لاتی ہے۔ ہر پھول اور ہر پھل زبان حال سے جڑوں کے ایثار اور ان کی کارکردگی کو سامنے لاتا رہتا ہے۔ جڑیں اپنے فرائض کی ادائیگی میں حیرت انگیز حد تک ایک سچے مسلمان کی طرح مخلص اور بے لوث ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہر درخت ایک مسلمان کی طرح پیدا ہوتا ہے' جب تک زندہ رہے خلوصِ دل سے اطاعت و فرمانبرداری کرتا رہتا ہے اور جب یہاں ایک مدت پوری کر لیتا ہے تو مسلمان ہی کی طرح حالتِ عبودیّت و فرمانبرداری میں دوبارہ خدا کے سامنے جا کر پیش ہو جاتا ہے۔ یہ فرائض اسے چونکہ خدا ہی نے سونپے تھے اور وہ اسی کے سامنے خود کو ذمہ دار سمجھتا ہے۔ کسی دوسرے کے سامنے جوابدہی کو شرک سمجھتا ہے۔ اور شرک سے دلی نفرت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انجیر کے درخت نے خدا کے حکم کے تحت ہی مسیح کو اس وقت اپنے پھل دینے سے انکار کر دیا جب وہ بھوک کی حالت میں اس کے پاس آیا تھا (مرقس 11:14) یہ کبھی کفر کا ارتکاب نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کو کافر قرار دیتا ہے۔ یہ کسی غیر مسلم کو اپنے سائے کی ٹھنڈک پہنچانے سے انکار نہیں کرتا اور اپنے سائے تلے پناہ لینے کے لیے آنے والوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی خاموش دعائیں پانی بھرے بادلوں کو کھینچ کھینچ کر اس کی طرف لاتی ہیں۔ یہ جب تک روئے زمین پر موجود رہتا ہے لحہ بھر کے لیے بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوتا۔

اس کی شاخوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے...... ''وَفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ'' (اور اس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں' (سورۃ ابراہیم آیت 24) یہ اپنی شاخوں کو آسمان کی طرف پھیلاتا ہے' اس کے پتوں کی سرسبزی و شادابی آنکھوں کو تازگی بخشتی ہے' اس کا سایہ تھکے ہوئے لوگوں کو جلانے والی تپش سے نجات دلاتا ہے۔ یہ شاخیں ہوا کو صاف کر کے اسے اپنی خوشبوؤں سے معطر کر دیتی ہیں۔ جب پھول لگ جاتے ہیں تو ہمیں

پتہ چل جاتا ہے کہ اس کے ساتھ پھل لگ جانا اب زیادہ دور نہیں رہا۔ یہ پھل غذا ہونے کے علاوہ کئی بیماریوں کا علاج بھی بن جاتے ہیں۔ اچھا درخت ہمیشہ ہی پھل دیتا رہتا ہے۔ بہت سے کیسوں میں ان کا ہوا کو صاف کرنے کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ علاوہ ازیں جب یہ مر جاتا ہے تو اس کی افادیت کا فوراً خاتمہ نہیں ہو جاتا' اس سے لکڑی حاصل ہوتی ہے جو چولہا جلانے کے کام بھی آتی ہے اور کھڑکیاں دروازے الماریاں اور فرنیچر بنانے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس سے شیر خوار بچوں کے پنگھوڑے بھی بنتے ہیں اور مرنے والے انسانوں کے لیے تابوت بھی بنائے جاتے ہیں۔ اور انسان جب تک زندہ رہتا ہے لکڑی سے بنے ہوئے شہتیروں تلے زندگی گزارتا ہے۔ اللہ نے یہ تمثیل انسانوں کو اس لیے بتائی ہے کہ وہ اس سے سبق حاصل کریں۔

درختوں کی شہادت:

اوپر بتایا جاچکا ہے کہ مذہبی کتابوں میں درختوں کا ذکر بکثرت ملتا ہے اور ان کی تعلیمات میں درختوں سے کچھ نہ کچھ تقدس بھی لازماً منسوب ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ درخت ''لَا اِلٰہَ الاللّٰہ'' پر اپنے بھرپور اعتماد کا اظہار اور اس کی بہترین وضاحت کرتے ہیں۔ جبکہ ان کی زندگی' ان کی پیدائش کی اغراض و مقاصد کے فروغ کے لئے ہی وقف ہوتی ہے۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا وہ حضرت محمدؐ کی نبوت کی بھی شہادت دیتے ہیں؟ اگر درختوں کی پیش کردہ گواہی کی تائید مقدس کتابوں کے ذریعہ بھی ہو جائے جیسا کہ ''کتاب فطرت'' کے ذریعہ ہوتی ہے تو اس سے انسان کے ایمان کو لازماً تقویت ملے گی۔ اب ہم ایک ایک کر کے ان گواہیوں یا شہادتوں کو سامنے لاتے ہیں' جو انہی کی زبان میں پیش کی جائیں گی اور عین ممکن ہے کہ آپ نے یہ ''اسرار'' پہلے کبھی نہ سنے ہوں:

بادام کے درخت نے کیا کہا؟ عبرانی زبان میں اس درخت کو ''شاقد'' (Shaqed) کہا جاتا ہے۔ اس کے نام کے اندر ہی اس کی اہمیت مضمر ہے اور اس میں ایک پیشگوئی بھی موجود ہے۔ عبرانی ہی میں اور اس میں ایک پیشگوئی بھی موجود ہے۔ عبرانی ہی میں اور عربی میں اس کا ایک اور نام ''لوز'' ہے۔ یہ طاقت کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ اس پر بہت پھول

لگتے ہیں۔ یہ ایک مخصوص ذائقہ رکھتا ہے اور وٹامنز سے بھرپور ہوتا ہے۔ عہد نامۂ عتیق میں آتا ہے کہ جب یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو مصر بھیجا تو انہیں نصیحت کی کہ وہ یوسفؑ کے لیے بادام اور پستہ کی خاصی مقدار بطور تحفہ لے جائیں۔ (کتاب پیدائش 11:43)

نبی یرمیاہ نے ایک مکاشفے میں دیکھا کہ خدا نے اس سے پوچھا ''اے یرمیاہ تو کیا دیکھتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں بادام کے درخت کی ایک شاخ دیکھ رہا ہوں' تو خداوند نے مجھے فرمایا کہ تو نے خوب دیکھا کیونکہ میں اپنی بات کو جلدی پورا کرتا ہوں۔''

ان الفاظ کے اندر ایک پیشینگوئی ہے۔ بادام کے درخت کی شاخ اس امر کی علامت ہے کہ خدا اپنی بات جلدی پوری کر دے گا۔ اور خدا کی بات کیا تھی؟ اس کا جواب آیات 12 تا 18 میں ملتا ہے لیکن پہلے ہمارے ذہن میں یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ بادام کی شاخ کے کیا معنی ہیں؟ بادام ایک پھلدار درخت ہے جس میں دوسرے درختوں سے پہلے موسم بہار میں پھول لگتے ہیں' عربی کیلنڈر کے مطابق یہ ربیع الاول کا مہینہ ہوتا ہے۔ اس طرح یہ نہ صرف آمد بہار کی اولین علامت ہے بلکہ یہ دنیا بھر میں مذہب اور اخلاقیات کی تجدید و احیائے نو کا وعدہ بھی ہے۔ ہر نبی نے اپنے پیروکاروں کے ساتھ بائبل کی تعلیمات کے مطابق جو سب سے بڑا وعدہ کیا' یہی تھا کہ خدا اپنی بات موسم بہار کے اوائل میں پوری کر دکھائے گا جو عربی کیلنڈر کے مطابق ماہ ربیع الاول بنتا ہے۔ یہ میری انفرادی رائے نہیں ہے' ایک عیسائی پادری نے بھی بالکل اس سے ملتی جلتی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''شاقد کا نام ہی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ خدا اپنے وعدے کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا'' (Rev.Robert Barr: TREES SPEAK OF HIM) اس طرح یرمیاہ نبی نے بادام کی جو شاخ دیکھی تھی نبی اکرمؐ کی آمد کے بارے میں ایک علامتی پیشگوئی تھی جن کی پیدائش ماہ ربیع الاول میں ہوئی جو آمد بہار کا مہینہ ہوتا ہے اور جس میں فطرت نئے عزم کے ساتھ اپنا اظہار کرتی ہے۔ جبکہ کرسمس جو حضرت مسیح کی پیدائش کے سلسلے میں منائی جاتی ہے وہ عین سردیوں کے وسط میں ہوتی ہے اور درخت عملاً مر چکے ہوتے ہیں۔ بادام کی شاخ پر جب پھول کھلتے ہیں تو یہ آمدِ بہار اعلان ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم یسوع مسیح کو اُس وقت اس تعبیر کے توثیق کرتے ہوئے پاتے ہیں جب انہوں نے انجیر کی درخت کو بدُعا دی اور وہ مرجھا کر مر گیا

(متی 21:19)۔ بادام کی شاخوں پر پھول لگنا آنحضرتؐ کی آمد کی خوشخبری ہوتا ہے' اسی لیے عربی زبان میں ربیع الاول کو محاورتاً انتہائی متبرک مہینہ کہا جاتا ہے۔

بادام کے لیے ''شاقد'' کا جو لفظ استعمال ہوا ہے' اس کے ایک معنی ''عنقریب'' کے بھی ہیں۔ اس پر موسمِ بہار سے کچھ پہلے پھول کھلنا' ایک اور مذہب کی جلد آمد کی طرف اشارہ ہے جس نے سارے عرب اور اس کے گردونواح کے علاقوں کو اپنے دائرے میں لے آنا تھا۔ یسعیاہ نبی نے اس تعبیر کی تصدیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس متوقع نبی کا نام ''مہیر شالال حاش بز'' (Mahar shalal hash baz) ہوگا۔ (یسعیاہ 1:8)۔

جس خواب کا اوپر ذکر گیا ہے اس میں ''بادام'' نے جنگ کے بعد ایک بڑی دولت ہاتھ آنے کا ذکر کیا' یہ شاید اس لیے کہ بادام کے مغز پر ایک سخت قسم کا چھلکا ہوتا ہے' اس تک رسائی چھلکے کو توڑنے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ اس تعبیر کی تصدیق بھی یرمیاہ کی اسی پیشگوئی سے ہوتی ہے۔ اس سے اگلی آیتوں یعنی ''یرمیاہ 13:1'' کے بعد کی آیتوں میں ایک ابلتی ہوئی دیگ کا ذکر آیا ہے جو دوسرے لفظوں میں ایک جنگ کی طرف اشارہ ہے' کہ اس ملک کے تمام قبیلوں اور خاندانوں پر آفت آنے والی ہے' یہ آفت ان کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہوگی صاف ظاہر ہے کہ یہ پیشگوئی اس جنگ کے حوالے سے کی گئی تھی جو حضرت محمدؐ نے لڑی اس میں انہوں نے نہ صرف 360 بتوں کی پوجا کرنے والوں کا صفایا کیا بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کی بت پرستانہ زندگی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس طرح آسمانی پیشگوئی کے مطابق ارضِ مقدس توحید پرستوں کے قبضے میں چلی گئی۔

اب ہم باداموں کے حوالہ سے بات آگے بڑھاتے ہوئے نبی اکرمؐ کی ایک خصوصیت کی طرف آتے ہیں۔ باداموں کی دو معروف اقسام ہیں' ایک وہ درخت ہوتے ہیں جن پر ہلکے گلابی پھول لگتے ہیں اور دوسرے سفید پھولوں والے درخت ہوتے ہیں۔ اول الذکر پھولوں والے بادام میٹھے اور لذیذ ہوتے ہیں اور موخر الذکر سفید پھولوں والے بادام کڑوے اور زہریلے ہوتے ہیں جنہیں کوئی پسند نہیں کرتا۔

کسی فرد کی کامیابی میں اس کی شیریں کلامی کا بہت دخل ہوتا ہے۔ جس طرح میٹھے باداموں کو بے حد پسند کیا جاتا ہے' اسی طرح انسان کی شیریں گفتاری بھی ایک پسندیدہ ترین

خصلت اور اس کی کامیابی کا ایک اہم عنصر شمار ہوتی ہے۔ نبی اکرمؐ کے بارے میں قرآن میں آتا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ (اے پیغمبرؐ یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ سورۃ ال عمران آیت 159)

یہ آپؐ کی نرم دلی اور شیریں کلامی کا نتیجہ تھا کہ تقریباً 60,000 افراد آپؐ پر ایمان لے آئے۔ دوسری طرف انجیلوں ہی کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کے گرد صرف بارہ شاگرد جمع ہوئے جو انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ان انجیلوں میں اگرچہ کافی ردّوبدل اور تحریف ہوئی ہے لیکن ہمیں جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ یسوع مسیح نے یہودیوں اور فریسیوں میں سے پڑھے لکھوں کو زہریلے ناگ اور ناگوں کی اولاد قرار دیا اور اپنے دو انتہائی اہم شاگردوں (پطرس......''پیٹر'' اور ''یہودا''......''جوڈاز'') کو شیطان کہہ کر پکارا......انہوں نے ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا......''اس زمانے کے برے اور زنا کار لوگ آسمانی نشان طلب کرتے ہیں مگر انہیں یوناہ کے نشان کے سوا کوئی اور نشان نہیں دیا جائے گا۔'' (متی 4:16؛ لوقا 29:11)۔ اس طرح ہمیں پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے کلام کی تلخی ان کے مشن پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہی۔ یہاں تک کہ جو لوگ کسی طرح ان پر ایمان لے آئے تھے وہ بھی تتر بتر ہو گئے۔

یہ مانتے ہوئے کہ روغنِ بادام ایک مقدس تیل ہے جو گرجا میں سات بتیوں والے شمعدان کو خوب روشن کرتا ہے اسی طرح حضرت مسیحؑ کی روشنی مٹھی بھر شاگردوں تک محدود رہی جبکہ حضرت محمدؐ نے اپنی آنکھوں سے لوگوں کو جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے کے لیے آتے ہوئے دیکھا۔ اسلام کی روشنی کو دیکھنے کے بعد شاید ہی کوئی ایسا شخص رہ گیا ہو جس نے اسے قبول نہ کیا ہو۔ اور پھر مسلمانوں نے چند برسوں میں اس روشنی کو دنیا کے چاروں گوشوں میں پہنچا دیا۔ یہ روشنی اب بھی اپنی حقیقی چمک کے ساتھ دنیا بھر کو روشن کر رہی ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ۔ (اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آیا ہے خدا کی طرف سے دین کی روشن تعلیم لے کر''......سورۃ المائدہ'

آیت 19)۔ دوسری طرف ہم حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ایک بالکل برعکس صورت حال دیکھتے ہیں "لوگوں نے اس کو جواب دیا کہ ہم نے شریعت کی یہ بات سنی ہے کہ مسیح ابد تک رہے گا۔ پھر تو کیونکر کہتا ہے کہ ابن آدم کا "اونچے" پر چڑھایا جانا ضروری ہے؟ یہ ابن آدم کون ہے۔ پس یسوع نے ان سے کہا کہ نور اور تھوڑی دیر تک تمہارے درمیان ہے۔ جب تک نور تمہارے ساتھ ہے چلے چلو۔ ایسا نہ ہو کہ تاریکی تمہیں آ پکڑے اور جو تاریکی میں چلتا ہے وہ نہیں جانتا کہ کدھر جاتا ہے۔ جب تک نور تمہارے ساتھ ہے نور پر ایمان لاؤ تا کہ نور کے فرزند بن سکو۔" (یوحنا کی انجیل 12:34، 36) پھر ہم اسی انجیل میں یہ آیت پاتے ہیں......

"جب تک میں دنیا میں ہوں، دنیا کا نور ہوں"...... یوحنا 5:9) اور اس کے بعد یہ نور (روشنی) دنیا میں صرف چند دن تک رہ سکا۔ اس طرح حضرت مسیح کے اپنے الفاظ کے مطابق ان کا مشن بہت مختصر عرصے کے لیے تھا۔

اب ہم اس بحث کو ختم کر کے حضرت یعقوبؑ کی طرف سے اپنے بیٹے یوسفؑ کے لیے باداموں کا تحفہ بھیجنے کی اہمیت اور اس کی تعبیر پر اظہار خیال کریں گے۔

بادام کے تحفے کا راز

یعقوبؑ کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے ایک یوسف تھا جس پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات تھیں اور اس کے ساتھ خدا نے کئی وعدے کر رکھے تھے۔ وہ اس سرسبز و شاداب درخت کی مانند تھا جو دریا کے کنارے کھڑا اپنی بہاریں دکھا رہا تھا۔ راہگیر اور رہزن اس پر پتھر پھینکتے رہتے تھے۔ لیکن اس کی پھلوں بھری شاخیں زمین کی طرف جھکی رہتی تھیں تا کہ لوگ ہاتھ بڑھا کر اس سے پھل حاصل کر لیں۔

حضرات ابراہیمؑ یعقوب اور موسیٰؑ نے اعلان کر رکھا تھا کہ حضرت یوسف کی نسل ان کی وارث ہوگی اور وہ خدا کی طرف سے کئے گئے بہت سے مواعید اور انعامات کی مستحق ہوگی۔ یہودیوں کو یقین تھا کہ متوقع پیغمبر اسی نسل میں سے مبعوث کیا جائے گا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حضرت یوسفؑ کا قبیلہ بُت پرستی کی لعنت میں مبتلا ہو گیا اور اسرائیل کے دس گمشدہ قبیلوں کے ساتھ گھل مل جانے کی وجہ سے صراط مستقیم سے ہٹ گیا۔

یعقوب کی طرف سے اپنے بیٹے کے لیے باداموں کا تحفہ خدا کے اس وعدے کو یاد دلانے کی ایک کوشش اور ایک امید کا مظہر تھا۔ قدیم زمانے میں بادام امید اور اس روشنی کی ایک کرن سمجھا جاتا تھا جو طویل عرصے کی تاریکی کے بعد دکھائی دیتی ہے۔

بہ الفاظ دیگر خاندان یوسف کے گھر سے برآمد ہونے والی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کی کرن کو کئی خزاؤں کی ویرانیوں میں سے گزرنا پڑے گا تب جا کر اسے سرسبز درخت کی طرح پھولنا پھلنا نصیب ہو سکے گا اور بادام کی وہ ٹہنی جو بظاہر بے جان ہو چکی ہے بالآخر پھولوں اور پھلوں سے سج جائے گی۔ خدا کے وعدوں کی تکمیل کے سلسلے میں ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ افغانستان اور کشمیر کے لوگوں نے جو کہ اسرائیل کے دس گمشدہ قبیلوں پر مشتمل ہیں' اپنے اردگرد پھیلے ہوئے بت پرستوں سے خود کو الگ تھلگ کر لیا ہے' انہوں نے ماہ ربیع الاول میں جنم لینے والے پیغمبر کا دین قبول کر کے اپنی راہ متعین کر لی ہے۔ اس طرح وہ پھولتا پھلتا ہوا بادام کا درخت بن گئے اور دنیا کو ڈھیروں پھلوں کے فوائد پہنچا رہے ہیں۔ ''اے کشمیر کے لوگو! اور اے افغانستان کے یوسف زیئو! ساری دنیا تمہیں سلام کرتی ہے تم نے واقعی بادام کے درخت کی اچھی طرح کاشت اور آبیاری کی ہے اور اس کے پھل سے پوری انسانیت مستفید ہو رہی ہے۔ مسیحی اقوام نے اپنی ضیافتوں میں شراب شامل کر کے جملہ انسانوں کے لیے جینے کی فضا مکدّر کر دی ہے۔ لوگوں کو نشے کی عادت ڈال کر ان کے لطیف جذبات و احساسات کی موت کا پورا پورا بندوبست کر دیا ہے۔

لیکن موسم بہار کے اوائل میں پیدا ہونے والی نبی نے پھلدار باداموں کے درخت کی طرح نے دنیا کو حقیقی طور پر فائدہ مند اور قوت بخش غذا فراہم کر دی ہے جو دل کو تقویت اور اعصاب کو مضبوطی بخشتی ہے۔ یرمیاہ نبی کی پیشگوئی جو انہوں نے ہزاروں سال پہلے کی تھی' آنحضرتؐ کی آمد سے بحسن وخوبی ہو چکی ہے۔ حضرت یوسفؑ کی نسل' بادام کی سرسبز ٹہنیوں کی طرح افغانستان میں اپنی بہار دکھا رہی ہے وہاں انار' انگور اور سیب کے درخت بھی لہلہا رہے ہیں جو تھکے ہوئے مسافروں کی ساری تکان دور کر دیتے ہیں۔ لہٰذا مبارک ہیں وہ جنہوں نے ان اشاروں اور رمزوں کو سمجھ لیا ہے۔

کھجور کا پیغامِ شیریں

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: وَمِنْ ثَمَراتِ النَّخِيلِ والأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا إِنَّ فِي ذَالِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔ ﴿(اسی طرح) کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں سے بھی ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں جسے تم نشہ آور بھی بنا لیتے ہو اور پاک رزق بھی۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے عقل سے کام لینے والوں کے لیے۔ سورۃ النحل آیت 67﴾

یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ قرآن نے نبی اکرمؐ کے مشن کے سچا ہونے کے بارے میں متعدد اقسام کی شہادتیں اور انتہائی معقول دلائل پیش کیے ہیں۔

اس قسم کی دوسری دلیل کھجور اور انگور کے حوالہ سے دی گئی ہے۔ یہ دونوں پھل انسان کے لیے نہایت صحت بخش غذا ہیں اور ذریعۂ معاش بھی۔ لیکن اگر انہیں تخمیر کے لیے چھوڑ دیا جائے تو دونوں کا رس ایک انتہائی درجے کے نشہ آور مشروب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جس سے اس کے اثرات اتنے نقصان دہ اور شرانگیز ہو جاتے ہیں کہ اسے "اُمّ الخبائث" کہا جاتا ہے۔ اس سادہ حقیقت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد آیئے ہم وہ پیغامِ صداقت سنتے ہیں جو کھجور کے درخت نے نبی اکرمؐ کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے۔

1: کھجور کا درخت، خالصتاً عرب خصائل کا حامل ہے۔ یہ ریتلے صحراؤں میں اگتا ہے۔ زمین میں اپنی مضبوط جڑوں کے بل بوتے پر ابھرتا ہے اور انتہائی میٹھے پھل کی حقیقی فیکٹری بن جاتا ہے۔ کھجوروں سے بننے والی شکر (چینی)، دیگر اشیا سے حاصل ہونے والی شکر سے کہیں زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ یہ دیگر اقسام کی شکروں سے لاحق ہونے والی امراض سے بھی تحفظ دیتی ہے۔ اپنی افادیت اور انسانی ضروریات کی تسکین کے حوالہ سے کھجور کا درخت اسلام سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے جس کی بنا پر یہ نبی اکرمؐ کے لائے ہوئے مذہب کی علامت بنا ہے۔ اسی طرح، جس طرح صلیب یسوع مسیح سے منسوب مذہب کا نشان بنی ہے۔

2: کھجور کے درخت کی ایک ہزار سے زائد اقسام ہیں لیکن عرب میں پائی جانے والی کھجور اعلیٰ ترین ہوتی ہے، دنیا کے کسی خطے میں اس جیسی کھجور پیدا نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر اس

درخت اور اس کے پھل کے عربی میں مخصوص نام ہیں جو اس درخت کی عمر' پھل کے ذائقے اور خوشبو کے حوالے سے رکھے گئے ہیں' ان ناموں کی تعداد سینکڑوں میں ہے جبکہ دوسری زبانوں میں اس کے لیے دو یا تین الفاظ سے زیادہ نہیں۔ جس انداز میں اس کا تنا زمین سے سیدھا اوپر کو جاتا ہے' اس کی طاقت و مضبوطی اور دیگر خصوصیات کے حوالے سے عربی نثر اور شاعری میں بیسیوں قسم کی کہاوتیں مروّج ہیں۔

3: کئی مذاہب کی الہامی کتابوں میں کھجور کے گہرے سبز پتوں کو فتح کا نشان سمجھا جاتا ہے بالکل اسی طرح اور اسی حد تک' جیسے صلیب ناکامی' شکست' حادثات اور مصائب کی علامت بن چکی ہے۔ چنانچہ ہم ''یوحنا عارف کا مکاشفہ'' میں جو یسوع مسیح کے بعد لکھا گیا تھا' یہ عبارت پاتے ہیں: ''ان باتوں کے بعد جو میں نے نگاہ ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہر قوم اور قبیلہ اور امت اور اہل زبان کا ایک زبردست ہجوم لگا ہوا ہے' سب نے سفید لباس پہنا ہوا ہے' ان کے ہاتھوں میں کھجور کی ڈالیاں ہیں' سب ایک تخت اور ایک میمنے کے سامنے کھڑے ہیں' اور سب نے چلاّ چلاّ کر کہہ رہے ہیں کہ نجات (Salavation) ہمارے خدا کی طرف سے ہے جو تخت پر بیٹھا ہے' اور اس میمنے کی جانب سے ہے'' (مکاشفہ 9:7'10)

اس پیراگراف میں کھجور کی ڈالیاں فتح کی علامت ہیں جو حضرت مسیحؑ کو زندگی بھر نصیب نہیں ہوئی۔ دوسری طرف ہم یہ پاتے ہیں کہ حضرت محمدؐ نے اپنی حیات دنیوی میں ہی فتح پائی اور آسمان میں فرشتوں نے اس موقع پر خوشی کا گیت گایا۔ ہمیں لاطینی زبان میں ہی ایک کہاوت ملتی ہے'' جو کوئی بھی فتح یاب ہوتا ہے' وہ کھجوروں پر قابض ہو جاتا ہے۔'' اس طرح حضرت محمدؐ بلاشبہ فتح سے ہمکنار ہوئے اور ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ عرب' کھجوروں فتح و کامرانی اور حضرت محمدؐ میں گہرا تعلق ہے۔

اہل روم اور کھجور

4: اہل روم کھجور کے درخت کی تعریف اس کے حسن کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ اس کے سیدھے اوپر آسمان کی طرف اٹھنے کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اس کے اونچے قد کا راز یہی ہے کہ اس کے سر پر قدرت خداوندی نے بھاری بوجھ نہیں لادا۔ اسے اس امر کا استعارہ سمجھا جاتا

چاہیے کہ مشکلات اور دنیا داری کا بوجھ ایک مومن کو سیدھی راہ پر چلنے سے نہیں روک سکتا۔ نبی اکرمؐ کی زندگی کو دیکھئے کہ انہیں عمر بھر کتنی مشکلات اور آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا مگر وہ اس راہ سے سرِ مُو منحرف نہیں ہوئے اور نہ ان کے قدموں میں کوئی لغزش آئی۔ دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں جیسا کہ اناجیل ہمیں بتاتی ہیں اور ان میں حضرت مسیحؑ کی طرف ایسے بیانات شامل ہیں کہ: ''چند شاگردوں نے انہیں ''مسیحا'' کہا' جس کے جواب میں انہوں نے کہا ''کسی کو یہ بات نہ بتانا کہ میں مسیحا ہوں'' دیکھئے متی کی انجیل باب 16' آیت 20۔

''اس وقت اس نے شاگردوں کو حکم دیا کہ کسی کو نہ بتانا کہ میں مسیح ہوں''

مرقس کی انجیل باب 8' آیت 29' 30۔

''اس نے ان سے پوچھا لیکن تم مجھے کیا کہتے ہو' پطرس نے جواب میں اس سے کہا کہ تو مسیح ہے' پھر اس نے ان کو تاکید کی کہ میری بابت کسی کو یہ نہ بتانا''

لوقا کی انجیل باب 9' آیات 20' 21۔

''اس نے ان سے کہا لیکن تم مجھے کیا کہتے ہو؟ پطرس نے جواب میں کہا کہ خدا کا مسیح۔ اس نے ان کو تاکید کر کے حکم دیا کہ یہ کسی سے نہ کہنا''

دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت محمدؐ جنگ احد کے دوران بری طرح دشمن کے گھیرے میں آ گئے کیونکہ آپؐ کے ساتھی لڑتے بھڑتے آپؐ سے دور نکل گئے تھے۔ آپ اس گھمسان میں نہایت ثابت قدمی سے آگے بڑھتے جا رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے۔''اَنَا النَبِیُّ لاکَذِبْ اناء بنُ عبدالمطلب''

(''میں نبی ہوں' اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے' میں ابن عبدالمطلب ہوں)

آپؐ کھجور کے مضبوط اور سیدھے تنے کی طرح' بھاری وزن اٹھائے ہوئے ہونے کے باوجود ہر قسم کی رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سیدھے اوپر کی طرف نکلتے چلے گئے۔ رکاوٹوں کی کئی قسمیں تھیں جو بار بار کھڑی کی جاتی رہیں مگر آپ نے ہر بار اہل مکہ کی تانی ہوئی تلواروں کے ٹکڑے کئے اور جادۂ حق پر گامزن رہے۔ قرآن مجید ان رکاوٹوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے......اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ وَوَضَعْنَاعَنْکَ وِزْرَکَ ۙ الَّذِیْ

اَنْقَضَ ظَهْرَكَ وَرَفَعْنَالَكَ ذِكْرَكَ۔ (اے محمدؐ کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا (بیشک کھول دیا) اور تم پر سے بوجھ بھی اتار دیا' جس نے تمہاری پیٹھ توڑ رکھی تھی اور تمہارا ذکر بلند کیا...... سورۃ الضحیٰ' آیات 1' تا 4) اس طرح آپؐ اپنے مشن کی تکمیل میں کامیاب و کامران رہے۔ یوں حضرت داؤدؑ کی وہ پیشگوئی بھی درست ثابت ہوئی جو انہوں نے صداقت پر مبنی مشنوں کے بارے میں کی تھی...... ''سچا آدمی کھجور کے درخت کی مانند سرسبز ہوگا: اور لبنان کے دیودار کی طرح نشوونما پائے گا''۔ (زبور 12:92)

کھجور کا درخت' شجر صحرائی ہے' یہ اپنی غذا ریت میں سے اخذ نہیں کرتا۔ یہ ایسے تپتے ہوئے صحرا میں نشوونما پاتا ہے جہاں کئی کئی مہینے بارش کے بغیر گزر جاتے ہیں۔ اس کی ڈالیاں اور پتے بارش کے انتظار میں اپنے آپ کو پھیلائے رکھتے ہیں اور اس کی جڑیں نمی کے لیے زمین کی گہرائیوں میں اترتی رہتی ہیں (حضرت حاجرہ کی طرح جو اپنے ننھے بچے کی پیاس بجھانے کے لیے دوڑ بھاگ کر رہی تھیں کہ اچانک اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا)۔ صحرا نشین عرب بھی ہدایت کے پیاسے تھے حضرت محمدؐ نے ان تک وہ ہدایت پہنچائی جو ان کی پیاس بجھا سکتی تھی اور وہ اس آخری نبی کے ذریعہ بجھی۔

5: کھجور کی ڈالیاں اور پتے جو فتح اور کامیابی کی علامت ہیں اتنے لچکدار اور مضبوط ہوتے ہیں کہ انہیں کوئی طوفانِ بادو باراں نہیں توڑ سکتا۔ نبی اکرمؐ کی زندگی میں اور مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ کے دوران حبشہ اور پھر مدینہ کی طرف ہجرت وہ شدید طوفان تھے جو کئی سال تک چلتے اور انہیں جھٹکے دیتے رہے لیکن وہ آنحضرتؐ کے ساتھیوں کے عزم کو توڑنے میں بری طرح ناکام رہے۔ جبکہ حضرت عیسیٰؑ کے مٹھی بھر حواری' خطرے کی پہلی قسط کے ساتھ ہی انہیں تنہا چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔

6: قرآن مجید کہتا ہے کہ کھجور اور انگور انسان کے لیے بہترین غذا بنائے گئے ہیں کیونکہ یہ قوت بخش ہیں اور ہر قسم کی وٹامن سے بھرے ہوئے ہیں لیکن پیروکاران یسوع مسیح نے ان سے شراب کشید کی اور ساری دنیا کو اس کے نشے کی عادت ڈال دی۔ قرآن کہتا ہے کہ اس میں ان لوگوں کے لیے ایک سبق ہے جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آنحضرتؐ کے پیروکاروں نے اہلِ یورپ کو کھجور اور انگور بطور تحفہ دیئے۔ عربوں نے انگور کی بیل سپین

پہنچائی جہاں سے یہ سارے یورپ میں پھیل گئی۔ لیکن ان کے کردار کے بالکل برعکس پیروکارانِ یسوع مسیح نے ان دونوں غذاؤں کونشہ آور مشروب میں تبدیل کر کے اس لعنت کو دنیا کے سب خطوں میں پہنچا دیا۔ مزید برآں انجیل کا ایک دعویٰ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یسوع مسیح نے جو پہلا معجزہ دکھایا وہ یہ تھا کہ انہوں نے پتھر کے بنے ہوئے چھ برتنوں کو جو پانی سے بھرے ہوئے تھے شراب سے بھر دیا۔ (یوحنا کی انجیل باب 2' آیات 6 تا 11)۔ لیکن حضرت محمدؐ کا معجزہ یہ تھا کہ آپ کے ارشاد اور تعلیمات کے زیراثر' مسلمانوں نے شریعت کے نفاذ کے ساتھ ہی شراب کے مٹکے توڑ دیئے اور مدینے کی گلیوں میں شراب اس طرح بہادی جیسے بارش کا پانی بہہ رہا ہو۔ دنیا کے کئی ممالک میں حتیٰ کہ انتہائی ترقی یافتہ ممالک کی حکومتوں اور مصلحین نے بھی امتناع شراب کا قانون بنایا اور اسے پوری سختی سے نافذ کرنے کا اعلان کیا مگر بری طرح ناکام رہے۔ دوسری طرف اسلام کی اولین کوشش ہی کامیاب ہوگئی۔ آج دنیائے عیسائیت گوناگوں سماجی برائیوں بشکل منشیات' حرامکاری اور ہم جنس پرستی' سے دوچار ہے' عورت ایسا لباس پہن کر بازاروں میں گھوم رہی ہے جیسے وہ الف ننگی ہو۔ اخلاق کی دھجیاں اڑانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے تباہی و بربادی پھیلانے کے ایسے ایسے ہتھیار بناڈالے ہیں کہ کبھی دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی جب دوسروں نے بھی اپنے بچاؤ کے لیے ویسے ہی ہتھیار بنا لئے تو ان کی سیٹی گم ہوگئی اور اب چھوٹی قوموں پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ تم انہیں ترک کر دو یہ تو صرف ہمیں زیب دیتے ہیں۔

7: مسیحیوں کی روحانی مشکلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید نہایت لطیف پیرائے میں کہتا ہے فَاَجَآءَ هَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔ (پھر لے آئی اس (مریمؑ) کو زچگی کی تکلیف ایک کھجور کے درخت کے نیچے۔ وہ کہنے لگی ''کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام و نشان تک نہ رہتا''......سورۃ مریم آیت 23)۔ یہاں مریمؑ کو مسیحیوں کے لیے بطور علامت لیا جاسکتا ہے جو زچگی کی تکلیف کے باعث کھجور کے درخت کے نیچے پہنچ گئی تھیں۔ جہاں خدا نے انہیں ہدایت فرمائی کہ وہ درخت کو ہلائیں اور اس سے جو کھجوریں گریں انہیں کھالیں۔ اس سے انہیں طاقت ملے گی جس سے وہ درد برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں گی۔ پکی ہوئی کھجوروں سے

لہٰذا یہ پھندا یہ درخت' اسلام ہے جس کی بابرکت تعلیمات ان تمام بیماریوں کا علاج ہیں جو آج کی عیسائیت کے لیے سوہان روح بنی ہوئی ہیں۔

8: اس طرح سربلند کیے سیدھا کھڑا' کھجور کا طویل قامت درخت' بہ آواز بلند بائیبل کی زبان میں اعلان کر رہا ہے کہ اس کا مشن دنیا کو ایسی شکر بہم پہنچانا ہے جو اس کی صحت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ کھجوروں میں 58% شکر ہوتی ہے جس میں وٹامن ''A'' اور ''B'' ہوتی ہیں۔ جبکہ دیگر اقسام کے جوسوں میں سے حاصل ہونے والی شکر میں کئی خطرناک امراض کے جراثیم ہوتے ہیں۔ کھجور کا درخت طویل عمر پاتا ہے اور سالہا سال تک صحرا میں جما ہوا' بنی نوع انسان کو اپنے میٹھے پھل پیش کرتا رہتا ہے۔ اس کے اندر انسان کے لیے مضمر فوائد کے حوالے سے اسے بجا طور پر اسلام کی علامت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور صلیب کی مردہ لکڑی عیسائیت کی علامت ہے جو مصائب و آلام اور شکست کی نشانی ہے۔ کھجور کا درخت انجیلی اقوال کی روشنی میں بھی فتح اور گناہوں پر قابو پانے میں کامیابی کی علامت ہے۔ اگر صلیب اپنے گناہوں کا بوجھ کسی اور کے کندھوں پر ڈالنے کی علامت ہے تو کھجور کا درخت ایسے وجود کی نشانی ہے جو مردانہ وار اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ اور بھاری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے وہ اوپر ہی اوپر جاتا رہتا ہے۔ حقیقی اور آبرومندانہ زندگی اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالنے میں نہیں ہے' خود اٹھانے میں ہے۔ جنت جانے کے لیے خود محنت کرنے اور مخلصانہ مساعی بروئے کار لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کفارے کے عقیدے کا تجزیہ کیا جائے تو یہ شیطان سے شکست کے اعتراف کے سوا کچھ بھی نہیں ہے لیکن کھجور کا درخت ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ ہم جھلسا دینے والی دھوپ کی تمازت اور صحرا کی خشک اور گرم ہوا کا مقابلہ کرتے ہوئے اور اسی کی طرح اپنی جڑوں کو مسلسل گہرائی میں اتارتے ہوئے جینے کا سلیقہ سیکھیں۔ یہ درخت وقتاً فوقتاً آنے والے شدید طوفانوں کے تھپیڑے کھانے کے باوجود اپنا ایک پتہ تک نہیں گرنے دیتا' اسی طرح مومن بھی مصائب کے طوفانوں میں ثابت قدم رہتا ہے اور ہر ممکن طریقے سے خود کو گناہوں سے بچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور پھر سرخرو ہو کر خدا کے سامنے جا حاضر ہوتا ہے۔ اپنے اعمال کی خود جوابدہی کا احساس انسان میں جرات' دلیری اور احساس ذمہ داری اجاگر کرتا ہے۔ کفارے کا عقیدہ انہیں شراب نوشی' اور اس سے متعلقہ دیگر گناہوں

کے ارتکاب کی کھلی چھٹی دیدتا ہے۔ جس کے مظاہر ہمیں امریکہ اور یورپ میں ملتے ہیں۔

انجیر اور زیتون

انجیر اور زیتون کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ۔ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ۔ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ۔ (قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طورِ سینا اور اس پُرامن شہر (مکہ) کی ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا پھر اسے اُلٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچا کر دیا سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ (سورۃ التّین آیات 1 تا 6)

انجیر اور زیتون دونوں معروف ثمر آور درخت ہیں بائبل میں ان کے نام خاص علامات کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ ''انجیر'' انسانی روح خدا کی طرف سے پیغمبری عطا ہونے اور وحی کی علامت مانی جاتی ہے۔ جبکہ ''زیتون'' دنیاوی اقتدار اور انسانی تہذیب کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ آیئے پہلے ہم انجیر کی گواہی پر غور کرتے ہیں۔

1: بہت سی سامی (Semitic) زبانوں میں اسے ''ٹیناہ'' (Tenah) کہا جاتا ہے جس کی جمع ''ٹینم'' (Tenim) بنتی ہے عرب اسے ''تین'' کہتے ہیں جو ''اسم'' کی آرینائی اور عبرانی ''جز'' ہے۔ ہم اپنے اس نتیجے کی بنیاد پر حقیقت پر رکھتے ہیں کہ کسی گروپ کی زبان یا بولی ہمیں یہ نہیں بتاسکتی کہ اسے ''تین'' یا ''تیناہ'' کیوں کہا جاتا ہے؟ اس پر تمام مستشرقین میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ عربی میں اس کی جز ''آنی'' ''آنیا'' اور ''اتانیہ'' ہے۔ جس کے معنی ہیں ''گرمائش پہنچنا'' گرمی اور گرم موسم۔ عربی لغت سے پتہ چلتا ہے کہ ''تین'' کے اصلی معنی یہ ہیں ''سخت سردی کا زمانہ بیت چکا اب موسم تبدیل ہوا ہی چاہتا ہے'' جس سردی نے تمام روئیدگی کو موت سے دوچار کردیا تھا وہ گزر چکی ہے اور ایک معتدل اور خوشگوار موسمِ بہار آرہا ہے جو زندگی کو ایک نیا جوش وخروش عطا کردے گا۔

2: ہوسکتا ہے کہ ہماری اس تحقیق سے بعض لوگوں کو اتفاق نہ ہو ہم ایسے حضرات

کے استفادے کے لیے یسوع مسیح کے اقوال پیش کرتے ہیں:۔

"اب انجیر کے درخت سے ایک تمثیل سیکھو' جونہی اس کی ڈالی نرم ہوتی ہے اور پتے نکلتے ہیں تو تم جان لیتے ہو کہ گرمی نزدیک ہے۔ اسی طرح جب تم ان سب باتوں کو دیکھو تو جان لو کہ وہ نزدیک بلکہ دروازے پر ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک یہ سب باتیں نہ ہولیں' یہ نسل ہرگز تمام نہیں ہوگی" (متی کی انجیل باب 24' آیات 32......34)

لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ جب کرسمس آتی ہے تو درخت اپنے تمام پتوں سے محروم' یعنی بالکل ننگے ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت سال کے اس حصے میں تمام درخت عملاً مردہ ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تمام کرسچین آبادیاں مصنوعی "کرسمس ٹری" تیار کر کے اپنی اس مذہبی تقریب کی رونق بڑھاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کرسمس کا یہ درخت کیا اہمیت رکھتا ہے؟ کیونکہ جب آپ یہ بات سوچتے ہیں تو آپ کے ذہن میں معاً یہ خیال آجاتا ہے کہ جب یسوع مسیح پیدا ہوئے تھے تو تمام درخت منجمد کر دینے والی سردی سے ٹھٹھر کر مر چکے تھے۔ اس لیے ہم قدرتی طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بسلسلۂ تقریب ان مصنوعی درختوں کا تیار کیا جانا' ایک متوقع مصلح کی تشریف آوری کی امید باندھنے اور خوشی منانے کے سلسلے کی کڑی ہے۔ جو بقول یسوع مسیح "انجیر کی نرم و نازک ڈالی تازہ پتوں سے بھر جائے گی" یہی کچھ ماہ ربیع الاول میں موسم بہار کی اچانک آمد پر ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں جب پہلی بار مہینوں کے نام رکھے گئے تو موسم بہار کے آغاز کے مہینے کو ربیع الاول قرار دیا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یسوع مسیح اپنی آمد کا حوالہ نہیں دے رہے تھے کسی اور کی طرف اشارہ تھا۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ یسوع دسمبر کے اواخر میں پیدا ہوئے تھے جب ان کی اپنی دعا اور ان کی طرف سے لعنت بھیجنے کے نتیجے میں انجیر کا درخت مرجھا کر مردہ ہو گیا تھا۔ اس وقت تو تمام درخت مرچکے تھے۔ لہٰذا یہاں یسوع مسیح "متوقع معلّم" کا حوالہ دے رہے ہیں جس نے اس وقت آنا تھا جب انجیر کی ڈالیاں نرم ہو جاتی تھیں ان میں پتے نکلنے کو تیار اور زندگی کی نئی توانائی کا ظہور ہونے والا تھا۔ ربیع الاول آنے والی ہستی کی ولادت کا مہینہ ہے اور انجیر کا درخت' نبوت کے روحانی درخت کا متماثل ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس "معلّم" کی آمد روح اور مذہب کے جملہ

امور میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دینے والی تھی اور ان کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جانے والی تھی۔ انجیر کے درخت کے ساتھ نئے پتوں کا لگنا بھی اسی عظیم واقعہ کی یادگار اور اس پر خوشی کا اظہار ہے۔

3: انجیل میں انجیر اور زیتون کا بکثرت ذکر آیا ہے۔ یہ ذکر ان کے بطور غذا استعمال کے بارے میں بھی ہے اور بطور علاجِ امراض بھی۔ انسان شروع سے ہی ان دو درختوں کو اگاتا اور انہیں ترقی دیتا رہا ہے تاکہ ان کی افادیت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو سکے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ شروع سے موجودہ شکل میں نہیں پائے جاتے تھے' اس وقت یہ بے ڈھنگے اور بے ڈول قسم کے تھے جوں جوں انسان ذہنی طور پر خود ترقی کرتا رہا' اس نے انہیں بھی پیوندکاری وغیرہ سے ترقی دی جس سے ان کا ذائقہ بھی خوشگوار تر ہو گیا ہے اور افادیت بھی بڑھ گئی ہے۔ اسے اس امر کی نشانی سمجھنا چاہیے کہ فطرت نے انسان کو خدا کی پیدا کردہ اشیا کو ترقی دینے کی ترغیب دی ہے اور اس پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ترقی دے کر درجہ کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ زیادہ تر جانوروں کے بچے پیدا ہونے کے بعد چند دن میں ہی اپنا دفاع کرنا سیکھ جاتے ہیں اور خوب دوڑ بھاگ شروع کر دیتے ہیں' دوسری طرف انسان کا بچہ کافی دیر کے بعد اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھتا ہے اور اپنا دفاع کرنا بھی دوسرے جانوروں کی بہ نسبت دیر سے سیکھتا ہے۔ لیکن بعض صلاحیتوں میں انسان دیگر تمام جانداروں سے آگے ہے۔ ان جانداروں میں ترقی کا دائرہ' انسان کے مقابلے میں انتہائی تنگ اور انتہائی محدود ہوتا ہے۔ انسان کو خدا نے ہر جاندار سے بڑھ کر صلاحیتیں عطا کی ہیں مگر مقامِ افسوس ہے کہ انسانی فطرت کے اس راز سے ہمارے مسیحی بھائی بے خبر رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انسان فطرتاً ہی گناہگار اور شرپسند ہے' اس لیے وہ ذاتی کوششوں سے اپنی اصلاح نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اسے عقیدۂ کفارہ پر ہی ایمان لانا ہوگا۔ اور اسی کی بنا پر وہ اپنے گناہوں اور بداعمالیوں کا بوجھ خدا کے ''بیٹے'' کے کندھوں پر منتقل کر کے بے فکری کی زندگی گزار سکتا ہے۔ دوسری طرف انجیر اور زیتون کے درخت اس اسلامی عقیدے کی تائید کرتے ہیں کہ انسان اپنی ذہانت اور کوششوں کی بدولت اپنی خامیوں اور کمزوریوں پر قابو پا سکتا ہے' بنجر اور کم ثمر آور درختوں کی افادیت بڑھا سکتا ہے اور جتنی چاہے انہیں ترقی دے سکتا ہے۔ حتیٰ کہ انجیل خود کہتی

ہے کہ ''انسان کو محنت کر کے انجیر اور زیتون کے درختوں کے نیچے پناہ لے لینی چاہئے'' (1سلاطین 24:4) جو دراصل یہ نصیحت ہے کہ انسان اپنی کوششوں کو بروئے کار لا کر گناہوں اور شر سے نجات پا سکتا ہے۔

4: انجیر کے جس درخت کو پھل نہ لگتا ہو یا اس کا پھل انسانی استعمال کے قابل نہ ہو تو اسے لعنتی قرار دے کر تباہ کر دینا مناسب نہیں ہے' اس کی پیوندکاری کر کے اس کی کوالٹی بہتر بنائی جا سکتی ہے۔ خدا نے انسان کو جب درختوں کو ترقی دینے کا علم دیدیا ہے تو اسے یہ سبق بھی دیدیا ہے کہ وہ اپنے دنیوی اور اخروی مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے اپنی مساعی بروئے کار لا سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں' شاید کہ تم اس سے سبق لو۔ پس دوڑو اللہ کی طرف' میں تمہارے لیے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں..... سورۃ الذّاریات' آیات 49' 50)۔ جس طرح تمام اشیا' دوسری چیزوں (جوڑوں) کے تعامل و تعاون سے نشوونما اور ترقی پاتی ہیں' اسی طرح انسان بھی بہتر اشخاص سے میل جول اور ان کی صحبت اختیار کر کے اعلیٰ روحانی مقام پا سکتا ہے۔ ہم نبی اکرمؐ کی مثال لے سکتے ہیں کہ آپ نے سرزمین عرب کے اجڈ اور گنوار لوگوں کو شائستہ مزاج اور خدا ترس شخصیتیں بنا دیا لہٰذا ہمیں بھی خود کو پیدائشی گنہگار سمجھ کر مایوس نہیں چاہئے' بہتر دوستوں اور رہنماؤں کی صحبت سے ہمارے معاملات بھی سنور سکتے ہیں۔ اس کے برعکس کفارے کا عقیدہ انسان کو بے عملی کا درس دیتا ہے کہ تُو تو پیدائشی گنہگار ہے' اب تُو خدا کا ''بیٹا'' ہی تمہارا بیڑہ پار لگا سکتا ہے۔

5: قرآن میں انجیر اور زیتون کا حوالہ ایک اور لطیف نقطے کی طرف بھی اشارہ دیتا ہے۔ انجیر کی اپنی مخصوص فطرت یا مخصوص قسم کی صلاحیتیں ہیں' اسی طرح زیتون کا درخت بھی اپنی الگ قسم کی خصوصیات رکھتا ہے۔ یہ دونوں اپنے اپنے دائرے کے اندر رہ کر نشوونما پاتے ہیں اور الگ الگ قسم کے پھل دیتے ہیں۔ انجیر کے بیج سے زیتون کا درخت نہیں اُگ سکتا اور نہ ہی زیتون کا بیج' انجیر کے درخت کو وجود میں لا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دونوں کی فطرت بھی الگ الگ ہے اور ان کی صلاحیتیں بھی اپنی اپنی ہیں کوئی شخص کیکر کا پودا لگا کر اس

کے ساتھ سیب لگنے کی توقع نہیں رکھ سکتا۔ جیسا کہ یسوع مسیح نے کہا...... ''کیا جھاڑیوں سے انگور' یا اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں۔'' (متی 16:7) اگر کوئی آدمی فطرتاً ہی شریر اور مفسد ہو' اس سے اچھا انسان بن جانے کی توقع ہی نہیں رکھی جا سکتی۔ امر حقیقت یہ ہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ وہ جرائم پیشہ اور گنہگار ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس نے اپنی حقیقی فطرت کی اُس آواز کی طرف توجہ ہی نہیں دی جو خدا نے پیدا کی ہے۔ بلکہ اپنے نفس کی سفلی خواہشات کی پیروی کرتا رہا ہے۔ کسی کو مستقل اور دائمی طور پر لعنتی قرار دینا انصاف کے منافی ہے۔ خدا نے تو کسی کی فطرت خراب نہیں بنائی' کسی کی بداعمالیوں کو خالق فطرت کے کھاتے میں کیسے ڈالا جا سکتا ہے؟

6: انجیر کا درخت ہمیں کیا سبق دیتا ہے؟ یہ نہایت وفاداری کے ساتھ اس رجحان کی پیروی کرتا ہے جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہ صرف ایک درخت ہے لیکن دوسرے درختوں سے واضح طور پر مختلف ہے اور ان سے بالکل مختلف قسم کا پھل دیتا ہے۔ تاہم اس سے اگر یہ شکایت کی جائے کہ اس کے ساتھ سیب کیوں نہیں لگتے تو یہ جائز نہیں ہوگی۔ اگر درخت باتیں کر سکتے اور یہ سوال انجیر کے درخت سے پوچھا جاتا تو اس کا جواب یقیناً یہی ہوتا کہ مجھے خدا نے جس فطرت پر پیدا کیا' اس میں سیب کا پھل دینا شامل نہیں تھا۔ اس نقطے کو ذہن میں رکھتے ہوئے مسیحیوں کے تصورِ گناہ پر ذرا سنجیدگی سے سوچیے: جب ہم لفظ ''درخت'' بولتے ہیں تو اس سے ہماری مراد ایک ایسی ''چیز'' ہوتی ہے جو اپنے اندر مخصوص صفات رکھتی ہے۔ اس کو کسی صورت ان صفات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خزانۂ فطرت میں جہاں بھی پائی جائے گی انہی صفات سمیت موجود ہوگی۔ آیئے اب چند گناہوں کو لیتے ہیں۔ مثلاً چوری چکاری' حرام کاری' جھوٹ بولنا اور دھوکہ دینا وغیرہ وغیرہ۔ کسی عیسائی کا یہ کہنا کہ انسان گنہگار ہے اور شریر و مفسد ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد کے اندر ہر قسم کا گناہ موجود ہے' حالانکہ یہ بات بدیہی طور پر غلط ہے۔ پوری دنیا میں ایسا شخص نہیں ملتا جس کی ذات سراسر گناہ اور شر ہو۔ خواہ گناہ' بقول ان کے انسان کی سرشت ہی میں پایا جاتا ہو۔ کوئی کام یا عمل گناہ نہیں کہلا سکتا جو کسی شخص کے ''خلقی اوصاف'' (Inherent Qualities) کا حصہ ہو۔ یہ ہمارے مشاہدے کے بالکل برعکس اور برخلاف ہے کہ تمام ممکنہ گناہ اور عیوب ایک ہی شخص کے اندر

پائے جاتے ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر شخص اپنے ایک ایک دو دو گناہوں اور عیبوں سے زندگی کے مختلف مرحلوں میں نجات پاتا رہتا ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ گناہ' اس کی فطرت کا حصہ نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ انہیں ایک ایک کر کے چھوڑنے پر قادر نہ ہو سکتا۔ جب بھی انسان گناہ کرتا ہے تو اس کا ضمیر اسے کچوکے لگاتا ہے' کچھ شرمندہ ہوتا ہے اور کچھ بے عزتی محسوس کرتا ہے۔ یہ علامات اس کی فطرت کی داخلی کیفیات کے مظاہر ہیں' اس کے اندر کی آواز اسے کہتی ہے کہ تو نے جو کیا ہے' وہ غلط ہے۔ گناہ کو انسان کی اندرونی فطرت کا حصہ صرف اسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ اسے ذرہ بھر بھی قابلِ ملامت نہ سمجھے اور خوشی خوشی اسکا ارتکاب کرتا ہو۔ لیکن یہ مسیحی فلسفۂ زندگی کا بنیادی اصول ہے کیونکہ تمام عیسائی ملکوں میں ہر قسم کے گناہ کے لیے لائسنس دیدیا گیا ہے' تاہم اس صورت میں مشکل یہ ہوگی گناہ کے تمام کاموں پر سے گناہ کے داغ دھبے ہٹانے پڑیں گے۔ مگر اس کے باوجود بھی یہ ثابت کرنا ناممکن ہوگا کہ برائی' انسان کی داخلی فطرت (سرشت) میں شامل ہے۔

اگر ہم ایسا مفروضہ قائم ہی کر لیں تو کوئی باشعور انسان ہمارے ساتھ اتفاق نہیں کرے گا کہ گناہ اور برائیاں انسان کی بنیادی فطرت کا حصہ ہیں۔ یہ برائیاں ''سیکھنے'' سے' اور گناہ ''کرنے'' سے آتے ہیں۔ اگر آدمی ایک خاص قسم کی حرکت یا کارروائی کرے تو وہ تب گنہگار ٹھہرتا ہے' لیکن اگر وہ ان سے باز رہے تو ایسا کرنے پر بالکل قادر ہوتا ہے۔ اور یہ ہر کسی کے مشاہدے میں بھی آچکا ہے کہ کئی لوگ' حتیٰ المقدور گناہ سے دور رہتے ہیں۔ اور اگر کسی وقت کچھ غلط حرکتیں کرتے تھے تو ان سے یکے بعد دیگرے پیچھا چھڑانے میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ یہ بات اس امر کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ گناہ' فطرت انسانی کا حصہ نہیں بلکہ ایک ارادی فعل ہے اور انسان اسے چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کا خود فیصلہ کر سکتا ہے۔

7: انجیل کی زبان میں بعض انجیریں اچھی ہوتی ہیں اور بعض بری ہوتی ہیں (یرمیاہ باب 24 آیات 1 تا 5) یہ محاورہ انسانوں کی اخلاقی حالت اچھی یا بری ہونے کے حوالہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ جب تک اسرائیلیوں کی اخلاقی حالت اچھی تھی وہ صرف ایک حقیقی خدا کی عبادت کرتے تھے اور ان میں انبیاء بھی مبعوث ہوتے رہے۔ لیکن جب ان کی نافرمانیاں ایک حد سے بڑھ گئیں تو انجیر کا درخت اپنی جڑوں تک سوکھ گیا۔ اور یہودی روایتوں اور عقائد

کے حوالے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ''ملاکی'' یا ''ملاخی'' (Malachi) کے بعد ان میں کوئی نبی نہیں آیا۔ جبکہ مسیحی تصور کے مطابق سلسلۂ نبوت حضرت عیسیٰ کے بعد ختم ہوا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسیحی اب اچھی انجیر ہیں یا بُری؟۔ کیونکہ عقیدہ کفارہ انسان کے افعال پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوتا۔ یا اگر یہ کچھ اثر ڈالتا ہے' تو برا اثر ڈالتا ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ نے کفارے کے لیے قربانی دے کر عیسائیوں کو اعمال کے اچھے یا برے ہونے کے پیچیدہ سوال سے بے نیاز کر دیا ہے۔ انہوں نے قانون کو بھی لعنت قرار دیا تو اس طرح اپنی ذاتی قربانی کی بنا پر عیسائیوں کو اس لعنت سے بھی آزادی دلا دی۔ اب انسان کے اعمال اس کے اچھا یا برا ہونے کی کسوٹی نہیں رہے۔ پھر کسوٹی صرف یہ رہ گئی کہ وہ ''ایمان'' رکھتا ہے یا نہیں رکھتا۔ یہاں ایمان سے مراد حضرت عیسیٰؑ پر ایمان نہیں بلکہ ''کفارے کی قربانی'' پر ایمان ہے کہ انہوں نے کیسی موت قبول کی تھی۔ کیونکہ اگر کوئی شخص یسوع مسیح کے پیغمبر ہونے اور مجازی معنوں میں خدا کا بیٹا ہونے پر ایمان رکھتا ہے لیکن ان کی کفارے کی قربانی پر ایمان نہیں رکھتا تو وہ لائق بخشش و نجات نہیں ہوگا۔

8: یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مسیحؑ پر ایمان لانے کا مطلب ہی عقیدۂ کفارہ پر ایمان لانا ہے۔ لیکن ایک ذہین و دانشمند انسان جانتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی الوہیت پر ایمان اور اس بات پر ایمان کہ وہ کفارے کی قربانی دیتے ہوئے صلیب پر چڑھے' الگ الگ باتیں ہیں اور ان میں بنیادی نوعیت کا تضاد ہے۔ خدا کو ''مصلوب'' نہیں کیا جاسکتا۔ ثانیاً ایک اور صورت حال بھی پیدا ہوئی ہے جو کفارے کی قربانی کے اصول کی تکذیب کرتی ہے اور وہ یہ کہ جب حضرت مسیحؑ نے کفارہ دیا تو اس وقت بنی نوع انسان نے کون سے گناہ کیے تھے جن کا بوجھ انہیں اٹھانا پڑا؟۔ دنیائے انسانیت کے ماضی کے گناہ یا وہ گناہ جو ابھی سرزد نہیں ہوئے تھے بلکہ مستقبل میں ہونے والے تھے۔ لیکن ایسی سوچ معقولیت کے منافی ہے۔ اس سے زیادہ غیر معقول بات کیا ہوگی کہ جو گناہ ابھی ہوئے ہی نہیں ان کے لیے سزا دی جائے۔ کیا یہ ناانصافی کی انتہا نہیں ہے کہ انجیر کے درخت کو' جس سے ابھی تک کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا' اسے ملعون قرار دے کر تباہ کر دیا جائے؟

9: یہ ایک عقل عام کی بات ہے کہ ہر گنہگار کو ملنے والی سزا اتنی ہی ہونی چاہیے جس

قدر اس نے گناہ کیا ہو۔ یعنی سزا اور گناہ کی نوعیت اور اس کی مقدار میں کوئی مناسبت (Proportion) ہونی چاہیے۔ جیسا کہ چیزوں کی قیمت ان کی افادیت کے تناسب سے مقرر کی جاتی ہے۔ آیئے ہم اس بات سے وقتی طور پر اتفاق کر لیتے ہیں کہ یسوع مسیح نے اپنے پیروکاروں کے آئندہ گناہوں کے بدلے صلیب کی موت قبول کی تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان دونوں کے مابین تناسب کیا ہے؟ کیا مستقبل میں انسان کی طرف سے ہونے والے گناہوں اور سزا میں توازن قائم ہو چکا ہے۔ یا ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے کم یا زیادہ ہے؟ اگر کفارے کی قیمت گناہوں کی مقدار سے کم ہے پھر تو انصاف کے تقاضے پورے ہو گئے ہیں۔ لیکن کفارے کی قیمت ان سے زیادہ ہے اور ہونی چاہیے کیونکہ سزا یاب شخص خدا کا بیٹا ہے تو بھی ناانصافی ہو چکی ہے اور خدا نے بھاری قیمت وصول کر لی ہے جیسا کہ بعض اوقات بد دیانت تاجر کرتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہم انجیل کے صفحات پر جس خدا کا ذکر پاتے ہیں وہ اپنے غیظ و غضب میں بعض اوقات بھاری سزائیں دیتا رہا ہے اگرچہ بعد میں اس ناانصافی پر اس نے پشیمانی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسی پشیمانی بالکل بے فائدہ رہتی ہے کیونکہ اس سے نقصان کی تلافی نہیں ہو پاتی۔

انجیر اور کھجور کے درختوں کے مقصد اور کارکردگی کو دیکھا جائے تو ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا کوئی ازالہ نہیں ہوا۔ انجیر کے درخت کی مساعی کو دیکھیے اور اس کی جڑوں کی قربانی کا حساب کیجیے تو جو کمی بیشی پائی جائے اس کے ازالے کا کوئی انتظام ہونا چاہیے۔

10: انجیر کے درختوں کی بعض اقسام اچھی ہوتی ہیں اور بعض اقسام خراب ہوتی ہیں۔ ان دونوں کی قیمت برابر نہیں ہوتی اور نہ ہی دونوں کے پھل یکساں کوالٹی کے ہوتے ہیں۔ اب ایک بدقماش رہزن کی مثال لیجیے جو کہ عیسائی ہے یا کسی ملک کی عیسائی گورنمنٹ کو لے لیجیے جو یکے بعد دیگرے کئی ملکوں کو شکست دیتی اور تباہی پھیلاتی رہی ہے۔ اور اس نے ساری دنیا کو ملبے ڈھیر بنا دیا ہے۔ دوسری طرف ایک درویش صفت عیسائی ہے جو دیانتدارانہ زندگی گزارتا ہے اور کسی کو بال برابر بھی گزند نہیں پہنچاتا۔ لیکن یسوع مسیح نے صلیب پر چڑھ کر ان دونوں کے گناہوں کا کفارہ دیدیا ہے۔ اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ کفارے کی قربانی سے ان

دو میں سے کس نے زیادہ فائدہ اٹھایا؟ اچھے عیسائی نے یا ڈاکو عیسائی نے؟ انجیل کا کہنا ہے کہ شر پسند اور گنہگار انسانوں کو ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ لیکن کیا اس سزا سے سنگین گناہوں کے مرتکب افراد معمولی گناہوں کے مرتکب افراد برابر نہیں ہو جائیں گے؟

11: عہد نامۂ عتیق میں حضرت داؤدؑ کو ہرے بھرے زیتون کے درخت سے تشبیہ دی گئی ہے (زبور 8:52) اسی وجہ سے بادشاہ کے سر میں روغن زیتون کی مالش کی گئی اور اس کے ہاتھ میں انجیر کا عصا دیا گیا تھا۔ انہی انجیلی روایات کے مطابق یہ درخت حضرت سلیمانؑ کے زمانے کے بعد مرجھا گیا اور پھر مر گیا۔ کیونکہ ان کے بعد اسرائیلیوں میں کوئی حقیقی بادشاہ نہیں رہ گیا تھا۔ تاہم حضرت محمدؐ اس تخت کے وارث بن گئے اور زیتون کے درخت نے گواہی دے دی کہ آپؐ ہی اس کے حقیقی وارث ہیں نہ کہ حضرت عیسیٰؑ۔

12: انجیر کے درخت کے بارے میں جو حکایت حضرت عیسیٰؑ نے بیان کی اور زیتون کے بارے میں جو حضرت داؤد نے بتائی۔ انہیں ذہن میں رکھتے ہوئے حضرت محمدؐ کے دعویٰ نبوت پر غور فرمائیے۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ انجیر کا درخت اپنے مقررہ وقت پر پھولتا پھلتا ہے؟ کیا ہم نہیں جانتے کہ خدا نے اسے نہ صرف جڑ سے نہیں اکھاڑا اور اسے تباہ نہیں کیا بلکہ مزید فروغ دیا ہے اور اس کو بکثرت پھل لگتے ہیں۔ اسی طرح زیتون کا درخت بھی خوب پھولتا پھلتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نبی اکرمؐ بے پناہ دنیاوی قوت اور شان و شوکت کے مالک بنے۔ قریش مکہ اور دیگر قبائلِ یہود و نصاریٰ نے آپؐ کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن جتن کر ڈالا لیکن سوائے ناکامی کے ان کے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو سب دشمنوں پر فتح و کامرانی عطا فرمائی۔ موسم بہار کے اوائل میں پیدا ہونے والا انجیر کا درخت ماہ ربیع الاول میں بدستور پھولتا پھلتا رہا جس کے بارے میں عیسائیوں کا کہنا ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰؑ کی درخواست پر پھل دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت انہیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ پھر وہی درخت سرزمین عرب میں بکثرت پھل دے رہا ہے۔ اسی طرح زیتون کا درخت، جس کے تیل سے حضرت عیسیٰؑ اپنے سر کی مالش کروانا چاہتے تھے اور اس کا عصا اپنے ہاتھ میں لے کر چلنے کی تمنا رکھتے تھے لیکن ناکام رہے۔ یہودیوں نے انہیں اس الزام میں سولی پر چڑھایا کہ وہ بقول ان کے، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی جگہ لینے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

اسی زیتون کے درخت نے حضرت محمدؐ کو وہ سب کچھ خوشی خوشی دیدیا جو اس نے حضرت عیسیٰؑ کو نہیں دیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے خود کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت داؤدؑ دونوں کا وارث ثابت کر دیا تھا لہٰذا مبارک ہے وہ جو آپؐ پر ایمان لاتا ہے اور برے انجام کی آگ سے خود محفوظ کر لیتا ہے۔

13: انجیر کا پھل بطور غذا بھی کھایا جاتا ہے اور بطور دوا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ یہ آسانی کے ساتھ ہضم ہوتا ہے' انسانی جسم میں تناؤ اور کھچاؤ کم کرتا ہے۔ پھیپھڑوں میں سے مضر بلغم کو خارج کرتا ہے اور مثانے میں سے پتھری باہر نکالتا ہے۔ جسم کو فربہ کرتا ہے اور بواسیر' گنٹھیا اور فالج کے علاج میں بہت مفید کردار ادا کرتا ہے۔ انجیل میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ یہ ایک خطرناک پھوڑے پر لگایا گیا تو وہ پھٹ گیا' اس میں سے مضر اجزا خارج ہو گئے جس کی وجہ سے مریض ٹھیک ہو گیا۔ (2 سلاطین 7:20)۔ انجیر کی ان خاصیتوں کا قرآن کے ساتھ ایک تعلق ہے کیونکہ یہ آسمانی کتاب بھی دل کے تمام عوارض اور روح کی جملہ بیماریوں کے لیے شفا کا پیغام ہے۔

14: انجیر کے پھل میں ایک اور خوبی بھی ہے۔ بعض پھلوں کی بیرونی سطح' یعنی خول بہت سخت ہوتا ہے اور بعض پھلوں کے اندر پتھر کی طرح سخت گٹھلی ہوتی ہے۔ لیکن انجیر' اندر اور باہر' دونوں طرف سے یکساں ہوتی ہے' بعینہٖ مومن کی طرح۔ خواہ آپ باہر سے دیکھیں یا اس کے اندر جھانک کر اس کے باطن کی خوبیاں پرکھیں اس کی شخصیت میں کوئی تضاد دکھائی نہیں دے گا اور نہ کوئی منافقت پائی جائے گی۔ انجیر کا وہ خاص درخت' جس کے پاس حضرت عیسیٰؑ پھل پانے کی امید پر گئے تھے' اس پر صرف پتے تھے' پھل نہیں تھا۔ یہ حکایت دراصل اس دور کے یہودیوں کی روحانی حالت کی طرف ایک اشارہ ہے کہ دیکھنے میں تو خوبصورت چہرہ' اچھا لباس عمدہ رکھ رکھاؤ اور نرم کلام مگر بہ باطن خود غرض' سنگدل اور بغض و حسد سے بھرا ہوا۔ حضرت مسیحؑ نے ان کے بارے میں کیا خوب کہا تھا...... ''دیکھو میں تم کو بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں۔ پس سانپوں کی مانند ہوشیار اور کبوتروں کی مانند بے آزار بنو'' (متی کی انجیل 16:10)۔ کتابِ ایوب میں حضرت عیسیٰؑ کے دشمنوں کی اس خصلت کا کیا اچھا نقشہ کھینچا گیا ہے: یہ ''بظاہر اچھے' بباطن بُرے'' ہیں یہ لوگ تباہی پھیلانے کے جملہ وسائل سے لیس

ہیں' انہوں نے نہ بچوں اور کمزوروں اور بوڑھوں کو معاف کیا اور نہ ان بے ضرر عابد و زاہد لوگوں کو چھوڑا جو کسی کو بھی گزند نہیں پہنچاتے۔

15: پیروکارانِ مسیح کی پالیسیاں ان کے خودغرضانہ مقاصد اور مفادات کی تابع ہوتی ہیں۔ دوسری طرف انجیر کا درخت راستباز لوگوں کے خصائل کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ اپنے پھولوں کی بہار دکھانے سے پہلے ہی پھل لے آتا ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء اور راست باز لوگ' دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے زندہ رہتے ہیں' خود اس لیے تکلیفیں اٹھاتے رہتے ہیں کہ دوسروں کو فائدہ پہنچ سکے۔ قرآن کے الفاظ میں ......''وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ'' (اور وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں......سورۃ الحشر آیت ۹) لیکن انجیل جو کچھ حضرت عیسیٰؑ سے منسوب کرتی ہے اس کے مطابق انہوں نے اپنے پیروکار مچھیروں سے کہا......''میرے پیچھے آؤ میں تمہیں انسانوں کے مچھیرے بنادوں گا'' (مرقس 17:1)

یہاں تھوڑی دیر رک کر مچھیروں کی مخصوص ذہنیت اور ان کے ہتھکنڈوں پر غور کیجئے جنہیں وہ مچھلیوں پر آزماتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنے کنڈوں پر ''چارہ'' یعنی کوئی کیڑا وغیرہ پرو کر دریا یا جھیل میں ڈال دیتے ہیں۔ سادہ لوح مچھلی اسے غذا سمجھ کر نگلتی ہے تو کنڈا اس کے حلق میں پھنس جاتا ہے اور وہ تڑپنے لگتی ہے تو مچھیرا اسے باہر کھینچ لیتا ہے۔ یا بعض مچھیرے دریا کی تہہ میں جال پھینک دیتے ہیں جب مچھلیاں بے خبر اس پر منڈلانے لگتی ہیں تو وہ جال کو سمیٹ کر سب کو باہر لے آتا ہے۔ بعض تاجر بھی گاہکوں کو پھنسانے کے لیے دکھاتے کچھ ہیں اور ان کے ساتھ کرتے کچھ ہیں۔ مچھیرے جس طرح مچھلیوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر کے پھلتے پھولتے ہیں اسی طرح انسانی مچھیرے نجی سکولوں' کالجوں اور ہسپتالوں کی خوبصورت اور رعب دار عمارتوں کے ذریعہ بے خبر اور سادہ لوح نسلوں کو اچھی تعلیم اور اچھے علاج کا جھانسہ دے کر ان کا مالی اور اخلاقی استحصال کرتے ہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر انسان سوچنے لگتا ہے کہ کیا یسوع مسیح کا مطلب اپنے پیروکاروں کو فی الواقعہ انسانوں کے مچھیرے بنانا تھا؟ (متی 19:4؛ مرقس 17:1)

16: زیتون بھی (انجیر کی طرح) انسان کے لیے غذا بھی ہے اور جسم کے بہت سے روگوں کا علاج بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ مختلف قسم کے چراغوں میں ڈال کر بطور ذریعۂ روشنی

بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا کمال اس امر میں ہے کہ یہ جہاں اپنی جڑیں پھیلاتا ہے وہاں زیرِ زمین پٹرولیم کا کوئی ذخیرہ ہونا ضروری نہیں ہوتا' اس کے باوجود اس کے اندر وہ مادہ (تیل) کہیں سے کھنچ کر آ جمع ہوتا ہے جسے انسان کشید کر کے اپنی شمعیں روشن کر لیتا ہے۔ اس سے برآمد ہونے والا تیل انسانی دماغ' عضلات اور اعصاب کے لیے بہت مفید ہوتا ہے۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ حضرت محمدؐ کی پوزیشن کس حد تک شجر زیتون اور روغن زیتون کے خواص کے مشابہ ہے۔ یہ مشابہت آپؐ کے بارے میں اس درخت کی شہادت کے مترادف ہوگی۔

شجر زیتون کے بارے میں ایک کہاوت ہے کہ اس سے بنا ہوا عصا' جو دنیاوی اقتدار کی علامت ہے کسی کے پاس بطور وراثت نہیں جاتا بلکہ اس کی اپنی حسن کارکردگی اور خداوند کریم کی عنایت کی بنا پر ملتا ہے۔

انجیلی محاورہ و اسلوب بیان کے مطابق زیتون' دنیاوی طاقت کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ درخت اپنا تیل اپنے نیچے کی مٹی اور اپنے اردگرد کی فضا سے اکٹھا کرتا رہتا ہے جو محض اس کی جبلی کارکردگی اور خدائی وجدان (INSPIRATION) کی وجہ سے اسے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم آنحضرتؐ کو پاتے ہیں جنھوں نے خدا کی وحی اور وجدان کی بنیاد پر صحرائے عرب میں ایک مینارۂ نور تعمیر کیا۔ عرب میں کوئی لائبریریاں نہیں تھیں اور نہ ہی آپؐ پڑھے لکھے تھے کہ سکالر کی طرح پڑھتے لکھتے رہتے۔ روغن زیتون کے بارے میں قرآن مجید اپنے نہایت خوب صورت الفاظ میں روحانی قوت اور روشنی کا ذکر کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے: يُوقَدُ مِن شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُورٌ عَلٰى نُورٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُورِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ (اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلایا جاتا ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) اس کا تیل خواہ اسے نہ بھی چھوئے یہ جلنے کو تیار ہے (بڑی) روشنی پر روشنی (ہو رہی ہے) خدا اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔ (سورۃ النور آیت 35)۔ یہاں ''روشنی پر روشنی'' سے مراد نبی اکرمؐ ہیں۔ ایک تو آپؐ بذات خود پاک اور مصفی روشنی تھے جس پر کوئی داغ دھبہ نہ تھا' دوسرا ان میں خدا کی روشنی یعنی انوار خداوندی کے نازل ہونے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ جب تک کہ آپ زندہ رہے

اس سے مستفید ہوتے رہے جب دنیا سے رخصت ہو گئے تو قرآن کی صورت میں یہ روشنی رہتی دنیا میں موجود رہے گی۔ یہ نہ تو شرقی ہے اور نہ غربی بلکہ عالمگیر ہے اور ساری دنیائے انسانیت کے لیے مینارۂ نور ہے۔ہم اس بات سے انکارنہیں کرتے کہ حضرت عیسیٰؑ بھی خدا کی طرف سے روشنی تھے مگر وہ بات سنیئے جو اس ضمن میں خود انہوں نے کہی۔ انہوں نے فرمایا کہ میں روشنی ہوں اس وقت تک کہ جب تک میں اس دنیا میں زندہ رہوں گا لیکن قرآن کی روشنی تا ابد انسانیت کے لیے موجود رہے گی۔

17: عربی میں لفظ ''زیتون'' ......''زیت'' سے نکلا ہے جس کے معنی ''تیل'' ہوتے ہیں' یا ''ضیی'' سے نکلا ہے جس کے معنی ''روشنی'' کے ہوتے ہیں۔ لیکن مذہبی صحیفوں میں یہ لفظ ''امن'' ''اقتدار'' ''طاقت'' اور ''حسن'' کے لیے استعمال ہوا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا بائبلیکا میں لکھا ہے کہ ''یہ لفظ امن وخوشحالی' حسن اور ثمر آوری کی علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے'' (یوحنا 35:12)۔عہد نامۂ عتیق میں اس کا پہلا حوالہ ''کتاب پیدائش'' میں آتا ہے۔ ''جب چند روز میں طوفان تھم گیا تو حضرت نوحؑ نے ایک فاختہ کو فضا میں بھیجا تا کہ وہ یہ دیکھ آئے کہ کیا پانی کم ہونا شروع ہوا ہے۔ فاختہ ایک لمبا چکر لگا کر واپس آئی تو اس کی چونچ میں زیتون کا ایک پتہ پکڑا ہوا تھا۔'' (کتاب پیدائش باب 11:8) جو اس بات کی علامت تھی کہ زمین میں حالات بہتر ہو گئے اور امن وسکون واپس آ گیا ہے۔قرآن میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے۔''اے نوح (کشتی سے) اتر جا' ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ (جو) تمہارے اور تمہاری ساتھی قوموں کے لیے ہیں'' (سورۂ ھُود آیت 48) فاختہ امن وسلامتی کے ان آثار کی اطلاع اپنی چونچ میں پکڑے ہوئے زیتون کے پتے کی صورت میں لائی تھی۔ یہ امن وسلامتی صرف نوح اور ان کی آل اولاد کے لیے نہیں بلکہ تمام اقوام اور لوگوں کے لیے تھی جو ان کے ہمنوا تھے۔ یہی پیغامِ سلامتی نبی اکرمؐ اور ان کے پیروکار دنیا بھر میں پھیلے ہوئے طوفانِ گمراہی کو ختم کرنے کے لیے لائے تھے۔

صنوبر کا درخت:

1: بلند پہاڑوں اور پہاڑیوں پر سیدھا اور خاموش کھڑا گہرا سبز صنوبر کا درخت جو

کبھی کبھی تیز ہوا کے ساتھ جھول رہا ہوتا ہے' اس کی بھینی بھینی خوشبو سارے ماحول کو خوشگوار بنا دیتی ہے۔ یہ بے حد خوبصورت منظر پیش کرتا ہے۔ غالباً انہی خصوصیات کی بنا پر عیسائیوں نے اسے یسوع مسیح کی پیدائش کے ساتھ مستلزم قرار دیدیا ہے۔ کرسمس ٹری اس کی یاد میں ہر سال منائے جانے والے یوم پیدائش کی تقریبات کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ اس کے بغیر یہ تقریبات مکمل ہی نہیں ہوتیں اور یہ یہودیوں میں مبعوث ہونے والے آخری نبی کی یادگار کے طور پر منائی جاتی ہیں۔ عیسائی اگر اپنی قوت مصنوعی ''کرسمس ٹری'' بنانے پر ضائع کرنے کی بجائے اس درخت کو محفوظ کرنے پر صرف کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا جس پر یسوع مسیح نے لعنت بھیجی تھی۔

2: عبرانی زبان میں صنوبر کو ''بیرش'' یا ''بیرت'' کہا جاتا ہے۔ یونانی' آرمیائی' شامی' فنیقی اور لاطینی زبانوں میں اس کا ایک ہی تلفظ ہے لیکن انگلش' جرمن اور سویڈش میں اسے ''فر'' کہتے ہیں۔ لیکن سکالرز کے مابین اس بات پر اختلاف ہے کہ ''بیرش'' یا ''بیرت'' فی الواقع عبرانی الفاظ ہیں یا دوسری زبانوں کے ہیں اور کسی طریقے سے عبرانی میں گھس آئے ہیں۔ تاہم انجیل میں آنے والے صنوبر کی کہانی خاصی دلچسپ ہے۔ حضرت داؤد اپنی مناجات جب خوش الحانی سے پڑھتے تو ساتھ ایک ساز بجاتے تھے جو صنوبر کی لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ (2 سیموئل 3:6)

3: عہدنامۂ عتیق کے بارہ اہم ترین پیغمبروں میں سے پہلے پیغمبر ''ہوسیع'' (HOSEA) کہتے ہیں...... ''افرائیم کہے گا' مجھے اب بتوں سے کیا کام' میں نے اس کی بات سنی اور اسے اچھی طرح دیکھا' میں سرسبز صنوبر (سرو) کی طرح ہوں' تجھے مجھ سے پھل ملے گا'' (انجیل ہوسیع 8:14)۔ افرائیم حضرت یعقوبؑ کا پوتا اور حضرت یوسفؑ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ ایک روایت کے مطابق اسرائیل کی توارثات کے سلسلہ میں حضرت یوسف کا سب سے بڑا بیٹا منسّی ان کا وارث ہونا چاہئے تھا لیکن جب حضرت یعقوبؑ نے اپنی وفات کے وقت یوسف کے دو بیٹوں کو ''برکت'' دینے کے لیے بلوایا تو حضرت یوسفؑ نے پہلوٹھی کے بیٹے منسّی کو یعقوبؑ کے سامنے ان کے دائیں طرف کھڑا کر دیا اور چھوٹے افرائیم کو ان کے سامنے بائیں جانب کھڑا کر دیا۔ اس ترتیب سے کھڑے کرنے سے ان کا خیال یہ تھا کہ دادا

یہودی روایت کا پاس کرتے ہوئے اپنی ''برکت'' کا وارث منسّی کو بنائے گا لیکن یعقوبؑ نے اپنا دایاں ہاتھ افرائیم پر اور بایاں، منسّی پر رکھ دیا یوسفؑ نے سمجھا، شاید والد نے بوجہ ضعیف العمری، بھول کر، یہ غلطی کر دی ہے انہوں نے اس فروگزاشت کی طرف توجہ دلائی مگر والد نے اس مداخلت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے فیصلے کو برقرار رکھا۔ یعنی دایاں ہاتھ چھوٹے پوتے کے سر پر ہی رکھا۔ (کتاب پیدائش 48:13، 14) اس واقعہ کے تقریباً ایک ہزار سال بعد آنے والے نبی ہوسیع نے اس واقعے کا اعلان کیا، ظاہر ہے کہ اس وقت افرائیم زندہ نہیں تھا۔ اوپر ہم نے ''افرائیم کہے گا'' کے جو الفاظ نقل کیے وہ واضح طور پر ایک واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو مستقبل میں رونما ہونے والا تھا۔ اس طرح ''افرائیم'' سے مراد ''افرائیم کی آل اولاد'' سمجھی جانی چاہئے اور یہ تعبیر انجیلی روایات کے عین مطابق ہے۔

بعد ازاں حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد جب ان کے بیٹے کے خلاف اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں سے دس نے بغاوت کر کے سمیریا میں بت پرستی شروع کر دی تو حضرت یوسفؑ کے دو بیٹوں کی آل اولاد بھی ان میں شامل تھی۔ اس پر قدرتی طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا حضرت یعقوبؑ نے اپنے دو بیٹوں کو جو ''برکت'' دی تھی وہ ان کی مزید آگے اولاد کے سلسلے میں اکارت چلی گئی۔ کیونکہ ان کے ورثا بعد کے برسوں میں بت پرست بن گئے تھے۔ یہودیوں کو ''امید'' تھی کہ بادشاہت یعقوبؑ کے سب سے بڑے بیٹے کے حصے میں آئے گی اور پیغمبری حضرت یوسفؑ کے جانشینوں میں رہے گی۔ لیکن جانشینانِ یوسف کے بچھڑے کی پوجا شروع کر دینے کی وجہ سے یہ ''امید'' اور یہ ''پیشگوئی'' غلط ثابت ہو گئی۔

یہودی علما کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ تاہم ہمارے مسیحی دوستوں نے حضرت عیسیٰؑ کے لیے اسی طرح ایک جعلی ''شجرہ نسب'' گھڑ لیا ہے جیسے انہوں نے ہر سال کرسمس ٹری کی جگہ ایک جعلی ''شجر صنوبر'' بنانے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ ''یوسف'' کے بیٹے تھے اور یوسفؑ، یعقوبؑ کے بیٹے تھے۔ (متی باب 1)۔ ان کی اس مکارانہ چال کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ کے سلسلۂ نسب کے بارے میں پیشگوئیوں کو اسی طرح سچی ہوتی دکھایا جائے جس طرح انہوں نے اس کو سمجھا۔ لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ پیشگوئیوں میں جس یوسف کا ذکر آتا ہے وہ یعقوبؑ کے بیٹے تھے۔

اور جس یوسف کو حضرت عیسیٰؑ کا باپ ٹھہرایا جاتا ہے وہ ناصرہ (Nazareth) کا ایک بڑھئی (نجار) تھا۔ کسی کا جعلی نسب نامہ تیار کرنا بہت آسان ہے لیکن غلط پارٹی پر پیشگوئیاں چسپاں کرنا بے حد مشکل ہے۔ انسانوں کو دھوکہ دینا ممکن ہے کہ خدا کو دھوکہ دینا کسی کے بس کی بات نہیں۔

4: آیئے اب یہ دیکھتے ہیں کہ اس پیشگوئی کے اصل معنی کیا ہیں؟ اس پیشگوئی میں جس افرائیم کا ذکر کیا گیا ہے وہ دراصل حضرت یوسفؑ کا بیٹا ہے لیکن یہاں مراد اولاد افرائیم ہے۔ یہ درست ہے کہ افرائیم کی نسب سے پیدا ہونے والے قبیلے نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی تھی' اس صورت میں اسے صنوبر کا پھلنا پھولنا نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس اصطلاح کے انجیلی مفہوم کے مطابق صرف راستباز لوگ جو خدائے واحد کی پرستش کرتے ہوں وہی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ تاہم نبی ہوسیع کے الفاظ یہ ہیں ''مجھے اب بتوں سے کیا کام''۔ یہ الفاظ دیگر ایک وقت آئے گا جب اولاد افرائیم بہ آواز بلند یہ اعلان کرے گی کہ آئندہ وہ بت پرستی سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے۔ یہاں معنی بالکل واضح ہیں کہ ایک وقت آئے گا جب وہ بت پرستی ترک کر کے خدائے واحد کی عبادت کریں گے۔ پھر وہ خوشحال ہو جائیں گے اور صنوبر کا درخت پھل دینے لگے گا۔

لہٰذا اولاد افرائیم کا بُت پرستی سے دستبردار ہونا' خدائے واحد کی پرستش کرنا اور اس کے بعد خوشحال اور تر و تازہ شجر صنوبر کا ظہور' ایسے واقعات ہیں جن کے بارے میں یہودیوں اور عیسائیوں کو ذرا توقف کر کے ان کے معنوں پر غور و فکر کرنا چاہیئے ،عہد نامۂ عتیق کے مطابق اسرائیل کے دس قبیلے جن کا مرکزی مقام سیریا تھا اور جنہوں نے بت پرستی شروع کر دی تھی اور جو بعد میں یہود کی تاریخ میں سے گم ہو گئے تھے' وہی تھے جن کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ ''میں بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کی طرف بھیجا گیا ہوں'' اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کا مشن بنیادی طور پر ان گمشدہ بھیڑوں کو اپنے اصل دائرے میں واپس لانے کا تھا۔ دوسری جانب تاریخی تحقیق نے اس سلسلہ میں بڑے عجیب حقائق اور واقعات کا انکشاف کیا ہے۔ ان میں ایک یہ ہے کہ یہ دس قبیلے جو تاریخ کے شدید استبداد سے گزرتے رہے ہیں' قسم قسم کے دھکے کھاتے ہوئے بالآخر افغانستان اور کشمیر میں پہنچ کر مستقل طور پر آباد

ہو گئے۔ اور زندگی کے اس موڑ پر آ کر ان کا مسلمانوں سے میل جول بڑھا جس کی وجہ سے وہ مسلمان ہو گئے۔

5: تاہم نبی ہوسیع نے افرائیم کے سلسلے میں کہا: ''دانشمند کون ہے کہ وہ یہ باتیں سمجھے اور دور اندیش کون ہے جو ان کو جانے؟ کیونکہ خدا کی راہیں سیدھی ہیں اور سچے لوگ ان پر چلیں گے لیکن غلط لوگ ان میں گر پڑیں گے''......(ہوسیع' باب 14' آیت 9) اس عبارت میں سے ہم ذیل کے نقاط پر غور کریں گے۔

(i) ایک وقت آئے گا جب افرائیم کہے گا کہ اسے بت پرستی سے کوئی سروکار نہیں۔ اور پھر وہ صرف حقیقی اور واحد خدا کی پرستش کرے گا۔

(ii) وہ کہے گا کہ وہ ایک پھلتے پھولتے اور سرسبز صنوبر کی مانند تھا جس نے ہر قسم کے بتوں کو مسترد کر دیا تھا' حتیٰ کہ یسوع مسیح کی پوجا بھی ترک کر دی تھی' جس پوجا کی مختلف شکلیں ان کے پیروکاروں کی بعد کی نسلوں نے متعارف کرا دی تھیں۔

(iii) وہ کہے گا کہ اس نے خدا کی آواز سنی ہے اور وہ صرف اسی کی اطاعت کرے گا۔ اس میں مضمر نقطہ یہ ہے کہ وہ مسیحی کلیسا میں مروّج رسموں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جو دراصل الوہیت مسیح اور الوہیت مریم کے گرد گھومتی ہیں۔

(iv) دانشمند وہی ہے جو ان چیزوں کو سمجھے: (الف) صنوبر (ب) شجرِ توحید دائماً سرسبز اور پھلدار ہے جس کی آبیاری او دیکھ بھال کے لیے یکے بعد دیگرے انبیاء آتے رہے اور جب بھی ضرورت پڑی خدا اپنی ہدایات دے کر انہیں مبعوث کرتا رہا۔

(v) عقلمند لوگ وہی ہیں جو صنوبر کے بارے میں اس سچائی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہوں کہ اس درخت کو پھل نہیں لگے گا کیونکہ خدا نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس درخت کے میوہ دار ہونے کا وقت گزر چکا ہے۔ اور یہ بات بھی جان لی جانی چاہئے کہ آئندہ درخت کی پرستش کار عبث ہوگی۔ درختوں کو صرف خدا میوہ دار بنا سکتا ہے اور وہی انہیں سرسبز رکھ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ احمق اور کوتاہ بیں لوگ مصنوعی درخت بنا بنا کر انہیں' کرسمس ٹری یا کچھ اور ناموں سے پکارتے رہیں۔ ایسے تمام

لوگوں کو صنوبر کے درخت سے سبق لینے کی دعوت دی گئی ہے اوران سے توقع کی گئی ہے کہ وہ اس پر غور وفکر کے بعد حقیقی اور واحد خدا کی عبادت کی طرف لوٹ آئیں گے۔

(vi) چونکہ خدا کے راستے ہی سچے اور درست ہیں' اس لیے پُر پیچ راستوں پر ایمان رکھنا کہ..... ''ایک میں تین اور تین میں ایک'' یا ''کوئی شخص سب کے گناہ اپنے سر لے سکتا ہے اوران کی خاطر خود کو میخوں سے صلیب میں ٹھکوا سکتا ہے'' خدا کے سیدھے راستے سے بہت دُور کی سوچ ہے۔ سیدھا راستہ صرف ایک ہے' یعنی ''جو بوئے گا وہی کاٹنا پڑے گا'' والا راستہ۔

(vii) اچھے لوگ بالآخر وہی راستہ اختیار کریں گے جس پر افرائیم' اوراس کی آل اولاد چلی تھی۔ افرائیم نے پیشگوئی بھی کی تھی کہ سمجھدار لوگ بالآخر صحیح راستے پر آجائیں گے۔ اچھے کاموں کے اچھے نتائج نکلتے ہیں اور صحتمند درخت کا پھل صحت بخش ہوتا ہے۔ جولوگ سیدھی راہ سے بھٹک جاتے ہیں وہ گمراہ کہلاتے ہیں اور خدا کے غضب کے مستحق بن جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو سب ضالین کے ساتھ ہونے والا ہے۔

(viii) ان حقائق کو پیش رکھتے ہوئے جو پیغمبر ہوسیع نے بہت اچھی طرح بیان کیے (یعنی بت پرست اسرائیلیوں کے ساتھ خدا کا انصاف' یا خود حضرت عیسیٰ کی پرستش کرنے والوں کے ساتھ خدا کا انصاف اور صرف حق پرستوں کی نجات) اوراس بات کو بھی سامنے رکھتے ہوئے کہ حضرت یعقوب نے یوسف کے چھوٹے بیٹے افرائیم کو برکت دی' نہ کہ سب سے بڑی عمر والے منسّی کو دی۔ کیونکہ خدا کے ہاں ترجیح اعمال کو ملتی ہے نہ کہ عمر کو حاصل ہوتی ہے۔ اب قرآن کی اس آیت پر غور کیجیے: اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْقَالَ لِبَنِيْهِ مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحَاقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ اس دنیا سے رخصت ہورہا تھا۔ اس نے مرتے وقت

اپنے بیٹوں سے پوچھا: ''بچو! میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے''؟ ان سب نے جواب دیا: ''ہم سب اسی ایک خدا کی بندگی کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیمؑ اسماعیلؑ اور اسحاقؑ نے خدا مانا ہے اور ہم اسی کے مسلم ہیں.....سورۃ البقرۃ آیت 133)

ہمیں یہاں یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنی چاہیے کہ یعقوبؑ' اسحاقؑ اور ابراہیمؑ کے حوالے میں حضرت اسماعیلؑ بھی شامل ہیں' جو یوسفؑ اور افرائیم کے آباؤ اجداد ہیں۔ اور ان کے اختتامی اعلان میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ انبیاء اپنے عقیدے کو حضرت یعقوبؑ' اسحاقؑ اور ابراہیمؑ کے طریقوں تک محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی تعلیمات پر بھی عقیدہ رکھتے تھے اور نبی آخر الزمان حضرت محمدؐ پر بھی ایمان رکھتے تھے جنہوں نے اپنے قبل کے تمام پیغمبروں اور نبیوں کی پیش کردہ سچائیوں کی تصدیق اور توثیق کی ہے۔

(ix) اس غیر معمولی پیشگوئی کی تصدیق چار عظیم پیغمبروں نے کی ہے۔ شروع میں ہم اسے حضرت یعقوبؑ کے لفظوں میں مضمر پاتے ہیں جو حضرت عیسیٰؑ سے ایک ہزار سات برس (1007) پہلے مبعوث ہوئے تھے۔ اور انہوں نے حضرت یوسفؑ کے دو بیٹوں کو برکت دیتے ہوئے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ صرف ایک اور سچے خدا کی عبادت کریں گے۔ پھر ہم یہ پاتے ہیں کہ اس پیشگوئی کا اعادہ حضرت موسیٰؑ نے کیا جو حضرت عیسیٰؑ سے تقریباً چار سو (400) سال پہلے آئے تھے۔ (استثنا 13:33' 17) ان کے 800 سال بعد پیغمبر ہوسیع نے اسے دوہرایا اور اس کی توثیق کی۔ پھر ان کے تقریباً سات سو سال بعد یہ اس وقت پوری ہوئی جب افغانستان اور کشمیر کے خطوں میں آباد لوگوں نے اپنے پہلے عقائد' ترک کر کے بتدریج یا یکبارگی اسلام قبول کر لیا۔ باقیماندہ بت پرست جو تقریباً دو ہزار سال سے بتوں کی پوجا کر رہے تھے وہ بھی اپنے آباؤ اجداد حضرت ابراہیمؑ' اسماعیلؑ' اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے عقیدے پر آ گئے اس طرح انہوں نے تقریباً تین ہزار سال

قبل کی گئی حضرت ابراہیم کی پیشگوئی کو پورا کر دیا۔ اب کون اس اہم ترین پیشگوئی کی تردید کرنے کی جرأت کرے گا جس کی چار گنا توثیق ہو چکی ہے اور انتہائی مضبوط دلائل اور براہین کے ساتھ اس کی تکمیل کا ثبوت مل چکا ہے۔ اب اسرائیل کے گمشدہ قبیلوں کی اولاد جو اس وقت ایران افغانستان اور کشمیر میں آباد ہیں خود ساختہ بتوں کی نہیں بلکہ خدائے واحد کی عبادت کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ اس مذہب کے حلقہ بگوش ہوئے ہیں جس کی ہزاروں سال پہلے پیشگوئی کی گئی تھی۔ افرائیم نے اپنی پیشگوئی میں جو الفاظ استعمال کئے تھے آج ان سے ہم وہی سن رہے ہیں ''ہمیں اب بتوں سے کیا کام''؟ اور ''خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں''۔

اور 2 سموئیل کے باب 6' آیت 5 میں جو الفاظ آتے ہیں ''اور داؤد اور اسرائیل کا سارا گھرانہ صنوبر کے درخت سے بنے ہوئے سب اقسام کے ساز اور ستار' بربط' دف' حنجری اور جھانجھ خداوند کے آگے آگے بجاتے چلے۔'' اس میں صنوبر کے درخت کا ذکر' خدا کی وحدانیت پر ایمان کے اظہار اور ہر قسم کا شرک ترک کرنے کے اعلان کے طور پر آیا ہے داؤدؑ کا ہر قسم کے سازوں کے ساتھ گانے کا مطلب اس خدا کی تعریف اور حمد کرنا ہے جس نے انہیں فلسطینیوں پر فتح عطا کی تھی اور گانے سے مراد کا اس بات پر بھی شکر ادا کرنا تھا کہ ''اس نے سب اسرائیلی مردوں اور عورتوں کو ایک ایک روٹی اور ایک ایک گوشت کا ٹکڑا عطا کیا تھا''......(''1۔تواریخ'' باب 16' آیت 3)

عہد نامہ عتیق میں حضرت داؤد کو ایک خصوصی اہمیت حاصل ہے کیونکہ وہ اسرائیل کے پہلے پیغمبر بھی تھے اور ایک بادشاہ کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ لیکن خدا نے ان کے ساتھ جو وعدے کئے تھے' ان کی زندگی کے دوران وہ سب پورے نہیں ہوئے جس کی بنا پر یہودی ان کی ''دوسری آمد'' کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ وعدے ان کی ''دوسری آمد'' کے دوران پورے ہو جائیں گے۔ (اس نقطے کو سمجھنے کے لئے......''حضرت محمدؐ کے بارے میں حضرت داؤدؑ کی مناجات'' پر غور کیجئے لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ اگر ایلیاہ (ELIAS) کی

"دوسری آمد" یوحنا (JOHN) کی آمد سے پوری ہو چکی ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا (متّی 14:11) تو حضرت داوٗد کی "دوسری آمد" یقیناً حضرت محمدؐ کی آمد کے ساتھ پوری ہونا سمجھی جاسکتی ہے۔ حضرت محمدؐ ' حضرت داوٗدؑ کی طرح ہی دنیاوی حکمران بھی تھے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت داوٗد کو تاجِ بادشاہت بطور وراثت نہیں ملا تھا' حضرت محمدؐ کے سلسلہ میں بھی ایسا ہی تھا۔ کہ وہ بھی اس ملک کے حکمران بنے جو حضرت داوٗد نے اپنے زمانے میں فتح کیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے حضرت داوٗدؑ کی نسل میں سے ہونے کی بنا پر بادشاہت کا دعویٰ کیا تھا جو ان کی زندگی میں پورا نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے حضرت محمدؐ اہل دنیا سے خدا کی وحدانیت منوانے کے لیے جتنی مساعی بروئے کار لائے وہ حضرت داوٗد کی مساعی سے کہیں زیادہ تھیں' لہٰذا حضرت محمدؐ ہی صنوبر کا وہ شاندار درخت ہیں جس کی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں۔

لق لق کا گھر:

حضرت داوٗد نے خدا کی حمد کے جو اشعار گائے منتہائے کمال کے ہیں۔ (ملاحظہ کیجئے۔ زبور 104) ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا دل خدا سے محبت سے کتنا معمور تھا۔ وہ اپنے گردوپیش میں خدا ہی کو پاتے تھے۔ تاہم یہاں ہم ان کے حمدیہ کلام کے چند مصرعے نقل کرنے پر ہی اکتفا کریں گے

"خداوند کے درخت سرسبز و شاداب رہتے ہیں
یعنی لبنان کے دیودار جو اس نے لگائے
جہاں پرندے اپنے گھونسلے بنا لیتے ہیں
صنوبر کے درختوں میں لق لق کا بسیرا ہے"

......زبور۔ 16:104' 17

بہ الفاظ دیگر ہر چیز خدا کی عظمتوں کے گیت گاتی ہے اور اس کی گوناگون صفات بیان کرنے میں رطب اللسان رہتی ہے۔ لبنان کی دیودار کو دیکھئے کہ وہ کس طرح چٹانوں اور پتھریلی زمینوں میں اگتی ہے اور کس شان سے نشوونما پاتی ہے۔ پھر بھی اپنا سر انسانوں کی

خدمت کے لیے جھکائے رکھتی ہے۔اس کی جڑیں پتھروں کے اندر جمی ہوتی ہیں اور پرندے اس کی شاخوں میں اپنے آشیانے بنا لیتے ہیں۔خوشنما پرندہ لق لق جسے خدا نے چمکیلے بال و پر عطا کیے ہیں' سیلانی مزاج کا حامل ہے اور موسموں کا گہرا شعور رکھتا ہے۔اور اسی کی بنا پر مختلف سمتوں میں اپنے سفر کا تعین کرتا ہے۔چنانچہ پیغمبر یرمیاہ کہتے ہیں:''ہاں ہوائی لق لق اپنے مقررہ وقتوں کو جانتا ہے اور قمری اور ابابیل اور کلنگ اپنے آنے کا وقت پہچان لیتے ہیں۔لیکن میرے لوگ خداوند کے احکامات کو نہیں پہچانتے'' (یرمیاہ 7:8)۔یہاں یرمیاہ نے اسرائیل کو تاریخ فطرت کے اہم نکات سمجھائے جن کی سوچ سمجھ عام پرندوں سے بھی گئی گزری تھی جبکہ پرندے وقت اور آب و ہوا میں تبدیلی کی نشانیوں کو سمجھنے کے بہتر شعور کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طرح انسان اور پرندوں میں ایک نمایاں اور تکلیف دہ تضاد سامنے آتا ہے۔انسان اس بات کا کوئی احساس نہیں رکھتے کہ جب کرسمس آتا ہے تو درخت مرجھا جاتے ہیں اور تمام سبزہ معدوم ہو جاتا ہے۔یورپی ممالک میں کرسمس منانے کی تیاریاں وقت سے دو ماہ پہلے شروع ہو جاتی ہیں تقریباً اسی وقت درختوں کے پتے جھڑنے لگتے ہیں۔اور جب کرسمس منایا جا رہا ہوتا ہے تو کڑاکے کی سردیاں پڑ رہی ہوتی ہیں اور کہرا سبزے کو جلا کر خاکستری کر دیتا ہے۔لق لق سردیوں میں وہاں نہیں ٹھہرتا بلکہ اڑ کر ہزاروں میل دور جنوبی افریقہ میں پہنچ چکا ہوتا ہے۔یہ لق لق کے بارے میں پہلا نقطہ ہے جسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جانا چاہیے۔اس سلسلے میں بچوں کی کتابوں میں پڑھتے ہیں۔''جب موسم بہار آتا ہے تو بچے آسمان کی طرف سے بڑے بڑے پروں کو اترتے ہوئے دیکھتے ہیں تو یورپ کی بیس زبانوں میں چلاتے ہوئے کہتے ہیں' وہ دیکھو لق لق واپس آ گئے ہیں'' (ریڈرز ڈائجسٹ)......آرٹیکل ''سٹارک''۔شمارہ فروری 1952)

عبرانی زبان کی انجیل میں لق لق کو 'ہسیدہ' کہتے ہیں جس کے لغوی اور بنیادی معنی ہوتے ''مقدس اور مہربان''۔اس پرندے کی خصوصیات کے بارے میں ایک مصنف لکھتا ہے کہ لق لق کو اپنے بچوں سے بہت محبت ہوتی ہے اور وہ انہیں کسی قیمت پر نقصان نہیں پہنچنے دیتا۔چند سال پہلے ڈنمارک میں ایک گھاس پھوس کی چھت والے مکان' کو آگ لگ گئی۔اس میں ایک لق لق کا آشیانہ بھی بنا ہوا تھا۔مادہ لق لق چاہتی تو اڑ کر اپنی جان بچا سکتی تھی مگر اس

نے اپنے بچوں کو مصیبت چھوڑنا پسند نہ کیا اور انہیں اپنے پروں تلے دبائے بیٹھی رہی۔ جب شعلے قریب آئے تو اس نے دھوئیں سے بچوں کا دم گھٹنے سے بچانے کے لیے پروں کو زور زور سے ہلانا اور پھڑ پھڑانا شروع کر دیا' اور جب آگ بجھا دی گئی تو وہ دھوئیں سے بالکل سیاہ ہو چکی تھی مگر اس نے بچوں کو مرنے سے بچا لیا تھا (ریڈرز ڈائجسٹ دسمبر 1952)

اس پرندے کے لیے عربی زبان کے لفظ "لق لق" کے معنی ذہانت اور حساسیت کے ہیں اس کا دیار اور صنوبر کے درختوں پر اپنا گھونسلہ بنانا' ذہانت کا زبردست مظاہرہ ہے کیونکہ یہ درخت توحید باری تعالیٰ کی علامت ہے۔ انجیل یرمیاہ نے بھی اسے ذہین اور حساس پرندہ قرار دیا ہے اس لیے کہ وہ موسموں کے تغیر و تبدل اور ایک خطے سے دوسرے خطے میں منتقل ہونے کے لیے بالکل صحیح وقت کا انتخاب کرتا ہے۔ جس طرح وہ موسم بہار کا آغاز ہوتے ہی یورپ پہنچ جاتا ہے' اسی طرح جوں جوں سردیاں آتی رہتی ہیں وہ ان علاقوں میں پہنچتا رہتا ہے جن میں موسم بہار شروع ہو رہا ہوتا ہے۔ ماہ ستمبر میں جب شمالی خطے سخت سردیوں کی لپیٹ میں آنے والے ہوتے ہیں' موسم بہار جنوبی خطوں کی دہلیز پر پہنچ رہا ہوتا ہے اور گرمیاں کافی قریب آنے والی ہوتی ہیں۔ جیسا قرآن میں سورۃ قریش میں ہم پڑھتے ہیں کہ "قریش کو سردیوں اور گرمیوں کے سفر میں تحفظ دینے کے لیے....." لق لق موسم بہار کی تلاش میں نہایت صحیح حساب کتاب کے ساتھ شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کا سفر جاری رکھتا ہے۔ یورپی پریس اس کی نقل مکانی سے بڑی اچھی طرح باخبر رہتا ہے۔ اس کی ساری خصوصیات پر یہاں روشنی ڈالنا ممکن نہیں' یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ یورپ اور افریقہ میں اسے موسم بہار شروع ہونے کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ صنوبر اور دیودار کے درختوں پر آشیانہ بنانا سخت موسم سے خوشگوار موسم کی آمد کی علامت ہوتی ہے۔ "مناجات زبور" اور "اقوال ہوسیع" کے حوالہ سے یہ بتایا جا چکا ہے کہ دیودار اور صنوبر کے درخت خداوند تعالیٰ کی وحدانیت کے مظہر ہیں' لق لق کا ان کی شاخوں پر آ کر بسیرا کرنا اس موسم بہار کی یاد دلاتا ہے جب نبی اکرمؐ کی دنیا میں آمد ہوئی' بت پرستی کا خاتمہ ہوا اور خدائے واحد کی پرستش شروع ہوئی تھی۔

ہر سال اس پرندے کی آمد اس خطے کے لوگوں کے لیے خوشی کا اعادہ ہوتی ہے۔ دوسری طرف جونہی لوگ کرسمس کی آمد کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں تو لق لق وہاں سے دور

چلا جاتا ہے اور چھ فٹ لمبے اور چار فٹ چوڑے گھر کو خیر باد کہہ دیتا ہے یعنی نبی اکرمؐ کی پیدائش کی خوشی منانے کے لیے اس موسم کی تلاش میں شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کی طرف ہزاروں میل کا سفر کرتا ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس پرندے کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام ذہین لوگ اس موسم کے آغاز میں آنحضرتؐ کی آمد کو یاد کرتے ہیں جیسا کہ نغماتِ ہوسیع اور مناجاتِ زبور میں آتا ہے۔ (ہوسیع 8:14؛ زبور 16:104، 17)۔

دیگر نقاط کی طرف جانے سے پہلے آیئے ہم صنوبر و دیودار کے درختوں اور ان پر لق لق کا بسیرا کرنے کی تمثیلات کی اہمیت پر روشنی ڈالتے چلیں۔

(1) سردیوں میں صنوبر اور دیودار کے صحتمند درخت، ان کی خوشبو، ان کی سرسبز شاخوں کا پھیلاؤ اور ان کی بلند قامتی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی، محسوس ہوتی ہے۔

(2) اس کے برعکس، عیسائیوں کے مصنوعی کرسمس ٹری، جو مختلف جگہوں پر بنائے جاتے ہیں، محض بے کیفی اور اداسی پھیلانے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ کسی بھی زاویئے سے صنوبر اور دیودار کے خوشنما درختوں کی ہمسری نہیں کر سکتے۔

(3) حضرت داؤدؑ اور ان کے سارے خاندان کا، خداوند تعالیٰ کی حمد ایسے سازوں کی سنگت میں گانا، جو کہ صنوبر اور دیودار کی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں، اس کا اصل راز کیا ہے؟

(4) یوسفؑ کی نسل کے بارے میں حضرت یعقوبؑ کی دعائیں، موسیٰؑ کے اقوال اور توقعات اور ہوسیع کی پیشگوئیاں...... کیا نتیجہ خیز رہیں؟ یعنی کیا وہ دعائیں اور توقعات پوری ہوگئیں اور سب پیشگوئیاں درست ثابت ہوئیں؟

(5) افرائیم کی اولاد نے دنیا کے کس خطے میں بت پرستی ترک کرنے اور صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کا اعلان کیا تھا جس کے بعد وہ صنوبر اور دیودار کے سرسبز اور قائم و دائم درخت بن گئے؟

(6) اسرائیل کے دس گمشدہ قبیلوں کی تلاش کے سلسلے میں تاریخی ریسرچ۔

(7) یسوع مسیح کے یوسفؑ بن یعقوب کا بیٹا ہونے کے دعوے کی تردید اور اس

نظریے سے دستبرداری۔

(8) یسوع مسیح سے یہ قول منسوب کرنا کہ ''میرے آنے کا مقصد بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش کے سوا کچھ نہیں'' (متی 24:15؛ 6:10) اور ان کا یہ کہنا کہ ان کی کچھ اور بھیڑیں بھی ہیں جو فی الحال ان کے پاس نہیں ہیں اور وہ جلد از جلد انہیں تلاش کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ آ کر ان کی بات سنیں (یوحنا 16:10)۔ حضرت عیسیٰؑ ان کی تلاش کے لیے کب روانہ ہوئے اور وہ انہیں کہاں سے ملیں۔

(9) اولاد افرائیم نے بت پرستی ترک کرنا کہاں سے سیکھا اور انہوں نے یہ غلط رواج کیسے ترک کیا؟

(10) بتوں کی پوجا اور حضرت عیسیٰؑ کی پرستش خواہ وہ کسی شکل میں ہو' دراصل ایک ہی چیز ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چرچ میں حضرت عیسیٰؑ کی شبیہہ بنا کر رکھنا' ان کی پرستش ہی کے مترادف ہے۔ اولاد افرائیم کو ایسی رسمیں ختم کرانے کے لیے آگے بڑھنا چاہئے تھا جیسا کہ اس کی پیشگوئی کی گئی تھی۔

11: حضرت یعقوبؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے پیشگوئی کی تھی کہ اولادِ افرائیم ایک نہ ایک دن بت پرستی ترک کر کے صرف خدائے واحد کی عبادت کرنے لگے گی پھر' قرآن نے تقریباً چھ سو سال قبل اس کا اعادہ کیا تھا اور اس سے پہلے پہلے افغانستان اور کشمیر کے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے۔

12: اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ سے جو وعدہ کیا تھا' وہ حضرت محمدؐ کی بعثت سے پورا ہو چکا ہے۔

13: یرمیاہ کا یہ کہنا لق لق موسموں کی تبدیلیوں کے آثار سمجھ لیتا ہے لیکن ان کے پیروکار خدا کے فیصلے کی اہمیت سمجھنے سے قاصر رہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا چاہئے کہ آج جیسے حالات کی موجودگی میں وہ پیشگوئی کیسے پوری ہوگئی؟

14: یورپی ممالک کے بچے موسم بہار کی آمد اور اپنے علاقوں میں لق لق کے پروں کے پرے آتے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ ان ملکوں کے لوگوں کو یہ

بات سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ حقیقی لق لق وہ ہیں جو خدا کا پیغام لے کر ان کے ہاں آتی ہیں وہ اسلامی مبلغین اور جماعتیں ہیں۔ اگر لق لق کا مطلب ''شفقت' نرمی اور بردباری'' ہے تو یہ اشارہ پیغمبر اسلام کی طرف ہے جو رحمتہ اللعالمین تھے۔ اور اگر اس کا مطلب ''ذہانت اور حساسیت'' ہے تو یہ ولادت حضرت محمد کی جانب اشارہ ہے جو ماہ ربیع الاول میں' اور آغاز موسم بہار میں تشریف آور ہوئے تھے۔

سیب کا درخت:

خوش ذائقہ و خوش بُو دار اور لذیذ و خوشنما اور مقوی پھل' جسے باغ عدن کا بہترین پھل کہا جاتا ہے' سیب ہے۔ عربی' عبرانی' آرمینائی اور دیگر متعلقہ زبانوں میں اسے ''تفاح'' کہتے ہیں۔ اینگلوسیکسن' تورانی' کلٹی (CELTIC)' لیتھونین' انگلش' ڈچ اور دیگر یورپی زبانوں میں اسے ''ایپل'' اور ''ایپلا'' کہا جاتا ہے۔ ان زبانوں میں یہ نام کیسے داخل ہوا؟ اس کا کسی کو علم نہیں۔ جہاں تک سامی (SEMITIC) زبانوں میں اس کے لیے ''تفاح'' کے لفظ کا تعلق ہے' اس کے بارے میں مستشرقین کئی آراء رکھتے ہیں۔ لیکن اس لفظ کے معنوں میں جو مفہوم پایا جاتا ہے' اس پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ یہ کھانے میں بڑا لذیذ' دیکھنے میں بڑا عمدہ اور قوتِ نشوونما سے بھرپور ہے۔ اس کے حوالہ سے مردوں کے گلے کے سامنے والے حصے پر ابھار یا کلنٹھ کے لیے ''Adam's Apple'' کسی کی آنکھ کا تارا ہونے کے لیے ''Apple of the eye'' اور بدباطن خطا کاروں کا پسندیدہ ہونے کے لیے ''Apple of sodom'' کی تراکیب وضع ہو چکی ہیں۔ عہد نامۂ عتیق میں سیب کا نام تو واضح طور پر نہیں لیا گیا مگر اس کی طرف ''اچھا پھل'' ''لذیذ پھل'' ''خوشنما پھل'' ''صحت کے لیے مفید پھل'' اور ''قوت بھرا پھل'' کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے۔ شارحین نے ان تعریفوں کو پیش نظر رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اتنی خوبیوں کا حامل تو سیب ہی ہو سکتا ہے۔

ریورنڈ رابرٹ بَر (Robert Berr) لکھتا ہے کہ سیبوں کی اصل سرزمین' عرب کا ''باغِ عدن'' تھا۔ عربی زبان میں سیب کے ذائقے اس کی افادیت اور ذائقے اس کی قوت غذائیت وغیرہ سے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک دیوی نے

نئے سرے سے جوان ہونے کے لیے ایک خاص قسم کا سیب کھانا شروع کر دیا تھا۔ یورپ کے بعض ملکوں میں ایسٹر سنڈے کی صبح کو ایک خاص تقریب منعقد کرتے ہیں۔ جس میں مدعوئین کو صرف سیب اور اس کی مختلف قسم کی ڈشیں پیش کی جاتی ہیں۔

عہد نامۂ عتیق میں باغ عدن کی جو کہانی بیان کی گئی ہے' اس میں سیب کا اگرچہ نام نہیں لیا گیا مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں ''لیڈیز اون چائس'' کے الفاظ کس کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ ''حوا کی پسند'' اور یہ خوبی کہ یہ پھل بہت لذیذ' بہت خوشنما' بہت قوت بخش اور غذائیت سے بھرپور ہے' اس سے عہد نامہ کے تمام قارئین آگاہ ہیں۔ جانوروں میں مکار ترین جانور ناگن کو سمجھا جاتا ہے اس نے اس پھل کو استعمال کرتے ہوئے حوا کے ذریعے آدمؑ کی آزمائش کو مزید سخت کرنے کے لیے اس پھل کا پودا باغ عدن کے عین وسط میں اگا دیا تھا۔ ''پھل آدم اور حوا' دونوں نے کھایا' جس سے دونوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہیں شیطان نے باور کرایا تھا اگر وہ اسے کھائیں گے تو نیک و بد کے بارے میں خدا کی مانند سب کچھ جاننے والے بن جائیں گے'' (کتاب پیدائش 3:3......7)

یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتابوں میں اس کے بارے میں بعض بڑی تشویش انگیز باتیں بھی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ آدم اور حوا نے بہشت میں یہ ممنوعہ پھل کھایا جس کی وجہ سے وہ نافرمانی کے مرتکب ہوئے اور خدا نے سزا کے طور پر انہیں وہاں سے باہر نکال دیا۔ بہ الفاظ دیگر آدم اور حوا کی نافرمانی کی وجہ سے بنی نوع انسان کو اونچے آسمانوں سے نیچے زمین پر پھینک دیا گیا تاکہ یہاں ذلت اور رسوائی کی زندگی گزارتے ہوئے مر جائے۔ اور اب نجات کا واحد راست یسوع مسیحؑ کی ''کفارے کی قربانی'' پر ایمان لانا ہے۔

اگر کوئی شخص خیالی پلاؤ کھانے اور اندھے عقیدے اپنانے کا عادی بن جائے تو وہ جو چاہے سمجھ سکتا ہے۔ لیکن ایک ذہین شخص کو درج ذیل نقاط دعوتِ فکر دیتے ہیں:۔

(i) کیا انسان کے اندر خیر اور شر میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہونا' ایک پسندیدہ اور مفید بات ہے یا نقصان دہ اور ناپسندیدہ چیز ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ انسان میں لازماً عقل ہونی چاہئے' جس میں یہ صلاحیت بھی شامل ہے کہ وہ اچھے اور برے میں تمیز کر سکتا ہو۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو آدمؑ اور حوا نے اپنے اندر اچھائی اور برائی

میں فرق کر سکنے کی اہلیت پیدا کر کے خدا کا کیا بگاڑا تھا؟

(ii) نیک اور بد میں امتیاز کرنا خود خدا کی صفات میں سے بھی ہے۔ اگر آدمؑ ایک سیب کھا کر اس معاملے میں خدا کی مانند ہو گئے تو پھر سیب کھا لینا کوئی بری بات نہیں تھی۔ اس اہم واقعہ پر تو آسمان میں جشن منعقد ہونا چاہئے تھا کہ محض آدھے سیب نے بندے کو مماثلِ خدا بنا دیا۔ پھر سمجھ نہیں آتی کہ اس سے آخر خدا کو کون سا نقصان پہنچا تھا کہ اس نے اس پر اتنا غصہ منایا؟

(iii) اس سے ذہن میں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے' وہ یہ کہ آدمؑ حوّا کا دیا ہوا آدھا سیب کھانے سے خدا کی مانند ہو گئے۔ لیکن انہوں نے اپنی زوجہ کے کہنے پر' جو اس کا نصف حصہ خود کھا چکی تھی' باقی نصف کھا لیا۔ اب حیرت بلکہ مایوسی کی بات یہ ہے کہ اس قابلِ تحسین اقدام سے اس خاتون کو تو پوری انسانی تاریخ میں کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس کا بھی دیویوں میں شمار ہوتا۔ مگر ہوا یہ کہ اس کے بعد زچگی کی تکلیف اٹھانا عورت ہی کا مقدر بن گیا۔ اگر ممنوعہ پھل میں یہ خوبی تھی کہ اسے کھانے والوں میں عقل و دانائی پیدا ہو جاتی تھی تو حوّا کو بھی اس کے کھانے سے فائدہ پہنچنا چاہئے تھا۔ بلکہ آدمؑ کی بہ نسبت اسے زیادہ فائدہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کے مندرجات میں کوئی سقم رہ گیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ حوا نے آدمؑ سے پہلے آدھا سیب کھا لیا مگر اس سے اُسے اتنا فائدہ نہ پہنچا جتنا اس کے شوہر کو پہنچ گیا۔ آدم کو بہلا پھسلا کر باقی آدھا سیب کھلانے والی تو وہی تھی۔ اس کے نتائج خواہ کچھ بھی تھے وہ اتنی ہی قوت سے حوّا کے حصے میں بھی آنی چاہیئے تھی۔

(iv) سچی بات تو یہ ہے کہ ان روایات کے مطابق غلطی تو خدا کی تھی جس نے ممنوعہ پھل باغ عدن کے عین وسط میں اگا دیا اور اسے اتنی اہم پوزیشن دیدی۔ اس سے بھی زیادہ برا یہ ہوا کہ اس پھل کو اتنا پرکشش بنا دیا گیا اور ایسی حیرت انگیز صفات سے متصف کر دیا گیا کہ آدمؑ اور حوّا لالچ میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ تو بالکل فطری امر تھا' انہوں نے اپنی حقیقی فطرت سے کوئی تجاوز نہیں کیا' اس پر انہیں اتنی کڑی سزا

دیئے جانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اگر حوّا اتنے لذیذ پھل کو دیکھ کر اس کی طرف رغبت کا مقابلہ نہیں کر سکی تو یہ اس کا کوئی خاص قصور نہیں تھا۔ لیکن آدمؑ کو کیا ہوا کہ وہ اسے کھانے پر رضامند ہو گئے اور اس طرح نافرمانیٔ ربّ کے مرتکب ہو گئے۔

یہاں انجیل مردانہ تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے اور یہ موقف اختیار کرتی ہے کہ آدمؑ ترغیب میں نہیں آئے بلکہ حوّا ترغیب کا شکار ہو کر گناہ میں ملوث ہوئی تھی۔

(v) آدمؑ اور حوّا کے ممنوعہ پھل کھا لینے کے بعد خدا نے آئندہ اس کی حفاظت کے لیے سخت پہرہ لگا دیا لیکن اس نے شروع ہی سے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اگر وہ ایسا کر دیتا تو انسان اس گناہ سے ہمیشہ اور مکمل طور پر محفوظ رہتا۔

(vi) سیب دنیا میں بہ افراط پائے جاتے ہیں۔ آدمؑ اور حوّا کی آنکھیں صرف آدھا آدھا سیب کھا لینے سے کھل گئیں۔ لیکن ایسا کیوں ہے کہ عیسائیوں کے مذہبی رہنماؤں اور عام لوگوں کی آنکھیں دنیا کے مختلف حصوں کے بہترین پھل کھا لینے کے بعد بھی 'افسوسناک طریقے سے بند رہتی ہیں؟

(vii) نیکی و گناہ اور اچھائی و برائی میں فرق سمجھ سکنے کی طاقت خدائی اوصاف میں سے ایک وصف ہے جسے عقلمندی یا دانائی کہا جاتا ہے' یہ اگر بندوں میں بھی پیدا ہو جائے تو یہ کوئی بری چیز نہیں ہے' جہاں تک آدمؑ کا تعلق ہے اگر وہ ''خداؤں'' میں سے ایک ''خدا'' بن گیا تو محض اپنی کوشش سے نہیں بنا' کیونکہ یہ ایک سیب کھا لینے کا نتیجہ تھا' یعنی ......اس فعل کا ایک نتیجہ تھا۔ اگر اس نے ایک سیب کھانے کے بعد ''خدائی'' کا دعویٰ کر دیا تو اسے اس کا گناہ نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ کیونکہ اس کا ''خداؤں'' میں سے ایک ہونا اس کی ترقی کی طرف ایک قدم تھا' نہ کہ تنزل کی طرف......آخر یہ انجیل ہی میں تو آتا ہے: ''اور خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور ''حیات کے درخت'' میں سے بھی کچھ لے کر کھا لے اور ہمیشہ جیتا رہے' اس لیے خداوند خدا نے اس کو باغ عدن سے باہر کر دیا''

(کتاب پیدائش باب 22:3، 23)۔ یہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعتراف ہے کہ آدمؑ خداؤں میں سے ایک بن گیا ہے تو پھر اسے سیب کا ایک معجزہ ہی قرار دینا پڑے گا۔

(viii) خداوند خدا نے آدم سے کہا کہ اگر اس نے یہ ممنوعہ سیب کھایا تو وہ مر جائے گا۔ لیکن شیطان نے حوا سے کہا کہ اس نے اور آدمؑ نے یہ پھل کھایا تو وہ دونوں کبھی بھی نہیں مریں گے۔ ان دو باتوں میں سے صحیح وہی نکلی جو شیطان نے کہی تھی کیونکہ سیب کھانے کے بعد نہ آدم مرے اور نہ حوا مریں۔ اور الٹا یہ ہوا کہ اس کے بعد آدم 930 سال تک زندہ رہے۔

(IX) آدھا سیب کھانے سے آدم 930 سال جیتے رہے۔ اور حکما بھی اسی بات کی تصدیق کرتے ہیں جو شیطان نے کہی تھی کہ سیب صحت اور توانائی کا منبع ہے۔ طبی پیشے سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص یہ کہنے کے لیے تیار نہیں کہ کوئی شخص سیب کھانے سے مر جاتا ہے۔

(X) لیکن شیطان سے ایک غلطی سرزد ہوگئی اور وہ یہ کہ اس نے شروع میں حوا سے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ وہ ''حیات کے درخت'' کا پھل کھالے جس کے بعد وہ میاں بیوی آئندہ کبھی بھی نہ مرتے خواہ خدا انہیں مارنے کا ارادہ بھی کر لیتا۔ سیب نے آدم کو ''ہمہ دان'' بنا دیا اس طرح وہ خداؤں میں سے ایک خدا بن گیا۔ بالکل اسی طرح اگر شیطان نے یہ غلطی نہ کی ہوتی یعنی وہ ان میاں بیوی کو دونوں پھل بیک وقت کھلا دینا بھول نہ گیا ہوتا تو خداوند اس پوزیشن میں ہی نہ رہتا کہ وہ ان دونوں کو نقصان پہنچا سکتا۔ پھر آدمؑ اور حوا دونوں خدا بن جاتے' ہمہ دان اور تا ابد زندہ رہنے والے ہوتے۔ اور چونکہ کائنات قائم ہے اور وہ دونوں درخت اسی طرح باغ بہشت میں موجود ہیں اور کوئی ایسا کام نہیں دکھا رہے ہیں جسے دیکھا جا سکتا' شاید وہ آہستہ آہستہ سوکھ کر مریں گے۔

(XI) اس ساری کہانی کا مضحکہ خیز ترین پہلو یہ دکھایا گیا ہے کہ انسان کو ذہانت بخشنا' اسے اچھے اور برے میں تمیز کر سکنے کی صلاحیت سے نوازنا اور اسے زندگی عطا

کرنا خداوند کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے کیونکہ یہ انجیل میں آیا ہوا ہے: ''اور خداوند خدا نے کہا' دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور ''حیات کے درخت'' میں سے کچھ بھی لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لیے خداوند خدا نے اس کو باغ عدن سے باہر کر دیا تاکہ وہ اس زمین میں کھیتی باڑی کرے جس میں سے اسے لیا گیا تھا۔ چنانچہ اس نے آدم کو نکال دیا اور باغ عدن کے مشرق کی طرف کروبیوں کو مقرر کر دیا اور چاروں طرف گھومنے والی شعلہ خیز تلوار رکھ دی تاکہ وہ زندگی کے درخت کی طرف جانے والے راستے کی حفاظت کریں''...... (کتاب پیدائش باب 3' آیات 22 تا 24)

یہ کتنی بے ہودہ بات ہے کہ آدم محض آدھا سیب کھا لینے سے خدا کی مانند ہو گیا' پھر خدا کو تشویش لاحق ہو گئی کہ کہیں وہ حیات کے درخت کا پھل کھا کر تا دائمی زندگی نہ پا لے' چنانچہ اس نے اس اولین انسانی جوڑے کو زمین پر پٹخ دیا اور اسے موخر الذکر درخت کی کڑی حفاظت کا اس وقت خیال آیا۔

(XI) یہودیوں نے ماڈرن دنیا کی ضرورتوں کے پیش نظر عہد نامۂ عتیق کی ایک جدید تشریح ''ربی جے ایچ ہرٹز'' سے لکھوا کر شائع کی ہے' جس میں مندرجہ بالا اقتباسات کی وضاحتیں کی گئی ہیں۔ مثلاً ''آدم کی ترغیبات کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے خدائے رحیم و کریم نے اس سزا میں ترمیم کر دی اور وہ گناہ کرنے کے بعد اسی دن مرنے سے بچ گئے''۔ یہ وضاحت کتاب پیدائش 17:2 کے ضمن میں ہے۔ اسی طرح ''انسان ہماری مانند بن گیا ہے'' کی وضاحت یہ کی گئی ہے ''فرشتوں میں سے ایک'' یا ''ہم میں سے ایک''۔ مراد یہ کہ ''انسان خدائے ہمہ دان بن گیا ہے'' یعنی انسان نے نافرمانی کرنے کے نتیجے میں غیر محدود علم حاصل کرنے کی صلاحیت پا لی ہے اور اب خطرہ ہے کہ اس کا یہ علم اسے دائرہ اطاعت خداوندی سے باہر کر دے گا۔

بہ الفاظ دیگر انسان میں نیک و بد میں تمیز کرنے کی صلاحیت یا اس کی

ذہانت اور عقلمندی میں اضافہ اتنا گھناؤنا جرم تھا کہ اس کی بنا پر وہ باغ عدن سے اخراج کا مستحق ہو گیا تھا۔ اور اس کی وجہ سے انسان مجسم شر بن گیا ہے لہٰذا اب اس کا واحد علاج نارِ جہنم کے تند و تیز شعلے ہیں۔

(XII) دوسری طرف حضرت محمد ﷺ پر نازل شدہ وحی میں نہ تو اس درخت کا ذکر آتا ہے اور نہ یہ ذکر آتا ہے کہ وہ پھل' ایک سیب تھا۔ اس میں یہ ذکر بھی نہیں کہ اس درخت نے انہیں نیک اور بد کے درمیان تمیز کی قوت بخشی اور یہ ذکر بھی نہیں آتا کہ شیطان نے پہلے حوا کو بہکایا اور پھر اس نے آگے حضرت آدمؑ کو پھسلایا۔ یہ ذکر بھی نہیں کہ وہ پھل کھانے کے بعد آدمؑ خدا کی طرح بن گئے تھے۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ کوئی شخص کسی درخت کا پھل کھا لینے سے خدا نہیں بن سکتا۔ یہ سمجھنا بہت بڑی جہالت اور شرک ہے کہ خداوند خدا کی نافرمانی کرنے والے کو تمام چیزوں کا علم اور بقائے دوام حاصل ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہنا بھی عہد تاریکی کے توہمات میں سے ہے کہ خدا نے دو ایسے درخت لگا رکھے ہیں جن میں سے ایک زندگی دینے والا درخت ہے اور دوسرا نیک و بد میں تمیز کرنے کی صلاحیت دینے والا درخت ہے۔ قرآنی آیات کی روشنی میں جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ متذکرہ بالا درخت شر اور نافرمانی کا درخت تھا۔ نیکی' اور تقویٰ کے الفاظ اچھا ''درخت'' ہیں اور شر و فساد اور برائی کے الفاظ برا ''درخت'' ہیں۔ اولادِ آدم میں سے جو لوگ برے ہیں وہ شر و فساد اور ضرر کے درخت لگاتے ہیں اور راستباز لوگ نیکیوں کے درخت لگاتے ہیں۔ اور دونوں اپنے اپنے اعمال کے مطابق سزا اور جزا کے مستحق بنیں گے۔

(XIII) جہاں تک سیب کے درخت کا تعلق ہے' نبی اکرمؐ کے بارے میں اس درخت کی گواہی یہ ہے کہ آپ' ایک سایہ دار' راحت افزا' پُر شفقت و ذی وقار اور شیریں ثمر کے حامل درخت کی مانند تھے جس کی خوشبو سے مشامِ جاں معطر ہو جاتی تھی آپؐ اور بھی بے شمار خوبیوں اور صفات کے مالک تھے۔ آپ ایک ایسے درخت تھے جس کا پھل کھانے سے کوئی بھی اپنی خوشیوں کے گلشن سے باہر نہیں پھینک دیا

جاتا اور نہ یہ پھل کسی انسان کی فطرت کو بدل کر اسے سراسر شر و فساد بنا دیتا ہے۔ قرآن نہ حوا پر حضرت آدمؑ کو دھوکہ دینے کا الزام لگاتا ہے اور نہ یہ کہتا ہے کہ اس کا پھل کھانے سے کوئی بندۂ خدائی کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کو خدائے وحدہٗ لاشریک کی اطاعت کا درس دیتا ہے۔ اور یہ نصیحت بھی کرتا ہے کہ ہر شخص وہی کاٹے گا جو کچھ وہ اب بو رہا ہے جس سے عقیدۂ کفارہ کی تردید ہو جاتی ہے۔ یہ اس خدا کی عظمت کے گیت گاتا ہے جس کی رحمتوں کا ہمیشہ نزول ہوتا رہتا ہے۔ یہ صحیفۂ آسمانی اپنے سے پہلے کے صحائفِ آسمانی میں داخل کر دی گئی غلطیوں کو بے نقاب کرتا ہے اور انسانوں کو شریعت کی اطاعت کا درس دیتا ہے اور یہ بھی سکھاتا ہے کہ وہ قانون (شریعت) کو لعنت نہ سمجھیں۔ یہ انسان کی ذہانت کو تیز تر کر دیتا ہے اور انسانی تہذیب کو تمام برائیوں اور عیبوں سے پاک کرتا ہے جو مختلف عوامل کی وجہ سے تہذیب کے اندر داخل ہوتے رہے ہیں۔

(XIV) باغ عدن میں جو کچھ ہوا' قرآن اس کا الزام حضرت آدمؑ پر عائد نہیں کرتا۔ اس معاملے میں قرآن کا کہنا یہ ہے وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ (اور ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک حکم دیا تھا مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا......سورۃ طٰهٰ آیت 115)۔ عہد نامۂ عتیق اس بارے میں بالکل ایک دوسری کہانی بیان کرتا ہے۔ وہ حوا پر الزام دھرتا ہے اور اس حوالے سے عورت کی ذات کی توہین کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ شیطان کی ترغیب سے متاثر ہو کر پہلے خود گمراہ ہوئی پھر اس نے شیطان کی آلہ کار بن کر آدمؑ کو بھی گمراہ کر دیا۔ قرآن نے اس واقعہ کے بارے میں جو کچھ بتایا اس میں یہ بات شامل نہیں ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے یہ کہہ کر آدمؑ کو بالکل بری الذمہ قرار دیا ہے کہ یہ شعوری اور ارادی ارتکابِ نافرمانی نہیں تھا۔ علاوہ ازیں عہد نامہ نے خود اپنی تردید بھی کی ہے کیونکہ اس میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ دھوکہ آدم کو نہیں بلکہ عورت کو دیا گیا تھا اور وہ فریب کھا کر گناہ میں پڑ گئی۔ (تیمتھیس کے نام پہلا خط 14:2) اور پھر عہد نامہ یہ بھی کہتا ہے "کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا اس لیے

کہ کوئی قانون موجود ہی نہ تھا کہ اس کی خلاف ورزی ہوتی" (رومیوں کے نام کا خط 5:13؛ 3:2)۔ اناجیل کے مطابق قانون سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ لائے تھے' ان سے پہلے کوئی قانون نہیں ہوتا تھا۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے آدمؑ کو تجاوز کا مرتکب کیسے سمجھا جا سکتا ہے جبکہ اس وقت تک انسان کے پاس قانون آیا ہی نہیں تھا؟ علاوہ ازیں قانون (شریعت) حضرت عیسیٰؑ کی آمد کے بعد لعنت قرار پایا تھا لہٰذا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جب قانون نہیں تھا تو اس کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوئی تھی۔

(XV) کہا جاتا ہے کہ یسوع مسیحؑ کی آمد' یوم حساب آجانے اورانسان کے گناہوں سے نجات پانے کا وقت آجانے کے مترادف ہے۔ لیکن یہ ان معنوں میں نہیں کہ لوگ گناہ کرنا چھوڑ دیں گے۔ بلکہ ان معنوں میں ہے کہ بنی نوع انسان کو گناہوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیونکہ انہیں آئندہ گناہوں پر سزا نہیں ملا کرے گی۔ انجیل کہتی ہے "اور بیچ میں شریعت آموجود ہوئی تاکہ گناہ زیادہ ہو جائے مگر جہاں گناہ زیادہ ہوگا وہاں فضل اس سے بھی زیادہ ہوگا" (رومیوں کے نام کا خط 5:20) اس طرح عقیدۂ کفارہ گناہوں اور نافرمانیوں کے لیے ایک لائسنس بن گیا۔ گناہ اور کفارے کے گورکھ دھندہ کا ایک مضحکہ پہلو یہ ہے کہ ایک طرف چرچ یہ کہتا ہے کہ خونِ مسیحؑ نے عیسائیوں کے تمام گناہ دھو دیئے ہیں (یوحنا کا پہلا خط 1:7؛ کرنتھیوں کے نام پہلا عام خط 1:18 '19۔ یوحنا عارف کا مکاشفہ 1:5)۔ دوسری جانب سنجیدہ اہل فکر نوحہ کناں ہیں کہ امریکہ اور یورپی ممالک شدید اخلاقی انحطاط کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ یونیورسٹیوں کی گریجویشن کی تقریبات ہوں یا کوئی اور تہوار' شراب و کباب ناجائز جنسی اختلاط اور اس قسم کی دیگر بدمستیاں بکثرت دیکھنے میں آتی ہیں۔ ہر کوئی اس خیال میں مست ہوتا ہے کہ یہ زندگی پینے پلانے اور مزے اڑانے کے لیے میسر آئی ہے اور یہ ایک ہی بار ملتی ہے جو کرنا ہے کر لو۔ اگر کسی کے دل میں کچھ خلش پیدا ہوتی ہے تو وہ عقیدہ کفارۂ کی وجہ سے دور ہو جاتی ہے یا شراب کا ایک اور جام غم کو بھلا دیتا ہے۔ ان ملکوں میں شادی

بطورادارہ کا تقدس بھی بری طرح پامال ہو چکا ہے۔ ہر چار میں سے تین شادیاں طلاق پر منتج ہوتی ہیں۔ عورتیں اور مرد گھنٹوں شراب خانوں اور تفریح گاہوں میں غل غپاڑہ کرتے رہتے ہیں۔ اور ایسے واقعات بھی دیکھے گئے ہیں کہ شوہر دفاتر سے تھکے ہارے واپس آئے تو بیوی کے گھر کی بجائے کسی شراب خانے میں پائی گئی جہاں بعض اوقات وہ اتنی بدمست ہوتی ہیں کہ ان کے لیے اپنے قدموں چلنا مشکل ہو جاتا ہے اور گاڑی میں ڈال کر گھر پہنچانا پڑتا ہے۔ یہ سب کچھ عقیدہ کفارہ کا نتیجہ ہے جو بدکاریوں کے لیے ایک کھلا لائسنس ثابت ہوتا ہے۔ عیسائی ملکوں میں جرائم بڑھنے کی رفتار دوسرے ممالک سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ شیطان کو مذہبی لوگوں کی کوتاہیوں سے فائدہ اٹھانے کا بھرپور موقع ملتا ہے۔ تاہم یہ سمجھنا بہت مشکل کام ہے کہ ان ممالک کے حکمران جو عیسائی ہونے کے علاوہ مذہب کے محافظ ہونے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں بد اعمال لوگوں کو عدالتوں میں کیوں گھسیٹ لیتے ہیں ان کے لیے جیلیں اور اصلاح خانے کیوں بناتے ہیں جبکہ وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ خون مسیح نے سب کے گناہ دھو ڈالے ہیں۔

1959ء میں سان فرانسسکو میں ایک بال بچے دار پادری ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ منہ کالا کرتے ہوئے پکڑا گیا اور اس نے پولیس کے سامنے اعتراف جرم بھی کر لیا۔ مگر مذہبی رہنماؤں کی ایک اچھی خاصی تعداد اسے قانون کے شکنجے سے بچانے کے لیے پہنچ گئے اور وہ مقدس کتابوں کے حوالے دے دے کر اسے چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ مثلاً ''عیب جوئی نہ کرو تاکہ تمہاری بھی عیب جوئی نہ کی جائے کیونکہ جس طرح تم عیب جوئی کرتے ہو اسی طرح تمہاری بھی عیب جوئی کی جائے گی اور جس پیمانے سے تم ناپتے ہو اسی سے تم بھی ناپے جاؤ گے۔ کسی کو مجرم نہ ٹھہراؤ تاکہ تم بھی مجرم نہ ٹھہرائے جاؤ۔ خلاصی دو تم بھی خلاصی پاؤ گے'' (متی 7:1، 2؛ لوقا 7:6) اس شخص کی حمایت میں اس کے ''ہم لباس'' بھائیوں نے اتنا شور مچایا اور اتنا ہنگامہ ہوا کہ اسے فرار ہونے کا موقع مل جائے جبکہ غریب لڑکی سزایاب ہو گئی۔ حالانکہ ایسے کیسوں میں حضرت مسیح نے جو

کچھ کیا تھا اس کی روشنی میں اس عورت کو اس الزام سے بری کر دیا جانا چاہئے تھا۔ (یوحنا کی انجیل 11:8)۔

حضرت عیسیٰؑ کی اصل تعلیمات کیا کہتی ہیں' ملاحظہ کیجئے: متی باب 13' آیات 40۔43:۔ ''پس جیسے کڑوے دانے اکٹھے کر کے جلا دیئے جاتے ہیں' ویسے ہی اس دنیا کے آخر میں کیا جائے گا۔ ابن آدم اپنے فرشتوں کو بھیجے گا اور وہ سب ٹھوکر کھلانے والی چیزوں اور بدکاروں کو اس کی بادشاہی میں سے جمع کریں گے اور ان کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے وہاں رونا اور دانت پیسنا ہو گا۔ اس وقت راستباز لوگ اپنے باپ کی بادشاہی میں آفتاب کی طرح چمکیں گے' جس کسی کے کان ہوں گے وہ سن لے''

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی آمد' یوم حساب نہیں تھی۔ لیکن حضرت محمدؐ کی آمد سے مرے ہوئے لوگ بھی جی اٹھے۔ پورا ملک معجزاتی طور پر شراب اور فحاشی کے راستوں کو ترک کر کے سیدھی راہ پر چل پڑا' بے انصافیوں کا خاتمہ ہو گیا' سرزمین عرب شرک و بت پرستی سے پاک ہو گئی۔ سیب کے واحد درخت کے پھل نے ملک کو تمام جسمانی بیماریوں اور روحانی امراض سے نجات دیدی۔ سیب کا ایک نصف حصہ مردوں نے دوسرا نصف عورتوں نے کھا لیا۔ جس سے عربوں اور پوری قوم کی آنکھیں کھل گئیں اس طرح انہوں نے عریانی کو محسوس کر لیا اور خود کو جلدی جلدی انجیر کے پتوں سے ڈھانپنا شروع کر دیا۔ انجیر کا درخت انسانی روح کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی علامت ہے۔ لہٰذا اس تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد عالم انسانیت نے خود کو اچھے اعمال کے ذریعہ ڈھانپنے کا کام شروع کر دیا۔ دوسری طرف یورپ اور امریکہ عریانی کے مظاہر عام رہے ہیں' بلکہ عریانی کا ایک نیا کلچر وجود میں آ رہا ہے جس نے ماضی کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ یہ باتیں انسان کو دعوت فکر دیتی ہیں کہ وہ برائیوں کے اس بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لیے کمربستہ ہو جائے۔

(XVI) سلیمانؑ نے سیب کے درخت اور اس کے پھل کی تعریف میں نغمے گائے مگر کس سیب کے نغمے؟ ان کی محبت کی شاعری حضرت محمدؐ کے بارے میں ہے' اور ہم ان کے مجموعہ غزلات میں واضح طور پر ان کے ہیرو کا نام ''محمدم'' پاتے ہیں۔
(غزل الغزلات عبرانی ایڈیشن 16:5)

ان آیات میں ممنوعہ پھل کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ کیونکہ وہ ان میں سے نکال دیا گیا ہے۔ یہاں سیب کا لفظ آنے والے محبوب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ سلیمان نے اسے اپنے بیٹوں میں سے بہترین بیٹا قرار دیا اور ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ ان کی تعلیمات کو نہ صرف دوسرا رنگ دیا گیا ہے بلکہ خود عہدنامہ عتیق میں ان پر سنگین الزامات لگائے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ سلیمانؑ نے بت پرستی شروع کر دی اور کالا جادو وغیرہ قسم کے کاموں میں پڑ گئے تھے۔ یعنی انہوں نے ایمان کی راہ ہی چھوڑ دی تھی۔ (ملاحظہ ہو 1' سلاطین 1:11' 9' 14' 31' 41:2-تواریخ 29:9؛ نحمیاہ 26:13)۔ حضرت عیسیٰؑ نے عہدنامہ عتیق میں ان پر لگائے گئے الزامات کی تردید نہیں کی۔ لیکن قرآن نے پوری سختی کے ساتھ غلط الزامات کی تردید کی ہے۔ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا' کفر کے مرتکب تو وہ شیطان ہوئے تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے...... سورۃ البقرۃ آیت 102)۔ اس قرآنی آیت میں جن لوگوں کی غلط حرکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' انہوں نے ہی سلیمانؑ کی تعلیمات کو مسخ کیا اور انہیں اپنے سفلی مقاصد کے لیے استعمال کر کے خلق خدا کو دھوکہ دیتے رہے۔ سلیمانؑ نے انجیر کو انسان کو فیض پہنچانے کے لیے استعمال کیا اور اس سے کئی قسم کی ادویات بھی بنائیں۔ روحانی بیماریوں کا بھی علاج کیا۔ عہدنامہ عتیق کی مختلف کتابوں کے مصنفین نے ان سے ایسی ایسی باتیں منسوب کر دیں کہ انہیں پڑھ کر انسان شرمندہ ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف قرآن نے ان کی نہ صرف پوزیشن صاف کی بلکہ بطور پیغمبر بھی ان کی عظمت بحال کی۔

حضرت سلیمانؑ کا ''متوقع معلم'' کے بارے میں کلمات تحسین کہنا کوئی حیرت ناک بات نہیں بلکہ ان کے جذبات تشکر کا مظاہرہ تھا' عہد نامہ عتیق کے عبرانی ایڈیشن میں اس ''متوقع معلم'' کا واضح طور پر ''محمدم'' نام لیا گیا ہے اور اس ملک کی بھی نشاندہی کی ہے جس میں حضرت محمدؐ پیدا ہونے والے تھے۔ ''یہ کون ہے جو بیابان سے اپنے محبوب سے ملنے کی امید پر چلی آتی ہے۔ میں نے تجھے سیب کے درخت کے نیچے جگایا جہاں تیری ولادت ہوئی جہاں تیری والدہ نے تجھے جنم دیا'' (غزل الغزلات 5:8......واضح رہے کہ یہ ترجمہ عبرانی ایڈیشن میں سے نہیں ہے)۔ یہاں ''بیابان'' کا لفظ' انجیل کے پہلے والے عبرانی ایڈیشن میں ''مُدبار'' کے نام سے تھا۔ سیب کا درخت ''علم'' اور نیک و بد میں تمیز کرنے کی ''صلاحیت'' کے لیے اشارے کے طور پر آیا ہے۔ یہی ماحول تھا جس میں نبی اکرمؐ کی ولادت ہوئی اور آپؐ نے پرورش پائی۔

سلیمانؑ ''امثال'' (Proverbs) میں کہتا ہے......''اے میرے بیٹے! میری باتوں کو مان اور میرے فرمان کو نگاہ میں رکھ۔ میرے فرمان کو بجالا اور زندہ رہ' اور میری تعلیم کو اپنی آنکھ کی پتلی (Apple of thine eyes)...... جان۔ (امثال 1:7' 2) یہ بات ان لوگوں کے لیے ایک سبق ہونی چاہیے جو ''قانون'' کو لعنت سمجھتے ہیں۔ انہیں سلیمان کے لفظوں کی اہمیت جان لینی چاہیے اور اس ''محمدم'' پر ایمان لانا چاہیے جن سے سلیمان نے اپنی غیر متزلزل محبت کا اظہار کیا تھا۔ (یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان کتابوں کا عبرانی ایڈیشن دیگر ایڈیشنوں کی بہ نسبت تحریف سے خاصا محفوظ ہے)

شاہ بلوط (Oak) کا درخت

شاہ بلوط کو تمام درختوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ عہد نامہ عتیق اور قدیم یونانی مذہبی صحیفوں میں اسے اس کی بلند قامتی' اس کے تنے کی خوبصورتی اور مضبوطی کی وجہ سے شاہی درخت کہا جاتا ہے اور یہ جہاں کھڑا ہوتا ہے اس کے چاروں طرف بھینی بھینی خوشبو پھیلی رہتی

ہے۔عربی' اردو' اور فارسی ادب میں بھی اسے شاہ بلوط کہا جاتا ہے۔عہد نامہ عتیق میں اس شاہی درخت کے لئے ''ایلا'' ''آ کلہ'' ''ایلون'' اور ''الاون'' کے الفاظ آتے ہیں۔عبرانی میں ''الاون'' کے معنی ''مشہور شخص'' کے بھی ہیں۔

(2) اس کی قامت' حُسن' تنے کی مضبوطی اور خوشبو کی وجہ سے بُت پرست قوموں نے اس سے خدائی صفات منسوب کر دیں۔اہل روم' اہل یونان اور اسرائیلی اقوام اس کی پوجا کرتی رہیں۔اور اس کی شاخوں پر دعائیں لکھ کر لٹکائی جاتی تھیں اور اس سے مستقبل کے لیے قسم قسم کے شگون لیے جاتے تھے۔ان کا عقیدہ تھا کہ اس کی بعض شاخیں خداؤں کا بسیرا ہوتی ہیں' جو کچھ لکھ کر ان کے ساتھ معلق کیا جاتا ہے' شرف قبولیت پاتا ہے۔یونانی اس سے عقیدتمندی میں اتنے دور چلے گئے کہ اپنی مذہبی کتابوں کو اسی درخت کے فیض کا نتیجہ سمجھنے لگے اور وہ اس کو تمام درختوں کی ماں بھی قرار دیتے ہیں۔برطانیہ فرانس اور پرتگال کے قدیم باشندے درونڈز (Druids) اپنے اہم اجلاس شاہ بلوط کے نیچے منعقد کرتے تھے۔اسرائیلی اسی کی لکڑی سے بت تراشتے تھے' کیونکہ یہ لکڑی دوسری لکڑیوں سے زیادہ مضبوط ہونے کے علاوہ مذہبی تقدس کی حامل بھی سمجھی جاتی تھی۔

(3) شاہ بلوط کے ساتھ اتنی عقیدت رکھنے کا سبب یہ تھا کہ مصر کے قدیم باشندوں درونڈز (جن میں سے کچھ برطانیہ میں آباد تھے) کی مقدس تحریروں میں لکھا ہوا تھا کہ حضرت محمدؐ کی بعثت ہونے والی ہے۔یہ بات تصویری زبان میں طلوع ہوتے ہوئے سورج کی شکل میں لکھی ہوئی تھی۔نبی اکرمؐ سے متعلق یہ ''اظہاریہ'' (Expression) قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔ان لوگوں نے اہرام بھی تعمیر کئے تھے جو ان کتابوں میں حضرت محمدؐ کی آمد کی علامت کے طور پر پائے جاتے تھے۔آپؐ سے متعلق یہ تصویری تحریریں نہ صرف برطانیہ بلکہ چین اور میکسیکو تک بھی پہنچیں درونڈز ''معلم موعود'' (Promised Teacher) کی آمد کے بارے میں شاہ بلوط کے درخت کے نیچے جلسے بھی منعقد کیا کرتے تھے۔

(4) لیکن بدقسمتی سے' وہی چیزیں جو شروع میں خدا کی وحدانیت کی علامت مانی جاتی تھیں' اور جو بتوں کی موت اور تدفین کی نشانیاں تھیں' اخلاقی بیماریوں میں مبتلا قوموں نے

انہیں بطور معبود پوجنا شروع کر دیا۔ مقام حیرت ہے کہ وہی اسرائیل جن میں آنے والے ہر پیغمبر نے وحدانیتِ خدا پر زور دیا تھا' شاہ بلوط کی لکڑی کے بت بنانے لگے' شاہ بلوط کے درخت کے نیچے دھونیاں جلا کر اس کے آگے سجدے کرنا شروع کر دیئے۔ مثال کے طور پر ہم ''یسعیاہ'' میں پڑھتے ہیں:۔

''لیکن گنہگار اور بدکردار سب اکٹھے ہلاک ہوں گے اور جو خداوند سے باغی ہوئے فناہ کیے جائیں گے کیونکہ وہ ان بلوطیوں سے جن کو تم نے چاہا شرمندہ ہوں گے اور تم ان باغات کو دیکھ کر ہکا بکا رہ جاؤ گے جن کو تم نے بہت پسند کیا تھا۔ اور تم اس بلوط کی مانند ہو جاؤ گے جس کے پتے جھڑ گئے ہوں اور باغ آبیاری نہ ہونے کی وجہ سے سوکھ جائے''۔ (یسعیاہ......1:28-30)

اسی طرح ہم ''یشوع'' میں پڑھتے ہیں:

''اور یشوع نے یہ باتیں خدا کی شریعت کی کتاب میں لکھ دیں اور ایک بڑا پتھر لے کر اسے وہیں اس بلوط کے درخت کے نیچے جو خداوند کے ''مَقْدِس'' (Sanctuary) کے پاس تھا' نصب کر دیا۔ اور یشوع نے سب لوگوں سے کہا کہ دیکھو یہ پتھر ہمارا گواہ ہو گا کیونکہ اس نے خدا کی سب باتیں جو اس نے ہم سے کہیں سنی ہیں۔ اس لیے یہی تم پر گواہ رہے گا تا کہ تم اپنے خدا کا انکار نہ کر بیٹھو''۔ (یشوع 24:26' 27)

عہد نامہ عتیق کے سکالرز کو اس بات پر شبہ ہے کہ شاہ بلوط اور بیروزہ کے درختوں میں سے' کونسا ہے جس میں سے تارپین کا تیل نکلتا ہے۔ یہ تیل متعدد جلدی بیماریوں کے علاج میں کام آتا ہے۔ یسعیاہ کہتا ہے کہ اسرائیل کو اگرچہ شاہ بلوط اور بیروزے کے درختوں کی طرح جلا دیا جائے گا' ان کا ٹنڈ (Trunk) محفوظ رہے گا۔ جو مقدس بیج بن جائے گا (یسعیاہ 6:13) ہوسیع کہتا ہے ''میرے لوگ' اسرائیل اپنی شرمزاجی کی وجہ سے گمراہ ہو چکے ہیں۔ وہ شاہ بلوط اور مصری توت (Sycamore) کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر لکڑی کے بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہی لکڑی ان سے کہتی ہے کہ تمہیں بدکاری نے گمراہ کیا ہے اور تم نے خدا کی پناہ کو چھوڑ کر بدی کی راہ اختیار کر لی ہے'' (ہوسیع 4:12)۔ عاموس (AMOS) کہتا

ہے کہ اسرائیلی شاہ بلوط کے درخت کی طرح تندرست و توانا تھے لیکن وہ بت پرستی اور بدکاریوں میں پڑ گئے جس کی وجہ سے خدا نے ان کی جڑیں کاٹ کر انہیں برباد کر کے رکھ دیا۔ (عاموس 9:2)

ان حوالہ جات سے شاہ بلوط کے درخت کے بارے میں ذیل کے نتائج سامنے آتے ہیں:

(i) شاہ بلوط خدائے واحد کی عبادت کی علامت ہے۔

(ii) خدا کے سوا جتنے بھی معبود اور بُت بنائے گئے تھے' خواہ وہ چاندی کے تھے یا سونے کے' سب شاہ بلوط کے قدموں کے نیچے دفن کر دیئے گئے۔

(iii) اسرائیل پر خدا کا قہر اس لیے نازل ہوا کہ وہ شاہ بلوط کی لکڑی سے بُت تراشتے تھے۔

(iv) اسرائیلی شاہ بلوط کے درخت کے نیچے دھونی رما کر اس کی پوجا کیا کرتے تھے۔

(v) خدا نے انہیں شاہ بلوط کی پرستش کی اس طرح سزا دی کہ اس کی جڑوں کو ان کے دیکھتے دیکھتے خشک کر دیا۔

(vi) ساتھ ہی اس نے ان سے یہ وعدہ کیا کہ وہ اس کے تنے (ٹنڈ) کو محفوظ رکھے گا تاکہ مقدس تخم کے طور پر باقی رہے۔

(vii) شاہ بلوط خدا کی طرف سے وحی اور الہام کا یادگار درخت ہے' کیونکہ اس نے اسی کے نیچے اپنے نیک اور راستباز بندوں سے کلام کیا تھا۔

یہ تمام نشانیاں اور نتائج حضرت محمد ﷺ کی حیات مبارکہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ تمام انبیائے اسرائیل نے آپؐ کے بارے میں پیشگوئیاں کیں اور ان کے بعد کوئی دوسرا پیغمبر نہیں آیا جس نے بت پرستی کے خلاف اتنے بڑے پیمانے پر تحریک چلائی ہو۔ قرآن مجید نے توحید باری تعالیٰ پر جتنا زور دیا ہے وہ کسی اور پیغمبر کے صحیفے میں نہیں پایا جاتا۔ حضرت محمدؐ پر نازل ہونے والی وحی اور ان کی تعلیمات میں نہایت زوردار طریقے سے توحید کے اصول بیان کیے گئے ہیں جو کاملیت اور جامعیت کے مرقع ہیں۔ اسلام نے

عربوں کے 360 بتوں کو پاش پاش کر کے دائمی موت سلا دیا۔ سابق آسمانی کتابوں میں شاہ بلوط کا درخت خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کی علامت کے طور پر آیا تھا۔ اور اس کی وحدانیت کو منوانا اور قائم کرنا نبی اکرمؐ کا مشن تھا جسے آپؐ نے بدرجہ کمال پورا کر دکھایا۔

ہندوؤں کی عارفانہ کتابوں میں محمدؐ کا نام

ہندوؤں' بدھوں' عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں الگ الگ عارفانہ الفاظ (Mystic syllables) مروّج ہیں جو بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں اور بکثرت آتے ہیں۔ ہندوؤں اور بدھوں کے ہاں ایسا لفظ ''اوم'' ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس لفظ کو بکثرت دہرانے سے وہ اس دنیا میں سات قسم کے انتہائی بیش قیمت پتھروں کے خزانوں تک رسائی پا سکتے ہیں اور اگلے جہان میں فیوض و برکات اور خدا سے ملاقات کے مستحق بن جائیں گے۔ اسی طرح عیسائیوں کے ہاں ایسا لفظ یا الفاظ ''Alpha-omega''......(اول و آخر) اور یہودیوں کے ہاں ''ایمت'' (Emet) مروّج ہے۔

آیئے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں ہندو 'رشی' اور سنت کیا کہتے ہیں۔ ہندو ویدوں کا بڑا احترام کرتے ہیں اور ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ احترام و عظمت ''رگ وید'' کو حاصل ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

''رگ وید کے تمام منتر آسمانوں میں ہیں جہاں سب دیوتا رہتے ہیں۔ ان سب منتروں کو ایک ہی خفیہ لفظ کے اندر سمو دیا گیا ہے۔ جس کو اس لفظ کا پتہ نہیں اسے وید کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے؟ اور دنیا میں خوشی اور خوشحالی اسی کو نصیب ہو سکتی ہے جو اسے جانتا ہو''

وہ خفیہ لفظ آخر ہے کیا کہ جس میں رگ وید کے تمام دس ہزار کے دس ہزار منتر بھینچ اور نچوڑ کر سمو دیئے گئے ہیں؟ اور اس کے اندر مدح اور ستائش پر مبنی تمام منتر سما گئے ہیں۔ یعنی رگ وید کے تمام منتروں کا وزن اس ایک لفظ کے برابر ہے۔ پھر ہم اس رگ وید کے بارے میں کیا رائے قائم کر سکتے ہیں جب اس خفیہ لفظ کا چاروں ویدوں سے کوئی سراغ نہیں ملتا؟ ویدوں کے

شارحین اپنی ساری کوششوں کو بروئے کار لانے کے باوجود اس کا سراغ نہیں لگا سکے۔ چنانچہ ایک قدیم شارح لکھتا ہے:

''یہ انسانی روح ہے جس کے احساسات دیوتاؤں جیسے ہیں اور اس کی جائے رہائش انسان کا جسم ہے۔ جو کوئی روح کے بارے میں کچھ نہیں جانتا وہ احساسات اور جسم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن جو لوگ روح کے بارے میں جانتے ہیں وہ خوشیوں اور لذتوں سے بھری زندگی گزارتے ہیں''

اس شارح نے خیال تو اچھا پیش کیا ہے' لیکن رگ وید کے تمام منتر' جیسا کہ اس نے کہا ہے' ایک عام آدمی کی روح کے اندر کیسے سمٹ سکتے ہیں۔ اور آسمانوں میں رہائش رکھنے والے دیوتا' اس کے اندر کیسے رہ سکتے ہیں؟ اس نے اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ یہ نکتہ ہمیشہ کی طرح اب بھی مبہم اور پُراسرار ہے۔

ایک اور شارح اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے...... ''یہ عارفانہ لفظ' سورج ہے اور اس کی چمکدار کرنیں' دیوتا ہیں۔ روح' اس کے اندر موجود ایک قوت ہے جو اسے حرکت میں لاتی ہے۔ جو شخص اس کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو' وہ سورج اور اس کی چمکدار کرنوں سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے؟''

یہ وضاحت بھی بظاہر معقول ہے لیکن اس سے ہمیں جو بات سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ ''سورج'' اور اس کی ''کرنیں'' رگ وید کے منتروں کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید ہیں اور ان سے اچھی آگاہی پانے کے بعد انسان کو رگ وید پڑھنے کی کوئی حاجت نہیں رہتی۔ تاہم فاضل شارح ہمیں یہ نہیں بتا سکے کہ ''سورج کی روح'' کیا ہے کہ اس کا علم' رگ وید کے اندر موجود سارے علم کی کلید بن جاتا ہے۔

تاہم ایک تیسرا شارح کہتا ہے: وہ عارفانہ لفظ ''اوم'' ہے جس کے اندر تمام دیوتا سمٹ آتے ہیں۔ جو کوئی ''اوم'' کے بارے میں کچھ نہیں جانتا' رگ وید اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن جو اس ''اوم'' کے بارے میں علم رکھتا ہے' وہ اس دنیا کی تمام خوشیوں' کامیابیوں' امن وسکون اور خوشحالی سے ہمکنار ہو جائے گا'' (نرکت 10:13' 12)

اس ساری بحث تمحیص کا نچوڑ اور ماحاصل یہ ہے کہ ویدوں میں نہ تو اس عارفانہ لفظ

کا ''نام'' آتا ہے اور نہ کوئی ذکر ملتا ہے' اگر ایسا ہوتا تو شارحین اس کی لازماً نشاندہی کر دیتے۔ بہر حال انہوں نے اس سلسلے میں جو کاوشیں کی ہیں' وہ واقعی قابل قدر ہیں۔ لیکن عارفانہ لفظ کا تصور صرف ویدوں میں ہی نہیں' دراصل ویدوں نے یہ اپنشدوں سے مستعار لیا ہے۔

اپنشدوں میں ''اوم''

اپنیشد' مستند اور معتبر ہونے کے لحاظ سے ویدوں کے بعد کا درجہ رکھتے ہیں لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ وہ بعد کا یعنی دوسرا نمبر نہیں بلکہ پہلا نمبر رکھتے ہیں۔ کئی ہندو لیڈر اور پنڈت بھی اس دعوے سے اتفاق کرتے ہیں مثلاً برہمو سماج کے بانی راجہ رام موہن رائے نے اس کی پرزور حمایت کی ہے۔ مشہور فلسفی پنڈت رادھا کرشنن (جو بعد میں بھارت کے صدر منتخب ہو گئے تھے) اپنی ''فلاسفی آف اپنشدز'' میں لکھتے ہیں..... ''ہمیں اپنشدوں میں سمہیتا (وید) پر ایک گونہ سبقت نظر آتی ہے' ان میں سچائیوں پر مبنی اتنے اشارات اور خدا کے بارے میں اتنی شہادتیں ملتی ہیں کہ ان میں سے ہر کوئی وہ کچھ پا سکتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے'' (صفحہ 16)۔

ہیسٹنگز اپنی 'انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (جلد 9' صفحہ 490) میں لکھتا ہے:

''اوم'' کوئی پرانا حرفِ ندا' یا حرفِ استعجاب نہیں ہے' یہ حالیہ ادب پاروں میں ملتا ہے' یہ رگ وید میں بالکل نہیں ملتا' اسی طرح اتھروید بھی اس سے خالی ہے۔''

اپنشدوں نے اپنے دعوے کے بارے میں خود یہ الفاظ لکھے ہیں: ''ایک سربراہِ قبیلہ شانک آگراز کے پاس آیا اور پوچھا......جناب! وہ کیا چیز ہے' اگر آدمی اس کے بارے میں علم رکھتا ہو' تو اس کے بعد اسے ہر چیز کے بارے میں علم حاصل ہو جاتا ہے۔ اس پر آگراز نے اسے بتایا۔ اس کے لیے دو قسم کے علموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی کچھ ہمیں وہ لوگ بتاتے ہیں جو برہما (خدا) کو پہچانتے ہیں' ان کا کہنا ہے کہ ''علم اعلیٰ'' بھی ضروری ہے اور ''علم تحتانی'' (LOWER KNOWLEDGE) بھی۔ موخر الذکر علم سے مراد رگ وید' یجر وید' سام وید اور اتھر وید ہیں۔ لیکن علم اعلیٰ......وہ علم ہے جس کے ذریعہ ''اکشر'' (نجاتِ اخروی) کے ذرائع معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ (مندک اپنیشدز 1:1' 3-5)

یہاں اپنیشد کی مراد یہ ہے کہ ''اکشر'' کا علم رگ وید اور دوسرے ویدوں سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور رگ وید خود اعلان کرتا ہے کہ جو انسان اس ''اکشر'' کو نہیں جانتا رگ وید سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اور اپنیشدوں میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ''اکشر'' کا علم ''اعلیٰ تر'' کے علم یعنی خداوند تعالیٰ کے علم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

منڈک اپنیشد کے بعد معتبر اور مستند ہونے کے لحاظ سے ''کٹھ اپنیشد کا درجہ آتا ہے'' جس میں لکھا ہے کہ ''یاما نے کہا: وہ لفظ' جسے سب وید بہت اہمیت دیتے ہیں' جو گناہوں کا کفارہ بنتا ہے' اور جس کے دھرمی علوم کے طلباء شیدائی ہوتے ہیں' وہ میں تجھے مختصر طور پر بتاتا ہوں'...... لفظ ''اوم'' ہے۔ (کٹھ اپنیشد ...... 2:1' 15)

اپنیشدوں میں اس قسم کے افکار کئی جگہ آتے ہیں جن کا مقصد اور لب لباب یہ ہے کہ ''اوم'' ایک عظیم عارفانہ لفظ ہے جو وید پڑھنا شروع کرنے سے پہلے کئی بار دوہرایا جاتا ہے۔ کوئی تقریر شروع کی جائے' کوئی تعمیر شروع کی جائے' یگیہ یا قربانی کی جائے' یا کسی بھی کام کا آغاز کیا جائے تو پہلے بہت بار ''اوم' اوم'' پکارا جاتا ہے۔ ''اوم'' ہر شخص' ہر مذہبی سکالر اور ہر پنڈت کا مقصد اولین ہوتا ہے۔ (تیت اپنیشد 1.8:1)

اگر ''اوم'' نہیں ہے تو پھر دنیا میں کچھ بھی نہیں ہے' اس کی اگر نفی یا انکار ہو جائے تو ویدوں کے مطالعہ سے' پوجا پاٹ سے اور توبہ و کفارہ سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ''اوم'' اعلیٰ ترین علم کا نام ہے جو انسان کو خدا کے قریب تر کر دیتا ہے۔ ''اوم'' کے بغیر نہ دھرم ہے' نہ نیک اعمال ہیں' نہ مکتی (نجات) ہے اور نہ کفارہ ہے۔ انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے ''اوم'' ہی کے ذریعہ اور توسط سے ملتا ہے۔ ''اوم'' درحقیقت تمام خواہشوں اور تمناؤں کی اعلیٰ پیمانے پر تکمیل ہے اور ویدوں نے بالکل بجا طور پر کہا ہے کہ اس ''مخفی لفظ'' کے علم کا حصول سات بیش بہا جواہرات کا خزانہ عطا کرتا ہے۔ مہاتما بدھ کو ویدوں سے کئی معاملات پر اختلاف ہے' مگر وہ اس نقطے پر ان سے بالکل متفق ہیں۔

''اوم'' کا تلفظ اور معنی

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے' ''اوم'' تمام ویدوں کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ وید پڑھنے

سے پہلے سریلے لحن (لہجے) کے ساتھ' لمبا کھینچتے ہوئے ''اُووم'' کہا جاتا ہے اور اس کا اختتام......''اوم......شانتی'' پر کیا جاتا ہے۔ یعنی امن اور سلامتی (یا' اسلام)۔ لیکن ''اوم'' ایک اور وجہ سے پھر ایک پُر اسرار اور صوفیانہ لفظ بن جاتا ہے' وہ ہے اس کے صحیح اور حقیقی تلفظ کا معاملہ۔ یعنی یہ منہ سے کس طرح ادا کیا جائے اور کاغذ پر کیسے لکھا جائے؟۔ اور اس کا مفہوم اور اس کی اہمیت کیا ہے؟

اس کو تحریر کرنے کے پانچ طریقے ہیں اور اسے پڑھنے کے چار ہیں۔ جبکہ اس کے معنی بھی کئی ہیں۔ اس کے تلفظ کے چار طریقے یہ ہیں:۔ (1) اَ۔او۔ما (2) اوما (3) اَ۔وا۔ما اور (4) اونگ...... لکھتے وقت اس کی پانچ مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں۔ ان میں سے پہلی اور پانچویں شکل قدیم ترین اور مستند ترین ہیں۔ تیسری شکل جو کہ ''م'' سے پہلے انگریزی کے عدد ''3'' کو لگا دینا ہے یعنی (3م) بنا دینا ہے' آریہ سماج کی اختراع ہے پانچویں شکل سورج کا ڈائیگرام ہے جس کے اندر ''اوم'' لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ شکل قدیم ترین ہے اور بے حد اہم اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

اگر ''اوم'' کے حقیقی معنی خدا تعالیٰ کی ذات ہے تو اسے مخفی اور مستور رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور واضح طور پر کہہ دیا جانا چاہئے کہ یہ ''پرماتما'' کا مقدس نام ہے جو بلند ترین ہستی ہے' اسی طرح اس کے اوصاف بھی اعلیٰ ترین ہیں۔ ویدوں میں اس کے معنی اعلیٰ ترین صفات کے مالک کے ہیں جس کی تقدیس سب دیوتا بیان کرتے ہیں اور اسی کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ اگر اس کے یہی معنی لئے جاتے تو لوگ اس مغالطے میں مبتلا ہونے سے بچ جاتے کہ وید خدا کی وحدانیت کا درس نہیں دیتے بلکہ خداؤں کی تکثیر (Plurality) کے دعویدار ہیں۔

''اوم'' کے ''م'' کے مسئلے کا حل

اخروٹ کو توڑنے کے کئی طریقے ہیں لیکن ان میں آسان طریقہ یہ ہے کہ اسے ''نٹ کریکر'' (Nutcracker) میں ڈال کر' کوئی خطرہ مول لئے بغیر توڑ دیا جائے۔ اسی طرح ہر معمہ حل کرنے اور ہر الجھن دور کرنے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں' ہمیں ان میں سے وہی

اختیار کرنا چاہئے جو موثر ترین ہو۔ اپنشدوں کے مطابق ''اوم'' کی برتری اور امتیاز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ یہ ایک سہ حرفی لفظ ہے یعنی یہ ''ا'' ''و'' اور ''م'' پر مشتمل ہے ''او'' کے اسم سے مشتق نہیں ہے۔

ان تینوں حروف پر الگ الگ توجہ مرکوز کرتے ہوئے انسان بار بار جنم لینے اور بار بار مرنے یعنی ''تناسخ اور آواگان'' کے چکر سے نجات پالیتا ہے۔ جیسا کہ ''سانپ بار بار اپنی کینچلی تبدیل کرتا ہے'' (پراشن اپنشد 5-2:5)۔ لیکن جس نقطے پر غور کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ''ا'' اور ''و'' کے حرفوں پر ذہن مرکوز کرنے سے کوئی نجات نہیں ملتی' روح ادھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہے۔ مکمل نجات صرف اسی وقت ملتی ہے جب ذہن کو حرف ''م'' پر مرکوز کیا جائے۔ اس ضمن میں ان نقاط پر غور فرمایئے:۔

(1) باوجودیکہ اوم ایک بہت بڑا راز ہے اور مسلمانوں اور ہندوؤں میں اس کے صحیح مفہوم و مطلب پر خاصا اختلاف بھی ہے۔ تاہم اگر وہ ایک دوسرے کے موقف کا احترام کرتے ہوئے اس کا حقیقی مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں تو ان کے درمیان مفاہمت کی بہتر صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ لفظ ''اوم'' جن حروف کے ملنے سے بنتا ہے' ان میں پہلا حرف ''الف'' ہے اس کو ادا کرتے وقت گلا جو انسانی نطق کا ''صوتی عضو'' (vocal organ) ہے پوری طرح کھل جاتا ہے' الف کے بعد ''واؤ'' کی ادائیگی کے لئے منہ پوری طرح کھلا رہتا ہے اور اس کی تمام ہوا' اس کی ادائیگی کے کام آجاتی ہے۔ اور جب ہم حرف ''م'' ادا کرنے لگتے ہیں تو ہمارے ہونٹ اس کے ساتھ ہی بند ہو جاتے ہیں۔ چھندوگیہ اپنیشد کے الفاظ کے مطابق:

''اوم'' کا لفظ پوجے جانے اور تحسین کئے جانے کا صحیح معنوں میں مستحق ہے۔ اس کی ادائیگی کے وقت نطق (speech) اور روح دونوں یکجا اور ہم آہنگ ہو جاتے ہیں (اوم تمام تقریروں کا جوہر یا ملخص ہے)۔ منہ سے الفاظ پیدا ہونے کی پہلی جگہ گلا اور آخری جگہ ہونٹ ہیں۔ ان تین حرفوں میں سے پہلا' الف ہے جو گلے سے نکلتا ہے اور اسے ادا کرنے کے لیے پورا منہ کھولنا پڑتا ہے۔ ''واؤ'' منہ کی ساری ہوا کر استعمال کر ڈالتی ہے اور اس کی ادائیگی کے لیے گلا بند کر لینا ہوتا ہے۔ لیکن ''میم'' ادا کرنے سے ہونٹ سل جاتے ہیں۔ اور پورا لفظ تمام

جگھوں پر غالب آجاتا ہے۔ چھندوگیہ اپنیشد 1:1)

اب اس ساری بات پر غور فرمایئے۔ ''اوم'' ساری تقریر کا جوہر یا خلاصہ ہے۔ دنیا میں وہ کونسا پیغمبر ہے جس نے ایسا دعویٰ کیا ہے؟ کس کی تعلیمات تمام وحیوں کا خلاصہ ہے۔ رَسُوْلٌ مِنَ اللّٰهِ يَتْلُوْ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھتا ہے جس میں مستحکم آیتیں لکھی ہوئی ہیں.....سورۃ البینۃ آیات 2-3) جو تمام تقریروں اور خدائی وحیوں کا جوہر ہے' وہ جس پر خدائی تقریر کے لب بند ہو جاتے ہیں درحقیقت وہی ہے جو سب تقریروں کا خلاصہ ہے۔

(2) نزع کے وقت ''اوم'' پر ذہن مرتکز کرنے سے ذاتِ کبریا کے بارے میں سب کچھ سامنے آجاتا ہے۔ اس کا ''الف'' اسے دنیا بھر کی بھلائیاں عطا کرتا ہے ''واؤ'' گنبدِ افلاک کی طرف متوجہ کرتی ہے' مگر ''میم'' پر توجہ دینے سے نجات عطا ہوتی ہے۔ (پراشن اُپنیشد 1:5' 27)۔ رگ وید اس دنیا کے فوائد عطا کرتا ہے یجروید جگہ دیتا ہے لیکن ''اوم'' اور ساوید کے ''سام منتر'' (نظمیں) خدا کے ساتھ بندے کا تعلق جوڑتے ہیں۔

(3) ''الف'' اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ خدا کی وحی کا آغاز پہلے انسان ''آدم'' سے ہوا۔ ''واؤ'' نے اسے جاری رکھا اور ''میم'' پر اس کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس سارے راز کا تعلق ''میم'' سے ہے۔ ''اوم'' کے ''میم'' سے مراد وہ شخص ہے جس کا نام ''م'' سے شروع ہوتا ہے۔

''اوم'' کے اندر چھپا ہوا دوسرا راز جو پہلے راز کی تصدیق کرتا ہے اور بڑی عمدگی سے مغز یا گری (Kernel) کو اس کے خول (shell) سے الگ کرتا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب آکر باہم متحد ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ مذہبی کتابوں کے مخصوص طرز تحریر کے مطابق ''اوم'' میں صرف دو حروف ہیں۔ ''الف'' اور ''میم''۔ اور سنسکرت کی لغت کے مطابق یہ دونوں حروف اپنے اندر بھرپور معنی رکھتے ہیں۔ سنسکرت انگلش کی معتبر ترین ڈکشنری ''مونیئر ولیمز'' کی مانی جاتی ہے جو 1899 میں آکسفورڈ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے مطابق ''او'' (O) عشائے ربانی کی تقریب میں خطاب یا تقریر کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ''میم'' اس شخصیت کا نام ہے جس کا آغاز حرف ''م'' سے ہوتا ہے۔

سنسکرت کی مذہبی تعلیمات میں ''ما'' یعنی ''م'' کے دس مختلف معنی اور مفہوم ہیں :۔

(1) وہ شخص جس کا نام حرف ''م'' سے شروع ہو۔

(2) چاند

(3) متعدد دیوتاؤں کے نام

(4) اقتدار

(5) روشنی (نور)

(6) علم

(7) سب کو اکٹھا کرنا۔

(8) زنجیر میں باندھنا

(9) خوشی

(10) سب کی بھلائی سلامتی اور کامیابی

ہندوؤں کے عام عقیدے کے مطابق' ہندو تثلیث برہما' وشنو اور شیوا' پر مشتمل ہے ان میں سے کوئی بھی نام ''م'' سے شروع نہیں ہوتا۔ ان کے بعد تین بڑے دیوتا' اگنی اندرا سوریا اور وسو دیوا' آتے ہیں' یہ بھی ''م'' سے خالی ہیں۔ ان کے بعد دو اوتار آتے ہیں کرشن اور رامچندر ان کے ناموں کے شروع میں بھی ''م'' نہیں ہے۔ اب سچ کو چھپانا اور حقیقت کا ذکر نہ کرنا گناہ ہوگا۔ یہ نام' محمدؐ ہے' جو ''م'' سے شروع ہوتا ہے جن پر وحی آتی تھی اور (اپنشد کے مطابق) انہی پر آکر ختم ہوگئی۔

عارفانہ لفظ ''اوم'' کا تیسرا راز یہ ہے کہ لغتوں نے اس کو جتنے معنی پہنائے ہیں' وہ سب کے سب' نام محمدؐ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً اس کے دوسرے معنی ''چاند'' کے دیئے گئے ہیں اور ساری دنیا جانتی ہے کہ چاند اور ستارے مسلمانوں کے مذہب کی علامت ہیں۔ جن کا کیلنڈر قمری (Lunar) ہے۔ جبکہ عیسائیوں اور ہندوؤں کے کیلنڈروں کا یہ نہیں ہے۔ پھر ایک تیسری دلیل یہ ہے کہ ''ادم'' کی تحریری علامت' چاند اور ستارے اس کی طرف اتنا واضح طور پر اشارہ کرتے ہیں کہ پڑھے لکھے ہندوؤں اور پنڈتوں کو اس پر بے حد سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ ہندومت' ایک ''دھرم'' ہے جس نے اپنے شدید دشمنوں کی

طرف بھی صلح کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ مہاتما بدھ نے ویدوں کا سختی سے انکار کیا ہے اور برہمنوں کو مسترد کر دیا ہے لیکن ہندوؤں نے انہیں قبول کرتے ہوئے خدا کی تجسیم (INCARNATION) مان لیا ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے ہندوؤں کے ویدوں، رشیوں اور منیوں کے بارے میں کبھی نفرت یا تحقیر کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس کے برعکس آپؐ نے اپنی امت کو تمام سچے پیغمبروں اور رشیوں کا احترام کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ یہ علامات جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، کوئی اتفاقی یا حادثاتی نہیں ہیں بلکہ مدتوں پہلے سے ہمارے ہاں موجود ہیں۔ ایمانداری اور سچائی پر یقین رکھنے والوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اس عظیم حقیقت پر سنجیدگی سے غور کریں۔ صداقت ایسی چیز نہیں جو کسی کے ماننے کی محتاج ہو، وہ بالآخر اپنے آپ کو منوا کر رہتی ہے اور حتمی جیت اسی کی ہوتی ہے۔

یہ عظیم صداقت کئی پہلوؤں سے سامنے آتی ہے، مونیئر ولیم نے جو انگلش کا پروفیسر اور سنسکرت کا مسلمہ عالم ہے، اپنی لغت "سنسکرت انگلش ڈکشنری مطبوعہ آکسفورڈ 1899" میں لکھتا ہے کہ "M" (م) اس شخص کا نام ہے جو "م" سے شروع ہوتا ہے۔ فاضل لغت نویس نے جو کہ مذہباً مسلمان نہیں ہے، یہ معنی سنسکرت کی کتابوں میں سے اخذ کیے ہیں۔ لیکن ہندو پنڈت ایک انگریز کے دیئے ہوئے حوالہ کو قبول نہیں کریں گے۔ لہٰذا یہاں اس کی حمایت میں چند اقتباسات سنسکرت کی کتابوں میں سے دیئے جا رہے ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے: نجات کے لیے "م" ہی کی ضرورت ہے۔ "م" تیسرا بلند آسمان ہے اور "م" ایک عظیم ہستی ہے۔ وجود باری تعالیٰ کے بارے میں علم "م" کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ "م" ناف کی طرح ایک مرکز ہے جہاں سے سب اطراف تک رسائی ہوتی ہے۔ اس سے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ سب اوصاف اسی ہستی میں پائی جاتی ہیں جس کا نام "م" سے شروع ہوتا ہے۔

مونیئر ولیم نے مختلف دیوتاؤں کے ناموں کے حوالے سے بھی "م" کی ایک تعبیر پیش کی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں خدا جیسی صفات ہوں گی رگ وید کا بیان یہ ہے کہ "تمام دیوتا اس کی ذات کے اندر مجتمع ہوں گے" جو مونیئر کی تعبیر کی تائید اور توثیق ہے۔ اپنیشدوں کی تعبیر بھی یہی ہے۔ وہ دنیا بھر کے پیغمبروں کی تصدیق کرتا ہے اور تمام انبیاء اس کی

تصدیق کرتے ہیں۔ ''م'' کے چوتھے معنی حاکمِ مجاز یا سند کے ہیں۔ یعنی وہ مذاہب کی سند ہے' جتنے مذاہب اس سے پہلے ہوئے خواہ مشرق میں تھے یا مغرب میں' وہ ان پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے یعنی اس نے ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیدیا ہے۔

''م'' کے پانچویں معنی' روشنی کے ہیں۔ اس معنی کے حوالہ سے قرآن مجید میں یہ آیت آئی ہے۔ قَدْ جَاءَ کُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْر وَّکِتَاب مُّبِیْن۔ ''(تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ گئی ہے اور ایک روشن کتاب سورۃ المآئدہ آیت 15)۔ یہاں روشنی سے مراد نبی اکرمؐ ہیں اور کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔ نبی ایک عظیم روحانی روشنی ہے جو پورے روئے زمین کو منور کر رہی ہے۔ ''م'' کے چھٹے معنی ''بندھن'' یا ''لزوم'' کے ہیں۔ آپؐ نے تمام مذاہب کے اندر باہمی اختلافات اور نزاع کو ختم کرانے کے لیے سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے' اور متحد ہونے کی دعوت دے کر خدا کے ساتھ مشترک رشتے اور عالمی اخوت میں منسلک کر دیا ہے۔

''م'' کے ساتویں معنی ''باندھنے'' کے ہیں' یعنی آپؐ نے ڈوری یا زنجیر نے دنیا بھر کے انسانوں کو توحیدِ باری تعالیٰ پر عقیدے کی ڈوری یا زنجیر کے ذریعہ آپس میں متحد کر دیا ہے۔ آپ کی آمد سے پہلے دنیا کی تمام اقوام الگ الگ اور منتشر تھیں۔ جو انبیاء آپؐ سے پہلے آئے وہ اپنی اپنی قوم کی طرف آئے اور ان کے لیے قومی سطح کا مذہب لائے لیکن نبی کریمؐ نے انہیں آپس میں اخوت کے رشتے میں باندھ دیا جیسا کہ قرآن میں آتا ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعاً وَّلَاتَفَرَّقُوْا (سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو' سورۃ آل عمران آیت 103) اور انبیاء کے بارے میں قرآن کا ارشاد یہ ہے۔ اِنَّ ھٰذِہٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْنِ (یہ تمہاری اُمت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس تم میری ہی عبادت کرو......سورہ الانبیاء' آیت 92)۔ حضرت محمدؐ کی آمد سے پہلے دنیا کے تمام مذاہب تباہی کے کنارے پر کھڑے تھے۔ آپؐ نے انہیں پیچھے کھینچا اور انہیں باہمی ہمدردی کی قوت سے باندھ دیا۔

''م'' کے آخری معنی سب کی بھلائی اور سب کی سلامتی ہے یعنی ''م'' ایسی شخصیت کے نام کا پہلا حرف ہے جو پوری نسل انسانی کی بہبود کے لیے متفکر رہتا ہو۔ اور حضرت محمدؐ کے

سوا' ایسا کوئی بھی انسان نہیں ملتا جس نے دنیا بھر کے انسانوں کے لیے اپنی نیندیں حرام کی ہوں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب سب لوگ راتوں کو آرام کی نیند سو رہے ہوتے تھے تو نبی اکرمؐ تن تنہا' رات کے اندھیروں میں بیٹھے بنی نوع انسان کے گناہوں اور ان کی ایک دوسرے پر زیادتیوں پر کڑھ رہے ہوتے اور رو رو کر ان کی مغفرت کے لیے دعائیں مانگ رہے ہوتے تھے۔ جس پر قرآن مجید میں یہ آیت اتری ۔لَعَلَّکَ بٰخِعٌ نَّفْسَکَ اَلاَّ یَکُوْنُوْا مُئومِنِیْنَ۔(اے نبیؐ' شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے.....سورۃ الشعرآ' آیت 3)۔ ''م'' کے ان تمام معنوں پر غور کیجئے جو سنسکرت کی مذہبی کتابوں سے معلوم ہوتے ہیں' تو یہ اس دنیا کے صرف ایک ہی شخص پر منطبق ہوتے ہیں اور سچائی کے ہر شیدائی اور علم کے ہر طلب گار کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس ہستی پر ایمان کا اظہار کرے جس کا نام نامی حضرت محمد مصطفٰے ہے اور وہی ''اوم'' ہیں۔ ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم کہیں گے کہ ''اوم'' کا ''م'' اس امر کی طرف واضح اشارے دیتا ہے:

(1) اس سے مراد وہ شخص ہے جس کے نام کا پہلا حرف ''م'' یا ''ما'' ہوگا۔

(2) اس کے مذہب کی علامت چاند اور ستارہ ہوگا۔

(3) اس کا کیلنڈر (تقویم) قمری ہوگا۔

(4) اس میں خدائی صفات کی جھلک ہوگی اور مزاج فرشتوں جیسا ہوگا

(5) وہ ایک روشنی ہوگا اور ایک روشن کتاب کا حامل ہوگا۔ اس کے دلائل بھی بڑے واضح اور روشن ہوں گے جن سے اس کی صداقت کی توثیق ہوتی ہوگی وہ شکوک و شبہات اور بے یقینی کے اندھیروں کا پردہ چاک کر دے گا۔ اس کی کتاب کی یہ خصوصیت ہوگی۔''ذٰالِکَ الْکِتَابُ لاَرَیْبَ فِیہِ' ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ''(یہ اللہ کی کتاب ہے' اس میں کوئی شک نہیں' یہ ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں.....سورۃ البقرہ آیت 2)

(6) وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کے برحق ہونے کا اعلان کرے گا' خواہ وہ ہندو رشی ہوں' پارسی' یا بدھ ہوں' اسرائیل کے انبیاء ہوں یا مصری معلّم ہوں' وہ ان سب پر ایمان لانے کو فرض قرار دیدے گا یعنی: وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ

مِنْ قَبْلِكَ (اور جو کتاب تم پر نازل ہوئی ہے اور جو کتابیں تم سے پہلے پیغمبروں پر نازل ہوئی ہیں' ان سب پر ایمان لاتے ہیں.....سورۃ البقرہ آیت 4)

(7) وہ کتاب یہ دعویٰ بھی کرے گی کہ اس کے اندر پہلے صحیفوں میں شامل باتیں بھی موجود ہیں' اور اس نے سابق انبیاء کی باتیں بھی' ان میں سے کھوٹ اور آمیزش نکالنے کے بعد اپنے اندر محفوظ کر لی ہیں۔(سورۃ البَیِّنَۃ آیات 2'3)

(8) اس کتاب کے ہوتے ہوئے کسی رشی یا دنیا کے سچے نبی کی تردید یا انکار کرنا ناممکن ہوگا

(9) اسے کسی ایک قوم بنی اسرائیل' یا آریاؤں یا منگولوں کے بارے میں فکر اور پریشانی نہیں تھی بلکہ وہ پوری نسل انسانی کی بخشش کے لیے متفکر تھا اور راتوں کو جاگ جاگ کر ان کے لئے دعائیں مانگتا رہتا تھا کیونکہ اسے رَحْمَةً لِّلعالِمِیْن بنا کر بھیجا گیا تھا۔

یہودیت اور عیسائیت میں ''م'' کا مطلب

ہندوؤں' بدھوں' یہودیوں اور عیسائیوں کے مذاہب میں ایک دوسرے سے ہزاروں اور لاکھوں اختلافات ہیں' یعنی وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں مگر ''م'' کے عظیم الشان حرف پر وہ سب ایک دوسرے سے متفق ہیں کہ یہ ''م'' محمد کا ''م'' ہے جبکہ اس مبارک نام میں یہ تین بار آتا ہے۔(مَ ح مّ مَ د......محمدؐ جس حرف پر ''شد'' ہو اسے دو دفعہ ادا کرنا پڑتا ہے' اس لیے اسے انگریزی میں لکھتے وقت ڈبل ایم ''mm'' لکھتے ہیں)۔جس طرح ہندوؤں اور بدھوں میں ''اوم'' بہت عظیم اور بہت اہم سمجھا جاتا ہے' اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں کے عارفانہ کلمات ہیں......''مرنتھا'' (Marantha)' ''الفا اینڈ اومیگا'' (Alpha and Omega) اور ''ایمت'' (Emet)۔تمام انبیائے کرام نے حضرت محمدؐ کی آمد کے بارے میں پیشگوئیاں کی تھیں' یہ پیشگوئیاں اتنی واضح اور اعلانیہ تھیں کہ ان کا انکار یا ان پر ناپسندیدگی کا اظہار چمکتے ہوئے سورج کے وجود اور روز روشن کو نہ ماننے کے مترادف ہے۔حضرت عیسیٰؑ کے بعد جوں جوں نبی اکرمؐ کی بعثت کا زمانہ قریب آ رہا تھا تمام مذاہب کے پیروکاروں میں ''ہستیٔ موعود'' کے ظہور کا شدت سے انتظار ہو رہا تھا۔حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیروکاروں اور شاگردوں کو یتیمی کی حالت میں چھوڑ دیا تھا۔اس دولہا کو عین اپنی شادی کے دن ''صلیب'' کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔اور باراتی بھاگ کر مختلف سمتوں میں بکھر گئے اور جس کو جہاں جگہ ملی وہیں چھپ گیا۔ان کے آنسو پونچھنے والا اور ڈھارس بندھانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔تاہم بادمخالف کے جھکڑ سچائی کی ٹمٹماتی ہوئی شمع کو نہ بجھا سکے۔ان کے اندر رفتہ رفتہ ایمان و یقین بحال ہو گیا جو حضرت عیسیٰؑ کی پیشگوئی کے عین مطابق تھا۔انہوں نے اپنے بعد ایک اور ''سچائی کی روح'' (Spirit of Truth) کی پیشگوئی کی تھی ہم اس نقطے پر فارقلیط (Paraclete) پر بحث کے

دوران روشنی ڈالیں گے فی الحال ہم حضرت عیسیٰؑ کے بعد کے حالات کا ذکر کریں گے۔

جب بھی دو عیسائی آپس میں ملتے' وہ سلام کہنے کی بجائے ''مارانتھا'' کہتے۔ یہ نہ صرف سلام تھا بلکہ ایک مذہبی پیغام کا تبادلہ بھی تھا۔ یہ میل ملاقات ہی میں نہیں مذہبی تقریبات میں بھی اکثر دوہرایا جاتا۔ مثلاً شراب پیتے اور روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے بھی اونچی آواز ''مارانتھا'' کہا جاتا۔ جب وہ رات کے اندھیرے میں نماز کے لیے یا کسی دکھ اور مصیبت سے چھٹکارے کے لیے اجتماعی دعا کے سلسلے میں آتے تو اسے ''شب مارانتھا'' کہا جاتا۔ اس سے ان میں ہمت بندھتی اور جوش و خروش پیدا ہوتا رہتا تھا۔ اسے امید اور کامیابی کی نوید قرار دیدیا گیا۔ رفتہ رفتہ ایسا ہو گیا کہ اگر ان کی زندگی میں کوئی مرکزی نقطہ تھا تو ''مرانتھا'' کا نعرہ تھا اور شامیں' اسی نعرے سے گونجا کرتیں۔ اگر کوئی آدمی بے توجہی یا بے خیالی میں بیٹھا ہوا ہوتو یہ نعرہ کان میں پڑتے ہی مستعد ہو کر بیٹھ جاتا اور اس کے چہرے پر امید اور بشاشت جھلکنے لگتی۔ گھروں میں' کلیساؤں میں' گلیوں اور بازاروں میں فضا مرانتھا کے نعروں سے گونجتی رہتی۔ جب کوئی عیسائی اپنے عیسائی بھائی کو خط لکھتا تو اوپر سلام و دعا کی بجائے ''مرانتھا'' کے الفاظ لکھنا کافی سمجھتا تھا۔

مرانتھا کیا ہے؟

قدیم مصنفین کا ایک گروہ 'امرنتھا'' کو ایک ہی لفظ مانتا ہے اور دوسرا گروہ اسے دو الگ الگ لفظوں ''مران'' اور ''اتھا'' کا مجموعہ کہتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا بائیبلیکا اور ہیسٹنگز ڈکشنری آف بائیبل نے اس اختلاف پر کافی لمبی چوڑی بحث کی ہے مگر بے سود کوئی کام کی بات پلے نہیں پڑتی۔ عہدنامۂ جدید میں پال کی طرف سے کرنتھیوں کے نام جو دو خطوط شامل ہیں' ان میں اس پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلے خط میں لکھا گیا ہے: ''جو کوئی یسوع مسیح کو عزیز نہیں رکھتا' وہ ملعون مرانتھا ہو''۔ مرانتھا کے معنی یہ کئے گئے ہیں ''ہمارا خدا آرہا ہے۔'' لیکن یہودیوں کے ہاں یہ لفظ لعنت اور بددعا کے طور پر بولا جاتا ہے۔ مذمت کے لیے اس سے زیادہ سخت کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس لیے شارحین کو پال کے مندرجہ بالا خط کی تعبیر کرنے میں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر اس معمے کو حل کرنے کے لیے اس خط کا جواب تلاش کیا گیا جس کی روشنی میں

بیان کیا گیا کہ پال کا مقصد یہ تھا کہ جو شخص یسوع مسیح سے محبت نہیں کرتا وہ سخت ترین مذمت کا مستحق ہے اور دعا کی گئی ہے کہ خداوند جلدی آ کر اس پر اپنی لعنت نازل کرے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے ساتھ ابتدائی صدیوں میں انتہائی بے رحمانہ سلوک ہوتا رہا ہے اور بطور ایک کمیونٹی بھی انہیں بے شمار مصائب جھیلنے پڑے۔ یسوع مسیح نے جس حالت میں انہیں چھوڑا وہ بے حد پریشان کن تھی ان پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے گئے جن کا ذکر آتے ہی انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آخر ایمان اور استقامت ہی ان کا سہارا بنی' مرانتھا کے الفاظ ادا کرتے اور سنتے ہی ان کے دلوں میں امید کی لہر دوڑ جاتی کہ ایک اور ''مسیحا'' عنقریب آ رہا ہے' وہ آ کر ظالموں کو سخت سزائیں دے گا اور اپنا انکار کرنے والوں کو ان کے انکار پر بھی لعنت و ملامت کرے گا۔ ''ایک اور مسیحا'' کے الفاظ انجیل میں آئی ہوئی پیشگوئی کی تعبیر ہیں جو سینٹ جان نے کی ہے۔ یوحنا کی انجیل کے مطابق وہ آنے والا' صحیح معنوں میں انصاف کرے گا۔ اور منکرین حق کو سزا دینے کے علاوہ مظلوموں کی داد رسی بھی کرے گا۔ اس دور کے عیسائی اس خوشخبری پر کھل اٹھے' ان کے دلوں میں نئی امنگ پیدا ہو گئی' ''مرانتھا'' کا نعرہ سنتے ہی ان پر امیدوں کے دروازے کھل جاتے اور اس سے وابستہ تصورات ان کو ہر دکھ فراموش کرا دیتے تھے۔ لیکن آنے والے کا انتظار کرتے کرتے وہ تھک گئے اور امید کے چراغ کی لو کم ہوتی چلی گئی۔ یہ دلہنیں اس امید پر بیٹھی رہیں کہ دولہا' ہاتھ میں مشعلیں پکڑے ہوئے آئیں گے جب رات کا زیادہ حصہ گزر گیا تو وہ مایوسیوں کا شکار ہو گئیں۔ مگر یہ بات واضح طور پر سمجھ لی جانی چاہئے کہ ''مرانتھا'' کا وعدہ پورا ہو کر رہا۔ آنے والا' پھر آ ہی آ گیا' اس نے یسوع مسیح کے دشمنوں کو ملامت کیا اور سزا بھی دی۔

یہ پیشگوئی نہ صرف یسوع مسیح نے کی بلکہ یہ اس زمانے سے کی جا رہی ہے جب سے دنیا وجود میں آئی ہے۔ ہر پیغمبر اپنی امت کے سامنے اسے دہراتا رہا ہے۔ حنوک (ENOCH) جسے مسلمان ادریسؑ کہتے ہیں' وہ آدمؑ کے بعد ساتویں نسل کے عظیم پیغمبر تھے یہ پیشگوئی (اعلان) انہوں نے بھی کی تھی' ہم ذیل میں ان کے الفاظ دوہرا رہے ہیں:

''ان کے بارے میں حنوک نے بھی' جو آدم کی ساتویں پشت میں سے تھا' یہ پیشگوئی کی تھی کہ دیکھو' خداوند اپنے لاکھوں مقدسوں کے ساتھ آیا' تاکہ سب

آدمیوں کا انصاف کرے اور سب بے دینوں کو ان کی بے دینی کے سب کاموں کے سبب سے، جو انہوں نے کیے ہیں اور ان سب ناگوار باتوں کے سبب سے، جو بے دین گنہگاروں نے اس کی مخالفت میں کہی ہیں قصوروار ٹھہرائے۔" (یہوداہ کا عام خط، 14، 15)

حضرت ادریسؑ (یا حنوکؑ) نے واضح طور پر کہا تھا کہ خداوند دس ہزار قدسیوں کے ہمراہ آیا، یا آئے گا۔ اور دوسری طرف یہ تاریخ کا ناقابل تردید واقعہ ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حضرت محمدؐ کے ہمراہ ان کے دس ہزار صحابہ تھے اور اس امر کا ثبوت بھی تاریخ ہی دیتی ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر بت پرست اپنی ساری کوششیں بروئے کار لانے کے باوجود شکست کھا گئے اور قعرِ مذلت میں گر گئے۔ اس طرح انکارِ حق کرنے والوں کے ساتھ پورا انصاف ہو گیا۔

حضرت ادریس کے بعد یہ پیشگوئی حضرت موسیٰؑ نے ان الفاظ میں دوہرائی:

"اور مردِ خدا، موسیٰ نے جو دعا دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت دی، وہ یہ ہے اور اس نے کہا: خداوند سینا سے آیا، اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا، وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں قدسیوں کے ہمراہ آیا، اس کے دائیں ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی"

اس موضوع پر مزید بحث "حضرت موسیٰؑ کی پیشگوئیاں" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کا مذکورہ پیشگوئی، اپنی وفات سے ذرا پہلے کرنا، اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد یہی پیشگوئی "ملاکی" (MALACHI) میں کی گئی ہے جو انبیائے اسرائیل کی کتابوں میں سے آخری کتاب ہے۔ اس میں بھی کہا گیا کہ آنے والا مسیحا وہی ہے جس کا وعدہ ابراہیمؑ سے کیا گیا تھا اور وہ مختون (CIRCUMCISED) نبی ہوگا۔ حضرت مسیحؑ نے بھی اس دنیا سے رخصتی کے وقت اس کی آمد کی خوشخبری سنائی تھی۔ حنوک یا ادریس کی یہ پیشگوئی عہد نامہ جدید کی آخری سے پہلے والی کتاب "یہوداہ کا عام خط" میں دوہرائی گئی اور "یوحنا عارف کا مکاشفہ" کے آخری حصے میں بھی اس کا اعادہ کیا گیا۔ اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ حضرت محمد ﷺ حنوک یا ادریسؑ سے شروع ہونے والی، اور بعد ازاں بار بار دوہرائی جانے والی پیشگوئی کے مصداق اور اس کی کہانی کے اوّل و آخر (Alpha and omega) ہیں۔

''مرانتھا'' کی حقیقی اہمیت

اب ہم ''مرانتھا'' کے معنوں کے حوالہ سے یہودی اور عیسائی سکالرز کے بارے میں چند معروضات پیش کرتے ہیں۔ یہ لفظ ''دو اجزا'' اور بعض لوگوں کے مطابق ''تین اجزا'' کا مرکب ہے۔ اس پر اتفاق کرنے کے بعد ان کے درمیان اس کے اجزائے ترکیبی پر اختلاف پیدا ہو گیا۔ یہ قدیم لغتوں کی زبان میں لکھا جاتا ہے' اس کے اجزا ہیں ''مران-1-تھا'' اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

''ہمارا خداوند آرہا ہے۔ فیصلہ صادر کرنے کے لیے''۔ اس تعبیر کی تصدیق و توثیق انجیل کے معیاری ترجمہ سے ہوتی ہے۔ دیگر لغتوں نے اپنے اپنے انداز میں اس کی تعبیر کی ہے' اس طرح مرانتھا کی تین تعبیریں سامنے آئی ہیں۔

(1) خداوند آگیا ہے

(2) ہمارا خداوند آرہا ہے

(3) ہمارے خداوند آجایئے۔

بعض سکالروں کا کہنا ہے کہ ''مرانتھا'' نہ آرامی زبان کا لفظ ہے' نہ عبرانی اور نہ یونانی۔ بلکہ یہ ایک سریانی اصطلاح ہے اور اسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔

''مرانتھا'' کی اہمیت کے بارے میں تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ عیسائیت کی ابتدائی صدیوں میں یہ اصطلاح' ایک گھریلو لفظ تھی۔ شہروں' گلیوں' بازاروں' گھروں اور کلیساؤں میں دن کی تقریبات ہوں یا رات کی' جہاں بھی ''مرانتھا'' کا نعرہ لگتا' تو اتنے زور سے لگایا جاتا کہ درودیوار گونج اٹھتے تھے۔ ساری فضا مرتعش ہو جایا کرتی تھی۔ اس سے اس عقیدے کا بھرپور اظہار ہوتا ہے کہ خداوند بڑی جلدی یسوع مسیح اور عیسائیوں کے دشمنوں سے انتقام لینے آرہا ہے' وہ ظالموں اور مظلوموں کے مابین اپنا فیصلہ سنائے گا' اور وہ اب پہلے کی طرح بے بس' دوستوں سے محروم اور کمزور نہیں ہوگا' بلکہ اسے آسمانوں کی قوت ملی ہوئی ہو گی اس کے ہمراہ فرشتوں کی ایک فوج ہو گی جو اس کے دشمنوں کا قلع قمع کر دے گی۔

لیکن دوسری طرف یہودیوں کے نزدیک ''مرانتھا'' ایک بددعائیہ نعرہ یا اصطلاح

تھی۔ مصریوں' ایرانیوں اور بابل والوں نے خدا کے ''چنیدہ لوگوں'' بنی اسرائیل سے بے حد بدسلوکی اور بے رحمی کا رویہ اپنایا تھا' لہٰذا خداوند کی آمد محض رحمت و شفقت ہی نہ ہو گی' کیونکہ ان کے نزدیک خداوند خدا' قہر اور غضب بھی نازل کر سکتا تھا' وہ جب آئے گا تو یہودیوں کے دشمنوں سے بھی انتقام لے گا۔ کافی عرصہ انتظار کے بعد بھی خدا نہ آیا تو لوگ مایوس ہونے لگے اور ہوتے ہوتے اس مایوسی نے ساری فضا سوگوار کر دی۔ وہ آقا یا خدا آیا تو ضرور مگر ایک مقررہ وقت پر آیا۔ جبکہ کنواریاں دولہوں کا انتظار کرتے کرتے اس وقت تک اونگھتے اونگھتے گہری نیند میں جا چکی تھیں۔ اور دروازے بند ہو جانے کی وجہ سے خدا' ان دولہوں کو گھروں کے اندر نہ پہنچا سکا۔

''مرانتھا'' کی حقیقی اور سچی ساخت ''م۔آرا۔نتھا'' ہے' جس کے معنی ''عظیم موعود 'م' آرہا ہے'' اس لیے اب خالی خولی نعرے لگانا بیکار ہے' اور یہودیوں اور عیسائیوں کو ''مسیح موعودؑ'' پر جو محمدؐ ہیں ایمان لے آنا چاہئے۔ اور الٰہی کے گرد جمع ہو جانا چاہئے۔ کیونکہ تمام مذاہب عالم (بشمول سلیمانؑ کی طرف سے ان کا نام بھی ''محمدم'' بتا دیا گیا ہے) نے ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ انہیں اسی پر غور کر لینا چاہئے کہ حضرت محمدؐ نے حضرت عیسیٰؑ سے ظلم و زیادتی کرنے والوں کو کتنی سختی سے ملامت کیا ہے اور ان پر مظالم ڈھانے والے یہودیوں کو سزا دینے کا کتنا اہتمام کیا اور ساتھ ہی ان کا تزکیہ بھی کیا جس کی وجہ سے بے شمار یہودی آپؐ کی صداقت پر ایمان لے آئے تھے۔ آپؐ نے انبیائے اسرئیل کی کتنی تعریفیں کی ہیں' اگر یہودی اپنے تعصّبات سے بالاتر ہو کر مصر' ایران' شام' بابل اور دیگر مسلم ممالک کے گلی کوچوں کا چکر لگائیں اور مساجد سے آنے والی اس آواز پر کان دھریں:

''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحمدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمّدٍ کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْراھِیمَ وعلٰی آلِ ابراھیم''۔

(اے اللہ حضرت محمد اور ان کے پیروکاروں پر رحمت کر جیسے تو نے حضرت ابراہیم اور ان کے پیروکاروں پر رحمت کی)

یہود کو غور کرنا چاہئے کہ وہ کون لوگ ہیں جو حضرت محمدؐ کے لیے خدا سے رحمت کی دعا کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد' اسحاقؑ' یعقوبؑ' موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے لیے بھی

بلند مرتبوں کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں' اور یہ کام کبھی کبھار' ہفتے یا مہینے یا سال میں ایک دو بار نہیں بلکہ ایک دن میں پانچ نمازیں پڑھتے ہوئے بار بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں؟ مسلمان دنیا بھر کے تمام انبیاء خواہ وہ کسی قوم میں کسی زمانے میں بھی مبعوث ہوئے سب کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو پہلے یہودیوں اور ان کے مذہب کے کٹر دشمن ہوا کرتے تھے لیکن اس ہستی پر ایمان لانے کے بعد جس کا اسم مبارک ''م'' سے شروع ہوتا ہے' وہ یہود کے انبیاء سمیت تمام نبیوں کے لیے دعا گو بن گئے ہیں۔ یہ عظیم ہستی حضرت محمدؐ ہے جن کے اسم مبارک میں ''م'' تین بار آتا ہے جبکہ (i) برھما (ii) ابراہام (iii) گوتم بدھ ایک ایک ''م'' ہے۔ مبارک ہے وہ شخص جو اس عظیم ترین ''م'' سے محبت کرتا ہے' جس کے بارے میں میں تمام انبیائے سابق پیشگوئیاں کر چکے ہیں۔

عیسائیت کا ''الفا اینڈ اومیگا'':

جس طرح ہندو اور بدھ ''اوم'' سے زبردست عقیدت رکھتے ہیں اسی طرح عیسائیوں کو بھی ''مرانتھا'' سے کبھی کبھی ایسی ہی عقیدت ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح ''الفا اینڈ اومیگا'' عیسائیوں کا ایک اور ''راز'' ہے۔ اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ اپنشدوں کے مطابق ''اوم'' تین حرفوں 1' و' م'' کو جوڑنے سے ادا ہوتا ہے' ''1'' کہتے ہوئے گلا کھلتا ہے' آواز آگے کو چلتی ہے ''و'' منہ کے نصف حصے میں پوری ہوا بھرنے سے ادا کی جاتی ہے اور منہ کھلا بھی ہوتا ہے کہ ''م'' کہنے کے لیے ہونٹ بند ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک ''الفا اینڈ اومیگا'' کا معاملہ ہے ''الفا'' یونانی حروف تہجی کا پہلا حرف ہے اور ''اومیگا'' آخری حرف ہے' جو سلسلہ حروف کے خاتمے کی نشانی ہے۔ اس لیے ان دو حروف کو اوّل و آخر'' کہا جاتا ہے۔ کسی کام کی ابتدا اور انتہا کو بھی اس لیے اس کا ''الفا اینڈ اومیگا'' کہہ دیا جاتا ہے۔ یہودی روایات میں ''اوّل و آخر'' خدا کی صفات میں سے ہیں لیکن عیسائیوں کے ہاں ''یوحنا عارف کے مکاشفہ'' کے مطابق ''الفا اینڈ اومیگا'' حضرت عیسیٰؑ کو کہا جاتا ہے۔ (مکاشفہ 13:22) مگر اسی کتاب میں یہ دو صفات خداوند خدا کی بھی بتائی گئی ہیں۔ (مکاشفہ 8:1؛ 6:21)۔ لیکن اناجیل اربعہ (متیٰ' مرقس' لوقا اور یوحنا) میں اس الفا اینڈ اومیگا کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ

جب تک حضرت مسیح اس دنیا میں رہے انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ وہ الفا اینڈ اومیگا ہیں' یا وہ اس کا آغاز بھی ہیں اوراس کا اختتام بھی۔ وہ کہتے بھی تو کیسے کہتے؟ وہ یونانی زبان تو نہیں بولتے تھے۔ اور ''یوحنا عارف کا مکاشفہ'' نامی انجیل ان کے سو سال بعد لکھی گئی تھی۔ یعنی حضرت مسیح زندگی بھر اتنی اہم بات بتانا بھولے رہے اور''یوحنا عارف کے مکاشفات'' سے کام لینا پڑا۔ لیکن اصل بات کچھ اور ہے۔ جن ریسرچ سکالرز نے انجیل کے عہد نامہ جدید کا تحقیقی نظر سے مطالعہ کیا ہے انہوں نے یہ کہنے کے لیے خود کو مجبور پایا کہ یہ ''کتاب مکاشفات'' اسی سینٹ جان (یوحنا) کی لکھی ہوئی نہیں ہے جو حضرت عیسیٰؑ کا شاگرد تھا' اسے تو یہودیوں نے سن عیسوی کے 70ویں سال قتل کر دیا تھا۔ اور یہ ''مکاشفات'' نامی کتاب یہودیوں کی ایک مذہبی تصنیف کی اشاعت مکرر (Reproduction) ہے جس کی تصدیق کیتھولک سائیکلو پیڈیا نے کی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

> ''یہ کتاب ناقدانِ عہد نامہ جدید کی رائے کے مطابق کسی یہودی تصنیف سے ماخوذ ہے اس کے ایک فقرہ (جس میں الفا اور اومیگا کا ذکر ہے) کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ ساری کتاب ابتداءً عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی''

چنانچہ عبرانی سے یونانی زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے آیت نمبر 5 کا آیت نمبر 6 سے ربط بالکل ٹوٹ گیا۔ عبرانی میں ''الفا اینڈ اومیگا'' کی بجائے اصل حروف ''الف۔ میم۔ تا'' یعنی ''اِمِتْ'' آتے ہیں' جن میں سے ''الف'' عبرانی رسم الخط کا پہلا حرفِ تہجی ہے اور ''ت'' یا ''تاؤ'' آخری ہے اور ''میم'' یا (م) وسطی حرف ہے۔ جس طرح ہم اردو میں کسی معاملے کا الف سے لے کر ''ی'' تک کہتے ہیں اور انگریزی میں ''A'' سے ''Z'' تک کہا جاتا ہے۔ اسے یہودی ''امیت'' کہتے ہیں۔ لیکن ایک اور زاویئے سے دیکھا جائے تو ''امیت'' بے معنی اصطلاح نہیں تھی اس کے معنی ہوتے ہیں ''سچائی''۔ اسی بنا پر یہودی اس لفظ کو برکت اور بھلائی کے معنوں میں بولتے ہیں۔ خدا کے وجود کو ''از ازل تا ابد'' (From eternity to eternity) کہا جائے یا حروف تہجی کے پہلے حرف سے آخری حرف تک سے تشبیہہ دی جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ عیسائی بھی اس تشبیہہ کو پسند کرتے ہیں لیکن وہ اسے یہودی

معبد سے اپنا کلیسا تک لے جاتے ہوئے اس کی صحت کا پوری طرح خیال نہ رکھ سکے' عبرانی شکل میں اس کے اندر جو حسن و نفاست پائی جاتی تھی وہ یونانی زبان میں پہنچ کر بالکل ہی زائل ہو گئی۔ اور وہ ''الفا'' اور ''اومیگا'' اور ''امیت'' کے درمیان کوئی ربط پیدا نہ کر سکے۔ لیکن یہودیوں کو بھی اس الزام سے بری نہیں سمجھا جا سکتا۔ خداوند خدا کو حروف تہجی کے پہلے اور آخری حرف سے مشابہ قرار دینے سے ایک متلاشیِ حق کو اس راہ پر ڈالنا ہے کہ خدا کا ایک آغاز ہے اور ایک اس کا انجام بھی ہے۔ اس مشابہت کی وجہ سے عیسائی شارحین کو ایک نازک ترین صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور وہ یوں کہ یسوع مسیح کو الفا اور اومیگا کہتے ہیں تو اگر وہ خداوند خدا ہے تو اسے اول و آخر کہنا اس کی ازلیت (EVERLASTINGNESS) کے منافی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ابتدا اور انتہا دونوں موجود ہیں۔ اور قرآن کہتا ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِیسٰی عِندَاللّٰهِ کَمَثَلِ آدَمَ ؕ خَلَقَه' مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَه' کُنْ فَیَکُوْن۔ (عیسیٰ کا حال خدا کے نزدیک آدم کا سا ہے کہ اس نے (پہلے) مٹی سے ان کا قالب بنایا پھر فرمایا کہ (انسان) ہو جا وہ (انسان) ہو گئے۔ سورۃ آل عمران آیت 59) اس طرح حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا ایک دن تھا (قرآن کی زبان میں ''ہو جا اور وہ ہو گیا'') اور ان کا یومِ وفات لازماً کوئی تھا۔ اگر وہ مٹی سے بنائے گئے خواہ بطن مریم سے ہی کیوں نہ پیدا ہوئے ہوں' ان کا موت سے ہمکنار ہونا یقینی تھا۔ کیونکہ جو کوئی پیدا ہوتا ہے وہ موت کا ذائقہ بھی ضرور چکھتا ہے۔

یہودیوں کا ''امت'' اور عیسائیوں کا عقیدہ

یہودی مذہبی تحریروں میں ''اَمِت'' (EMET) کو خدائی کی مہر (SEAL OF GOD) خدا کہا گیا ہے مگر خدا کی مہر کیا ہے؟...... نبی ''دانی ایل''......''دانیال'' کے مطابق یہ ''سچائی کی کتاب'' ہے (ڈینیل 21:10)۔ اس سلسلے میں ہم یہاں ایک اسرائیلی روایت بیان کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ عبادت گاہ کے چند راست باز افراد نے خداوند سے عاجزانہ دعا مانگی کہ وہ تمام برائیوں اور گناہوں کی اصل جڑ' شیطان کو دنیا سے بالکل نکال دے۔ اس پر آسمان کی طرف سے ان کی جانب ایک خوبصورت غلاف میں لپٹی ہوئی ایک

کتاب آئی جس کے اوپر ''سچائی'' کا لفظ لکھا ہوا تھا۔ ابھی وہ حیرت سے اسے دیکھ ہی رہے تھے کہ عبادت گاہ سے آگ سے بنا ہوا ایک شیر چھلانگ لگا کر باہر نکلا اور بھاگ گیا۔ یہ دراصل بت پرستی اور شرک تھا جو اس دعا کی تاثیر سے زمین سے چلا گیا۔ ''کیتھولک سائیکلوپیڈیا'' کے مصنف چارلس ہرمن نے زیر عنوان ''الفا اینڈ اومیگا'' لکھا ہے کہ اس روحانی واقعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ''خدا کی مہر'' سے مراد ''حق اور صداقت'' کی مہر ہے۔

لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ''سچائی کی کتاب'' قرآن مجید ہے جس کی کئی آیتوں میں سچائی کی وضاحت کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 81 میں آتا ہے ''وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا''۔ (اور اعلان کر دو کہ ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا' باطل تو مٹنے ہی والا ہے)۔ اور پھر ایسا ہو کر ہی رہا۔ جب فتح مکہ کے بعد آپ کعبہ میں داخل ہوئے تو آپ چھڑی سے ہر بت پر ضرب لگاتے اور ساتھ یہی آیت اپنی زبان مبارک سے پڑھتے تھے۔ ''اور اعلان کر دو کہ حق آ گیا ہے اور باطل مٹ گیا ہے''

اللہ تعالیٰ نے نبی دانیال (دانی ایل) سے جو وعدہ کیا تھا وہ بھی یقیناً پورا ہوا' بت گری اور ان کی پرستش کا سلسلہ رک گیا اور بت پرست بھی بھاگ گئے مگر جس طرح کعبہ میں بت شکنی ہوئی اور وہاں سے بتوں کا پرانا ٹھکانہ ختم ہوا اس کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے۔ بت مکہ کے کعبے سے ہی رخصت نہیں ہوئے بلکہ پورے جزیرہ نمائے عرب سے ان کا صفایا ہو گیا۔

نبی اکرمؐ کی آمد: حضرت عیسیٰ کی پیشنگوئی

حضرت عیسیٰ کی آمد سے پہلے بنی اسرائیل میں پیشینگوئیوں کا بڑا چرچا تھا۔ یہ قوم جو حضرت سلیمانؑ کے بعد بہت بُرے حالات کا شکار ہو چکی تھی' اپنے اقتدار کی بحالی کے لیے تڑپ رہی تھی اور ایک ایسے بادشاہ کی آمد کا انتظار کر رہی تھی جو ان کی نکبت و افلاس اور غلامی کی زنجیریں کاٹ کر ان کی گمشدہ بادشاہت اور اقتدار واپس دلا سکتا ہو۔ اسی وجہ سے مسیحی مبلغین حضرت عیسیٰ کو یہودیوں کے بادشاہ کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ لیکن ان کی امیدیں اور تمنائیں نہ لفظی طور پر پوری ہوئیں اور نہ معنوی لحاظ سے پوری ہوسکیں۔ اس کے باوجود اناجیل کے مصنفین یہودیوں کے ہاں پائی جانے والی پیشگوئیوں کو حضرت عیسیٰ پر چسپاں کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ یہ پیشگوئیاں نہ تو یسوع کے بارے میں تھیں اور نہ یسوع نے کبھی دعویٰ کیا کہ وہ انہیں پورا کرنے کے لیے دنیا میں آئے ہیں۔

درحقیقت یہ پیشگوئیاں یا خوشخبریاں جس ہستی کے بارے میں تھیں وہ حضرت محمدؐ تھے' ہم یہ بات نہایت مضبوط اور ناقابل شکست شہادتوں کے ذریعہ ثابت کریں گے۔ اور بتائیں گے کہ حضرت عیسیٰ تو خود ایک عظیم عالمی نبی کی آمد کی خوشخبری سنا رہے تھے جس کا نام احمد تھا۔ یہ خوش خبری انہوں نے کئی مواقع پر سنائی تھی۔ لیکن مصنفین اناجیل' حضرت مسیحؑ کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ کو حذف کرتے رہے یا ان کا مفہوم یکسر تبدیل کر دیتے رہے۔ نیقیائی یا ناسین کونسل (COUNCIL OF NICENE) کا وہ اقدام یقیناً مجرمانہ تھا جس کے ذریعہ اس نے اناجیل کے یونانی قلمی نسخوں کی توثیق کر کے آرامی (Aramaic) یا شامی زبان میں لکھی ہوئی اناجیل کو نذر آتش کر دیا' یہی زبان تھی جو حضرت عیسیٰ بولتے تھے۔ یہ کونسل آریانزمنزم کی مزاحمت کے لیے قائم ہوئی تھی اور اس نے 325 عیسوی میں اپنا اجلاس منعقد کر

کے عیسائی عقائد کا اعلان کیا جو بعد میں نظر ثانی کے بعد رومن کیتھولک اور بیشتر پروٹسٹنٹ عقائد کے کلیساؤں میں تسلیم کر لیا گیا۔

یہ یونانی نسخے' اصلی انجیل کا ترجمہ نہیں لیکن اب انہیں ہی ''اصل'' انجیل کہا جانے لگا ہے۔ اس لیے اصلی انجیل یا اس کا ترجمہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے تحقیق میں کافی مشکلات پیش آئی ہیں' اس کے باوجود اہل دانش نے روایات کی مدد سے پیشگوئی کی اہمیت واضح کر دی ہے۔ یہ پیش گوئی واقعی ایک قسم کے معجزے کی حیثیت رکھتی ہے۔

اصل عمانویل کون ہے؟

انجیل میں پہلی پیشگوئی جو حضرت عیسیٰؑ پر چسپاں کی گئی ہے یسعیاہ (ISAIAH) کی پیشگوئی ہے۔ اس کے بارے میں متی (MATTHEW) لکھتا ہے:۔

''وہ ان باتوں کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ خداوند کے فرشتہ نے اسے خواب میں دکھائی دے کر کہا' اے یوسف ابن داؤد اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر' کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے' اس کے ہاں ایک بیٹا ہوگا اور تو اس کا نام یسوع رکھنا' کیونکہ وہی اپنے لوگوں کو ان کے گناہوں سے نجات دے گا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ خداوند نے جو کچھ اپنے نبی کی معرفت کہا تھا وہ پورا ہو کہ:

دیکھو ایک کنواری کو حمل ٹھہرے گا' اور وہ ایک بیٹے کو جنم دے گی اور اس کا نام عمانویل رکھیں گے''......متی کی انجیل باب 1: آیات 20 تا 23)۔

متی نے یہ پیشگوئی کتاب یسعیاہ سے نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

''دیکھو ایک کنواری کو حمل قرار پائے گا اور وہ ایک بچے کو جنم دے گی اور اس کا نام عمانویل رکھیں گے''

انجیل متی ہمیں بتاتی ہے کہ مریم یوسف کی بیوی تھی۔ اور وہ اسے گھر نہیں لانا چاہتا تھا' یا اسے گھر لانا' ناپسندیدہ کام سمجھتا تھا۔ چنانچہ خواب میں اسے ایک فرشتہ دکھائی دیا جس نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو گھر لانے سے نہ ڈرے۔ اور یہ کہ اس کے بطن میں جو کچھ

ہے روح القدس کی قدرت سے ہوا ہے۔ وہ ایک بیٹے کو جنم دے گی اور یوسف اس کا نام یسوع رکھے گا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ لوگوں کو گناہوں سے بچائے گا۔ اور جو کچھ ہوا وہ خداوند نے اس پیغمبر کے منہ سے کہلوایا۔ اس لیے وہ پورا ہو کر رہے گا۔

متی کے مندرجہ بالا اقتباسات پڑھنے کے بعد چند سوالات پوچھنا ضروری ہو گیا ہے:۔

(1) متی کو یہ کس نے بتایا کہ یوسف کو پتہ چل چکا تھا کہ اس بیوی حاملہ ہے۔ حالانکہ یہ معاملہ یوسف کی نجی زندگی سے تعلق رکھتا تھا؟۔

(2) مریم کہاں رہتی تھی' یوسف کے گھر کے گھر میں یا اور کہیں؟ اگر وہ یوسف کے گھر میں رہتی تھی تو فرشتے کے ان الفاظ کے کیا معنی ہیں: اسے گھر لانے سے نہ گھبراؤ؟

(3) اگر وہ کسی اور کے گھر میں رہتی تھی تو یوسف کو کیسے پتہ چلا کہ اس کے بطن میں بچہ ہے؟

(4) ''ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے مریم کے پاس بچہ تھا''۔ (.....تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس سے حاملہ پائی گئی.....متی 18:1)۔ اسے بچے کے ساتھ کس نے پایا؟ لوگوں نے پایا' یا مریم نے اس خود انکشاف کیا؟ کیا فرشتے نے یوسف کو مطلع کیا کہ اس کی بیوی حاملہ ہو چکی ہے؟

(5) یوسف کی پریشانی کیسے دور ہوئی اور اسے کیسے اطمینان آ گیا' کیا محض فرشتے کے کہنے سے کہ وہ روح القدس سے حاملہ پا گئی ہے؟ کیونکہ فرشتے نے تو کوئی دلیل پیش نہیں کی تھی۔ اور جب تک پہلے سے ایسی نظیر نہ پائی جاتی ہو کہ عورتیں' مرد کے بغیر بھی حاملہ ہو سکتی ہیں تو خاوند اور اس کہانی کے راوی حضرات کیسے مطمئن ہو گئے؟

(6) ''مریم یوسف کی بیوی تھی'' جیسا کہ فرشتے کی بات سے اس کی تصدیق ہوتی اور یوسف خدا کے کہنے کے مطابق داؤد کا بیٹا تھا۔ لیکن یسوع تو درحقیقت نہ داؤد کا بیٹا تھا اور نہ خداوند کا۔ وہ روح القدس کا بیٹا تھا جو کہ عیسائیوں کی ''تثلیث'' کا

''تیسرا'' رکن ہے۔ (متی 20:1) اور پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ داؤد کے تخت کا وارث قرار پا جائے؟ ایک مفلس اور قلاش یوسف کا وارث' سلیمان کے تخت پر بیٹھنے کے خواب کیوں دیکھنے لگا؟

(7) فرشتے نے یوسف کے خواب میں آ کر اسے بیوی کو گھر لانے سے نہ ڈرنے کی تلقین کر کے ایک غلطی کا ارتکاب کیا' کیونکہ اگر یوسف اسے چھوڑ دیتا جیسا کہ وہ کرنا چاہتا تھا' تو سب لوگوں کو خود ہی پتہ چل جاتا کہ یسوع صرف مریم کا' بیٹا ہے یعنی بن باپ کے ہے' لہٰذا خداوند کا بیٹا ہے۔

(8) غلطی درحقیقت' خداوند نے' جو کہ باپ تھا' کی تھی۔ اسے تو یوسف اور مریم کو منگنی کرنے سے پہلے' بذریعہ فرشتہ منع کر دینا چاہئے تھا کہ وہ منگنی کر کے اس بڑے سکینڈل کا خطرہ مول نہ لیں۔ اس طرح ایک ''شرمناک واقعہ'' رونما نہ ہوتا اور یہ بات واضح طور پر سامنے آ جاتی کہ ایک بچہ بن باپ پیدا ہو گیا ہے۔

(9) منگنی کی وجہ سے ایک اور بڑا فائدہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ اس طرح کہ یوسف تو بلاشبہ داؤد کا بیٹا تھا' اب جو بچہ پیدا ہونے والا تھا اسے داؤد کے تخت کا وارث بننا تھا۔ اگر منگنی نہ ہوئی ہوتی تو پیدا ہونے والا بچہ براہ راست خداوند کا بیٹا ہونے کی بنا پر خدا کی پوری بادشاہت کا وارث کہلا سکتا تھا۔

(10) خدا جو پوری کائنات کا مالک و آقا ہے اسے یوسف یا مریم کے خواب میں فرشتہ نہیں بھیجنا چاہئے تھا بلکہ ایک فرشتہ آسمان سے بلند آواز سے اعلان کرتا کہ ''یہ خداوند کا پیارا بیٹا ہے'' اس آواز کو ساری دنیا اپنے کانوں سے سن لیتی۔

(11) لیکن اس میں افسوس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس آواز کو سوائے تین افراد' متی' مرقس اور لوقا کے' کوئی بھی نہیں سن سکا اور انہوں نے بھی ٹھیک سے اسے نہیں سنا۔ کیونکہ ان میں سے ایک کا بیان یہ ہے:

''اور آسمان سے ایک آواز آئی ''یہ میرا پیارا بیٹا ہے' میں اس سے بہت خوش ہوں''

دوسرا یہ شہادت دیتا ہے:

''تم میرے پیارے بیٹے ہو جس سے میں بہت خوش ہوں''

چونکہ یہ ایک فاختہ کی آواز تھی جسے ایک نے ایک طرح سمجھا اور دوسرے نے اس کا دوسری طرح کا مطلب لیا۔ اگر یہ انسانی آواز ہوتی تو سب اسے ایک ہی طرح سن لیتے۔

(12) علاوہ اس حقیقت کے' کہ انجیل کے ان دو مصنفوں میں باہمی اختلاف پایا جاتا ہے' یسعیاہ کے کہے ہوئے الفاظ یہ ہیں:

''لیکن خداوند آپ تم کو ایک نشان بخشے گا' دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا پیدا ہوگا اور وہ اس کا نام عمانوئیل رکھے گی''

(یسعیاہ 14:7)

(13) متی نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ یسوع خداوند کا بیٹا ہے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے اس کا پاؤں ایک دلدل میں پھنس گیا ہے۔ اگر یسوع ایک کنواری کا بیٹا ہے تو وہ داؤد کا بیٹا نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ ہی اس کے تخت کا وارث ہو سکتا ہے۔ جس شخص کا باپ نہیں' وہ داؤد کا بھی بیٹا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر یسوع درحقیقت داؤد کے سلسلہ نسب اور نسل سے ہے تو وہ کسی بھی صورت میں کنواری ماں کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں بیانات ایک دوسرے کے بالکل برعکس اور متصادم ہیں کہ وہ کنواری کا بیٹا تھا اور داؤد کا بھی بیٹا تھا۔ فرضی (Theoretical) باپ اور قیاسی (speculative) بیٹا (خواہ وہ یوسف کا ہے یا خدا کا) حقیقی بیٹا نہیں ہو سکتا۔ نقلی اور جعلی بیٹا' کسی باپ کا وارث نہیں بن سکتا۔

(14) پیشگوئیوں میں کہا گیا تھا کہ داؤد کے تخت کا وارث' داؤد کے اوصاف کا حامل ہوگا۔ جب سلیمان کا بیٹا' باوجود اس حقیقت کے' کہ وہ سلیمان کا بیٹا تھا' اس کے تخت کا وارث نہ بن سکا۔ اس کا نتیجہ اس طرح نکلا کہ اس کی ساری بادشاہی اور عظمت ختم ہوگئی۔

داؤد کا بیٹا بننا اور اس کے تخت کا وارث بننا' یہ ثابت کرتا ہے کہ بادشاہت اور حکمرانی بھی' ایک آبائی وراثت ہے جو باپ سے بیٹے کو منتقل ہو سکتی ہے' یہ تصور ہی جمہوریت

کے منافی ہے۔ اس نظام کے تحت بھی ضروری تھا کہ داؤد کے تخت پر بیٹھنے کے لیے وہ داؤد کے خصائل یا اس جیسے خصائل کا حامل ہوتا۔ محض فرضی بیٹا ہونے کی وجہ سے ''وراثت'' منتقل نہیں ہو سکتی تھی۔

(15) ان پیشگوئیوں پر بحث کرتے ہوئے جیسا پیچھے بتایا گیا ہے کہ داؤد دوسری بار آکر خدا کے ان وعدوں کا وارث بن جائے گا جو اس کی زندگی میں پورے نہیں ہو سکے تھے۔ لیکن اس کی دوبارہ آمد سے مراد اس کے بیٹے کی آمد نہیں ہے بلکہ خود یسوع کی پیشگوئی کے مطابق ایلیاہ کی دوبارہ آمد کا مطلب اُس کی قوت و عزیمت کے ایک اور شخص کی آمد ہے اور داؤد کی دوبارہ آمد سے مراد یہ بھی ہے کہ اس کی سی قوت اور جذبے کا حامل شخص ظاہر ہوگا۔ اس کا ثبوت یہ ہوگا کہ وہ داؤد کے تخت اور اس کی حکمرانی کے علاقے پر قابض ہو جائے گا۔ یہ بادشاہت' حضرت سلیمانؑ کے بعد کس کو ملی' یہ حضرت محمدؐ کو عطا ہوئی اور اسلام کا پرچم سارے بیت المقدس' یعنی شہر یروشلم پر لہرانے لگا۔

(16) یہ واقعہ کہ' یسوع کے داؤد کا ''بیٹا'' بن جانے کے باوجود' داؤد کے تخت کا وارث نہ بن سکا' اس امر کا واضح اور قطعی ثبوت ہے کہ ان کا توارث (Genealogy) جعلی اور من گھڑت تیار کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں داؤد کا بیٹا ہونا' کنواری ماں کا بیٹا ہونا نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ داؤد نے اپنا تخت وراثت میں نہیں پایا تھا' اس کا باپ بادشاہ نہیں تھا۔ اس لحاظ سے بھی کہ حضرت محمدؐ نے جو داؤد کی طرح قوت و عزیمت کے مالک تھے داؤد ہی کی طرح' وراثت میں بادشاہی اور حکمرانی نہیں پائی تھی اور انہوں نے اپنی قوت اور خدا کی تائید سے بادشاہت قائم کر لی تھی۔

(17) متی میں جو پیشگوئی کی گئی تھی' اس میں کہا گیا تھا کہ پیدا ہونے والے کا نام ''خدا ہمارے ساتھ ہے'' ہوگا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ خداوند تعالیٰ پر یقین و ایمان نبی اکرمؐ کی تعلیمات کا مرکزی نقطہ ہے' آپ اسی سے مدد مانگتے' اور اسی کی وحدانیت پر ایمان کا سبق دیتے رہے۔ قرآن کے صفحات اور آپؐ کی ذاتی زندگی کے واقعات

اس کے گواہ ہیں کہ آپ جاگتے سوتے' اٹھتے بیٹھتے' ہر حال میں خواہ دکھ ہو یا سکھ امن ہو یا لڑائی کا میدان خود کو خدا کے سامنے پاتے تھے' آپ کی زبان پر اللہ ہی کا نام رہتا تھا اور اللہ ہی کی حمد وثنا میں مصروف رہتے تھے' آپؐ کسی بھی لحہ اس کی یاد سے غافل نہیں ہوئے۔ دن میں پانچ نمازوں' بے شمار نوافل اور آدھی رات کے تہجد آپ کا ہمیشہ کا معمول رہا' خدا کی ذات پر بھروسہ اور ہر دم حضوری' دنیا کے دیگر انبیاء سے آپ کا خصوصی امتیاز تھا' بہ الفاظ دیگر "خدا ہمارے ساتھ ہے" آپؐ اس کی عملی صورت تھے۔

(18) آگے دیکھیے......"اللہ ہمارے ساتھ ہے" (اِنَ اللّٰهَ مَعَنَا) کا اس وقت بھی بھرپور مظاہرہ ہوا' جب حضرت محمدؐ اپنی زندگی کے نازک ترین لحات میں گزر رہے تھے اور موت آپ کے سامنے کھڑی تھی' آپؐ نے وہی الفاظ دوہرائے جو یسعیاہ نبی نے 1300 سال پہلے اپنی پیشنگوئی میں کہے تھے' یہ الفاظ (ان اللّٰه مَعَنا) کسی عام دل گردے کے آدمی کی زبان سے نہیں نکل سکتے تھے۔ مکہ کے طاقتور سرداروں نے مل بیٹھ کر آپؐ پر یکبارگی حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تاکہ قتل کا الزام کسی ایک قبیلے پر نہ آئے' وہ آپ کے گھر کا محاصرہ کئے کھڑے تھے' مگر خداوند کریم ورحیم نے (جو اس وقت بھی آپ کے ساتھ تھا) آپ کو ان بدباطن دشمنوں کی نیت سے مطلع فرمادیا' اور آپ کو ان خون کے پیاسوں کے نرغے سے محفوظ وسلامت کھینچ لیا۔

"خدا کے ساتھ ہونے" کا ایک اور بڑا مظاہرہ بھی ہونے والا تھا۔ آپؐ اپنے وفادار ترین اور غمگسار ترین دوست ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ شب کی تاریکی میں نکل آئے اور ایک غار میں پناہ لے لی۔ خون کے پیاسے' آپ کے قدموں کے نشانات دیکھتے دیکھتے' اپنی چمکتی تلواروں سمیت غار کے دہانے پر آ کھڑے ہوئے' ابوبکر کو غار کے اندر ہی سے ان کے پاؤں نظر آ گئے اور اپنے کانوں سے ان کی یہ بات سنی......"وہ یقیناً اسی غار میں ہے" انہوں نے رسول خدا کو مطلع کیا' "وہ یہاں بھی آپہنچے" مگر آپؐ نے پورے اعتماد سے فرمایا "لاتحزن' اِنَ اللّٰهَ مَعَنَا" (ڈریئے نہیں' خدا ہمارے ساتھ ہے.....قرآن مجید 40:IX) ۔ آپؐ نے کتنے

یقین کامل سے یہ الفاظ کہے تھے!! یسعیاہ کی زبان سے تیرہ سو سال پہلے نکلے ہوئے یہ الفاظ جو فضا میں اتنا عرصہ مرتعش رہے تھے' خدا کے عرش سے ٹکرانے کے بعد صدائے بازگشت کی طرح' نبی اکرمؐ کے دل کے فوارے میں پہنچ کر ان پر سکینت طاری کر کے ان کے لبوں سے ادا ہوئے اور ابوبکر صدیق کے کانوں سے ہوتے ہوئے ان کے دل پر پہنچ گئے اور انہیں بھی مطمئن اور شاد کر دیا۔

(19) اگر ابوبکر صدیقؓ کا خوف اپنی جان کے لیے ہوتا تو ان کا غار سے نکل کر' اپنے آقا کو دغا دے کر بچ جانا' اور جان بخشی کرا لینا کوئی مشکل کام نہ تھا مگر یہ وفا کا پتلا اور پاک طینت ساتھی تو اپنے آقا کی سلامتی کے لیے متفکر تھا' اسے اپنی جان کی کوئی فکر نہ تھی (دوسری طرف ہمیں ''یہودا اسکروتی'' ملتا ہے جس نے حضرت عیسیٰؑ کی مخبری کر دی تھی اور ان کے تمام شاگرد فرار ہو گئے تھے جبکہ پطرس نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنے استاد کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کر دیئے تھے۔)

نبی اکرمؐ نے دشمنوں کو غار کے پاس پا کر' ''اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا'' (خدا ہمارے ساتھ ہے) کہا تھا' ''اِنَّ اللّٰہَ مَعِیَ'' (خدا میرے ساتھ ہے) نہیں کہا تھا' یہ ''نا'' جمع کا صیغہ ہے یعنی وہ ''ہم دونوں کے ساتھ ہے'' کہا تھا۔ آپؐ نے یہ الفاظ جھجکتے ہوئے' یا تھراتی ہوئی زبان سے ادا نہیں کئے تھے بلکہ پورے وثوق اور دل جمعی کے ساتھ کہے تھے۔ خطرے کو سامنے پا کر زبان سے ٹوٹے ہوئے الفاظ برآمد ہونا' کوئی تعجب کی بات نہیں مگر اس ایمان و یقین کی گہرائی کو کون ناپ سکتا ہے جس کی قوت سے آپ نے بے حد سکون کے ساتھ' اپنی زبان مبارک سے یہ ادا کئے تھے۔

(20) عام حالات میں یہ کہنا بھی کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ ''میں اور باپ' ایک ہیں'' یا ''زمین اور آسمان کی ساری طاقت مجھے دے دی گئی ہے'' (یوحنا کی انجیل 30:10' 22:17' 35:3' 30:13۔ متی کی انجیل 18:28) لیکن پہاڑی کے وعظ اور صلیب کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ منبر پر کھڑے ہو کر' جہاں جان کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا' جو بات کہی جا سکتی ہے' وہ صلیب پر کہنا بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس نے ''صلیب'' پر منبر پر کہی گئی بات (میں اور باپ ایک ہیں' یا ساری طاقت

مجھے دیدی گئی ہے) کی بجائے انتہائی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''میرے خدا تو مجھے اکیلا کیوں چھوڑ دیا ہے''۔ (''ایلی' ایلی لما شبقتنی''......متی 46:27 اور ''الوہی الوہی لما شبقتنی''......34:15) کہا۔ متی اور مرقس نے یہ آخری الفاظ ایک دوسرے سے مختلف انداز میں سنے)۔ ہم بطور مسلمان یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتے کہ خدا حضرت عیسیٰ کے ساتھ نہیں تھا' البتہ مصنفین اناجیل کے قلم کے خلاف احتجاج ضرور کریں گے کہ انہوں نے ایک نبی کی اس طرح توہین کیوں کی؟ انہیں صلیب تک کیسے پہنچایا اور ان سے یہ الفاظ کیوں منسوب کیے۔ یسوع کے بارہ منتخب شاگرد نہ صرف اس نازک موقع پر فرار ہو گئے بلکہ بعد میں انہوں نے اپنی تحریروں میں دشمنانِ یسوع کی رپورٹیں شامل کر دیں' وہ خود تو وہاں تھے نہیں اور جو موجود تھے وہ دشمن تھے۔ یہ رپورٹیں انہیں دشمنوں نے ہی تو دی تھیں۔

(21) ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو بھی اپنی حفاظت میں رکھا اور انہیں دشمنوں کے ہاتھ سے چھڑوالیا' خدا' ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ مگر فرق اتنا ہے جتنا کہ ہم ذیل کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں! اگر ایک پہلوان ایک من وزنی گرز اُٹھا کر کہے کہ میں اس سے بتاشے کو توڑ سکتا ہوں' ہم اسے اتنا بھاری گرز اُٹھانے کی قوت کی داد تو دے سکتے ہیں مگر اس سے اس نے جو کام سرانجام دیا' اسے ہم جہالت اور بے وقوفی ہی کہہ سکتے ہیں۔ ایک بتاشے کو معمولی طریقے سے بھی توڑا جاسکتا ہے' اس کے لیے اتنی زیادہ قوت خرچ کرنا' طاقت کا محض ضیاع ہے۔ خداوند تعالیٰ نہ صرف زبردست طاقت رکھتا ہے بلکہ دانش بھی رکھتا ہے۔ وہ کسی کام کے لئے اتنی ہی قوت استعمال کرتا ہے جتنی اس کے لیے درکار ہوتی ہے' وہ اپنی بے پناہ قوت کو بتاشے توڑنے کے لیے حرکت میں نہیں لاتا۔ وہ اپنے پیغمبر کو بچانے کے لیے پہاڑوں پر زلزلہ طاری کر سکتا تھا اور سارے ماحول کو بھونچال میں لاکر دشمنوں کو تتر بتر کر سکتا تھا۔ وہ سب کو اندھا کر سکتا تھا اور اپنے پیغمبر کو اس غار سمیت اٹھا کر آسمان پر بھی لے جاسکتا تھا۔ اس سلسلے میں ہزاروں تجاویز اور بھی ہو سکتی ہیں مگر اس ذات بے ہمتا کا کمال دیکھئے کہ اس نے رسول خدا کے دشمنوں کی

اکٹھی کی ہوئی ساری طاقت کو کمزور ترین ذریعے سے ناکارہ بنا دیا' غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا تان دیا' یا کبوتر کے انڈے دکھا کر انہیں چکر میں ڈال دیا۔ وہ علیم و حکیم ایسا تو نہیں کرتا کہ ایک چوہے کو کھینچ کر باہر نکالنے کے لیے پورے پہاڑ کو کھود ڈالے۔ یا چوہے کی خاطر ایک بڑی دیوار کھڑی کر دے۔ روئے زمین پر پیغمبر خداوند تعالیٰ محبوب ترین ہستی تھی' اس نے اس کی حفاظت کے لیے فولاد کی دیوار تعمیر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ صرف ایک مکڑی کو حکم دیدیا کہ وہ غار کے دھانے پر جلدی سے اپنا تانا بُن دے۔ اور بس' اس سے زیادہ طاقت کے استعمال کی اسے کوئی ضرورت نہیں پڑی:۔

وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے......سورۃ العنکبوت آیت 41)

(22) غار کے دہانے پر مکڑا کا جالا دیکھ کر سردارانِ مکہ میں سے ایک نے کہا' اگر یہاں سے اندر کوئی داخل ہوا ہوتا تو یہ جالا یہاں نہ ہوتا۔ اس کی یہ دلیل بظاہر معقول تھی اس لیے وہ غار کی چوٹی پر سے نیچے اتر گئے۔ مکڑی کے جالے نے دراصل ان کی عقل و فہم پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا۔ اور ساتھ ہی اس کمزور جالے نے اس حقیقت کا منہ بولتا ہوا ثبوت فراہم کر دیا کہ خدا' اپنے نبیؐ اور اس کے رفیقِ غار کے ساتھ تھا' اس طرح مالک الملک نے عملی طور پر بتا دیا کہ ''عمانوئیل'' کی اصطلاح کے معنیٰ ''اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا'' (خدا یقیناً ہمارے ساتھ ہے) ہوتے ہیں۔

(23) نبیؐ نے نہ صرف ایک بار بلکہ متعدد بار اسی قسم کے نازک اور فیصلہ کن لمحات میں ''اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا'' کے الفاظ دوہرائے جو آپؐ کے ''عمانوئیل'' ہونے کا ثبوت ہے۔ اب ہم صرف ایک اور واقعہ دوہرانے پر اکتفا کریں گے۔ جب سردارانِ مکہ آپؐ کو تلاش کرنے میں بری طرح ناکام ہوگئے تو ان کا غیظ و غضب اپنی آخری انتہا کو پہنچ گیا تو انہوں نے آپ کو قتل کر کے آپ کا سر لانے کا' انعام ایک سو اونٹ مقرر کر دیا۔ کھوجیوں کی بڑی تعداد اس خطیر انعام کی لالچ میں ہر طرف پھیل گئی۔

ان کا ایک نہایت مضبوط پہلوان سراقہ ہاتھ میں نیزہ لیے اپنے برق رفتار گھوڑے پر سوار مدینہ کی سمت روانہ ہو گیا۔ آپؐ بھی تین دن اور تین راتیں غار میں قیام کرنے کے بعد مدینہ ہی کی طرف بڑھ رہے تھے کہ سراقہ آ پہنچا۔ حضرت ابوبکرؓ نے خوفزدہ ہو کر' آپ کو توجہ دلائی کہ جاسوس آ پہنچا۔ تو حضورؐ نے اسی یقین و ایمان کے لہجے میں جواب دیا ''اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا''۔ یہاں کسی غار' یا کسی تنے ہوئے پردے کی پناہ گاہ تو نہیں تھی۔ یہ کھلا میدان تھا' نہ کوئی آڑ تھی اور نہ کوئی موڑ تھا۔ جب وہ گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا چند فٹ کے فاصلے پر پہنچا تو گھوڑے کا ایک پاؤں اس طرح الجھا کہ سوار اور سواری' دونوں اوندھے منہ گر پڑے۔ آنحضرتؐ نے ایک ملکوتی تبسم کے ساتھ فرمایا...... ''سراقہ ایک دن آنے والا ہے کہ ایران کے بادشاہ کے سونے کے کنگن تجھے پہنا دیے جائیں گے۔'' وہ اپنے یوں اچانک گر جانے اور جنہیں قتل کرنے آیا تھا' انہیں یوں مطمئن اور متبسم پا کر ششدر رہ گیا اور اسے آپؐ کا معجزہ سمجھ کر فوراً آپؐ پر ایمان لے آیا۔

(24) نبی اکرمؐ کی طرف سے سراقہ کے لیے انعام کا اعلان اسے لالچ دینے کے لیے ہی نہیں تھا۔ بلکہ مسلمان ہو جانے کے بعد وہ' وہ سراقہ نہیں رہا تھا جسے سو اونٹوں کے خطیر انعام نے آپ کا پیچھا کرنے پر اکسا دیا تھا۔ اس انعام کی راہ میں نہ تو کوئی رکاوٹ تھی' نہ دیر۔ اور دوسری طرف نبیؐ کی کیا حالت تھی؟ آپؐ نے انتہائی بے چارگی کے عالم میں مکہ چھوڑا اور تین دن اور تین راتیں تاریک غار میں گزاریں۔ اور پھر خفیہ طریقے سے ایک دوسرے ملک' مدینہ کی طرف جا رہے تھے اب کس کو معلوم تھا کہ مدینے میں آپ کو کیسے حالات پیش آئیں گے؟۔ لیکن اس بے چارگی کے عالم میں بھی آپ کو یقین تھا کہ اس وقت کی سب سے بڑی طاقت ایک وقت آپؐ کی فوجوں سے شکست کھا جائے گی۔ لیکن آپؐ کی فوجیں کہاں تھیں؟ اور وہ بھی اتنی طاقتور کہ سلطنت ایران کو روند سکتی ہوں۔ سراقہ آپ کی بات کو محض ہوا میں محل کھڑے کرنے جیسا تخیل سمجھ سکتا تھا مگر اس نے فوراً یقین کر لیا' اس کا یہ یقین سو اونٹوں کے خطیر انعام کے مقابلے میں بھی بھاری تھا۔ کیونکہ

حالت ایمان نے اس کے اندر زبردست تغیر پیدا کردیا تھا۔ وہ آپؐ کی مسکراتی آنکھوں سے مفتوح ہو چکا تھا اور اسلام کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کو بھی تیار تھا۔

اس زمانے کے حالات کے ظاہری تیور تو یہی بتا رہے تھے کہ سراقہ جیسے آدمی کی بالوں والی کلائیوں میں شاہ فارس کے طلائی کنگن سجنا محض خواب و خیال ہے' اور اس کی شکست کوہ ہمالیہ کی چوٹی سر کرنے کے مترادف ہے مگر خداوند کریم نے برسوں پہلے اپنے پیغمبر کو جو خوشخبری دیدی تھی وہ ایک دن اس نے خود ہی پوری کرنا تھی۔ اس کا انتظام اس نے کیسے کیا اور وہ اپنی کونسی قوتوں کو بروئے کار لایا' یہ اس کی ذات بے ہمتا کو معلوم ہے' مگر تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں فارس کو مسلمان فوجوں نے اپنے گھوڑوں کے سموں تلے کچل دیا' بہت سا مال غنیمت ہاتھ لگا جس میں کسریٰ کے کنگن بھی تھے' حضرت عمرؓ نے حضور اکرمؐ کی پیشگوئی کو پورا کرتے ہوئے وہ کنگن سراقہ کو پہنا دیے۔

سراقہ کو جس دن یہ کنگن پہنائے گئے' اسے یہ خوشخبری دینے والی ہستی اس دنیا میں موجود نہیں تھی۔ مگر آپؐ کے الفاظ فضا میں موجود تھے اور تمام اہل ایمان کو اس کے پورا ہونے کا یقین دلا رہے تھے۔ اپنے نبی کو یہ خوشخبری دینے والے خدا کے لیے انہونی کو ہونی اور ناممکن کو ممکن بنانا کوئی مشکل کام نہ تھا اسی لیے تو اس نے فرمایا ہے:

بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ

(اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تمام موجودات اسی ہیں اور سب کے سب اسی کے مطیع فرمان ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے' اس کے لیے بس یہ حکم دیتا ہے کہ "ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے۔ (سورۃ البقرہ آیات 116' 117)

(25) یہ تاریخی واقعہ رونما ہو جانے کے باوجود بھی اگر کوئی متشکک مزاج شخص یہ کہے کہ سراقہ کو محض ایک چارہ ڈالا گیا تھا' تو اسے یہ سمجھنا چاہیے کہ جب ایک پیشگوئی پوری ہو چکی اور ایران جیسی عظیم الشان سلطنت کو ایسی شکست ہو گئی جس کے لیے پیشگوئی کے وقت کوئی ظاہری آثار نہیں تھے تو اسے لالچ سے تعبیر کرنا محض حماقت اور تعصب کے سوا اور کیا کہا ہو سکتا ہے؟ اور حضرت محمدؐ کی اتنی شاندار فتح کو دیکھ کر بھی انہیں عمانوئیل ماننے میں ذرہ بھر بھی شبہ کرنا بدترین قسم کی سنگدلی اور شقاوت ہے۔

اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ چند ماہی گیر جھیل گلیلی کے ساحل پر کھڑے مچھلیاں پکڑ رہے تھے کہ مسیح ناصری کا اس طرف سے گزر ہوا' انہوں نے ان ماہی گیروں کو نام لے کر پکارا اور انہی روح القدس' یعنی عقیدہ تثلیث کے اسی ''تیسرے رکن'' کے کہے ہوئے الفاظ یہ تھے:

''اور گلیل جھیل کے کنارے کنارے جاتے ہوئے اس نے شمعون اور شمعون کے بھائی اندریاس کو جھیل میں جال ڈالتے ہوئے دیکھا' کیونکہ وہ ماہی گیر تھے۔ اور یسوع نے ان سے کہا' میرے پیچھے چلے آؤ تو میں تم کو آدم گیر بنا دوں گا۔ وہ فی الفور جال چھوڑ کر اس کے پیچھے ہو لئے۔'' (مرقس 1:16-18' متی 4:18؛ لوقا 5:4)

''اس پر پطرس نے جواب میں اس سے کہا' دیکھ ہم تو سب کچھ چھوڑ کر تیرے پیچھے ہو لیے ہیں۔ پس ہم کو کیا ملے گا؟ یسوع نے ان سے کہا' میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو چلے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے'' (متی 19:27' 28)

مسیح ناصری کے ان الفاظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے کون نہیں سمجھتا کہ حکمرانی کا وعدہ انہیں ترغیب اور تحریص دینے کے لیے کیا گیا تھا' جو کبھی پورا نہیں ہو سکا اور ان ماہی گیروں سے ان کی روزی کا ذریعہ بھی چھڑوا دیا گیا۔ وہ اس آقا کے شاگرد بن گئے جس کے الفاظ ان کی سمجھ میں بہت کم آتے تھے۔ تاہم ماہی گیری کے پیشے کا ایک راز ہے۔ روزی کمانے کے جتنے بھی ذرائع ہیں ان میں سے اس کی ایک امتیازی

خصوصیت ہے۔ باقی سب ہنر مندیوں اور فنون کو کچھ نہ کچھ سرمایہ لگانا پڑتا ہے لیکن ایک ماہی گیر کو صرف جال کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ محض ایک چھوٹا سا کیڑا بطور چارہ لگا کر بڑی سے بڑی مچھلی پکڑ سکتا ہے۔ اس پیشے میں کسی علم کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ تربیت درکار ہوتی ہے۔ غالباً اسی بنا پر ''مچھیرے کی ذہنیت'' ایک ضرب المثل بن چکی ہے جس سے یہ معنی لیے جاتے ہیں کہ صرف ذرا سا جھانسہ دے کر زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر لیا جائے۔ اسی بنا پر ماہی گیری کا پیشہ عیسائیت کی تبلیغ سے ایک خصوصی مناسبت رکھتا ہے۔ چنانچہ مسیح ناصری نے (ان تصانیف کے حوالے سے) ان ماہی گیروں کو ہی سادہ لوح لوگوں کا شکار کرنے کے لیے استعمال کیا۔ لیکن جیسا کہ مقدر کے معاملے میں کہا جاتا ہے یہ ماہی گیر اپنی سادگی کی وجہ سے خود شکار ہو گئے بارہ شاگردوں کو وعدے کے مطابق بارہ تخت تو کیا ملتے' انہیں اپنے کپڑے خود بیچنا پڑے اور اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے تلواریں خریدنا پڑیں۔ لیکن ماہی گیروں کو تلوار بازی سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ بالآخر اپنے استاد کو مصیبت میں پھنسا ہوا دیکھ کر وہ سب کے سب بھاگ گئے۔

26: عمانوئیل کی دیگر خوبیاں یا خصوصیات یہ بتائی گئیں: ''وہ دہی اور شہد کھائے گا جب تک کہ وہ نیکی اور بدی کے ردوقبول کے قابل نہ ہو'' (یسعیاہ 15:7)

ان دو بیانات یعنی ''دہی اور شہد کھانا'' اور ''نیکی و بدی میں پہچان کر سکنا'' کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اگر آپ آمرانہ عقائد رکھنے والے اور لفظی معنوں پر ہی اصرار کرنے والے نہیں ہیں تو ان دو بیانات کی اہمیت یہ ہے کہ اسے روحانی شہد دیا جائے گا جس کی بدولت وہ نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ خداوند تعالیٰ نے اپنے الفاظ میں قرآن مجید کو شہد کہا ہے اور اس کی خصوصیات یہ بتائی ہے:۔

''يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ۔

(لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے۔ سورۃ یونس آیت 57)

اور روحانی بیماریاں یہ ہیں کہ انسان نیکی و بدی اور حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے کی اہلیت

نہ رکھتا ہو۔ اس عمانوئیل کو قرآن مجید عطا کیا گیا ہے جو ایک شریعت کاملہ ہے' اسے فرقان بھی کہا جاتا ہے جو نیکی اور بدی کے درمیان فرق واضح کرتا ہے' جبکہ حضرت مسیح کو اچھائی اور برائی کے مابین فرق کرنے والی کوئی کتاب نہیں دی گئی۔ بلکہ ان کے دیئے ہوئے عقیدہ کفارہ نے تو اچھائی اور برائی کے درمیان فرق ہی ملیامیٹ کر دیا ہے۔ کیونکہ اس میں جو درس نجات دیا گیا ہے اس کا دارومدار اعمال پر نہیں بلکہ کفارے کے عقیدے پر ایمان لانے میں مضمر ہے۔

(27) اس کے بعد یسعیاہ کی پیشگوئی میں اس بات کا ذکر آتا ہے کہ دو باشاہتوں کا صفایا کر دیا جائے گا (یسعیاہ 16:7) ہمارے خیال میں یہ اشارہ قیصر اور کسریٰ کی طرف تھا جو دنیا کے طاقتور ترین حکمران تھے۔ آشوریہ اور دمشق بھی ان میں شامل تھے۔ یہ دو سلطنتیں کسی وقت ایران کی بالادستی کے تحت رہتی تھیں اور کسی وقت روم کے زیر تسلط آجاتی تھیں۔ یہ دونوں زمانہ قدیم سے ایک دوسری کی سخت دشمن چلی آرہی تھیں۔ داؤد کی فرمانروائی کا علاقہ بھی ان سلطنتوں میں شامل رہ چکا تھا۔ جس وقت حضرت محمدؐ دنیا میں تشریف لے آئے ایران کی قسمت کا ستارہ عروج کی طرف جارہا تھا۔ اور اس کی فوجیں سلطنت روما کو تباہ کن شکست سے دوچار کر کے میسوپوٹیمیا اور مصر پر قابض ہو چکی تھیں اور اب رومی دارالحکومت قسطنطنیہ کے دروازے تک جا پہنچی تھیں۔ اور سلطنتِ روم کے صفحہ ہستی سے مٹ جانے کا زمانہ زیادہ دور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ وقت حضرت محمدؐ کی ہجرتِ مدینہ سے چھ سات سال پہلے کا تھا۔ ایرانی فوجیں 602 عیسوی سے رومی سلطنت کو اپنے پاؤں تلے روند رہی تھیں۔ 613 اور 614 عیسوی میں انہوں نے ایشیائے کوچک اور شام کو تباہ کرنے کے بعد دمشق اور یروشلم کو بھی فتح کر لیا اور مقدس صلیب کو بطور تحفۂ جنگ (War Trophy) لے گئیں۔ مشرکینِ مکہ اس صورت حال پر اس لیے خوش تھے کہ ایران کے آتش پرستوں کو رومنوں کے مقابلے میں فتح ہوئی ہے جو کہ اہل کتاب تھے اور خدا کے وجود کو مانتے تھے۔ مشرکین اس سے یہ شگون لیتے تھے کہ ایک دن انہیں بھی اسی طرح مسلمانوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ اس سے یہ مطلب بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انہیں خداوند تعالیٰ کے مقابلے میں بتوں کی فتح پر خوشی تھی۔ ان حالات میں پیغمبر خدا' یا ''عمانوئیل موعود'' پر یہ وحی اتری۔

الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ

بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۔

(ا۔ل۔م۔ رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب آجائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہوگا جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے۔ اللہ نصرت عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے.....سورۃ الروم آیات 1-4)

اس خوشخبری کے دو حصے ہیں:

(i) رومی عیسائی اس وقت اگرچہ شکست کھا چکے ہیں لیکن ۹ سال بعد غالب آجائیں گے۔

(ii) مسلمان بھی ایرانیوں پر رومیوں کی فتح کے دن خوشی منائیں گے کیونکہ وہ بھی شرک (خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانا) پر غلبہ حاصل کرلیں گے۔ اگرچہ مشرکین اپنی عددی اکثریت پر فخر کر رہے تھے۔

چنانچہ اس مقررہ وقت پر، یعنی ٹھیک 9 سال بعد رومی فوج، فتح کے شادیانے بجاتی ہوئی ایران کے اندر داخل ہو گئی۔ اور اسی روز مسلمانوں نے بھی میدان بدر میں مشرکین پر فتح حاصل کر لی۔ رومیوں کو فتح 624 عیسوی میں ہوئی تھی۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا نے زیرِ عنوان KhosroesII: لکھا ہے: "624ء میں ہرکولیس شمالی میڈیا میں داخل ہوا، اس نے گوذرک کے عظیم آتشکدے کو تباہ و برباد کردیا"......(اس آتشکدے میں جب سے یہ خود وجود میں آیا تھا، آگ کبھی نہیں بجھنے دی گئی تھی، اس واقعہ کے بعد پہلی بار اس کے شعلے سرد ہو گئے۔)

یہ خونی جنگیں خدا اور بتوں کے مابین یا ان کے ناموں پر لڑی گئیں۔ لیکن "عمانوئیل" کی پیشگوئی نے کہا گیا تھا......"اِنَّ اللّٰهَ مَعَنا اور بتوں کو شکست فاش ہوگی"۔ اور یسعیاہ نبی کے کہے ہوئے الفاظ کتنے صحیح ثابت ہوئے کہ دنیا اس کے وجود کو تسلیم کر لے گی" اور یہ کہ "عمانوئیل، خدا ہمارے ساتھ ہے، کے عقیدے کو منوا دے گا"۔ اور واقعی جس روز سلطنتِ روم نے ایران پر فتح حاصل کی، اسی روز مسلمان میدانِ بدر میں مکہ کے بت پرستوں پر فتح کی خوشی

منار ہے تھے۔ یسعیاہ نبی نے 1200 سال پہلے اس شاندار فتح کا خاکہ یوں کھینچا تھا:۔

''جو لوگ تاریکی میں چلتے تھے' انہوں نے بڑی روشنی دیکھ لی۔ جو موت کے سایہ کے ملک میں رہتے تھے' ان پرنور چمکا' تو نے قوم کو بڑھایا' تو نے ان کی خوشیوں کو دوبالا کیا۔ وہ تیرے حضور میں ایسے خوش ہیں جیسے فصل کاٹتے وقت اور غنیمت کی تقسیم کے وقت لوگ خوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ تو نے ان کے بوجھ کے جوئے' اور ان کے کندھے کے لٹھ اور ان پر ظلم کرنے والے کے عصا کو ایسا توڑا ہے جیسا کہ مدیان' کے روز کیا تھا۔ کیونکہ جنگ میں مسلح افراد کا تمام اسلحہ اور خون آلود کپڑے جلانے کے لیے آگ کا ایندھن بنیں گے۔ اس لیے ہمارے لیے ایک لڑکا تولّد ہوا اور ہم کو ایک بیٹا عطا کیا گیا جس کے کندھے پر سلطنت کی ذمہ داری ہوگی۔ اس کا نام عجیب مشیر' خدائے قادر ابدیت کا باپ اور سلامتی کا شہزادہ ہوگا۔ اس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ وہ داؤد کے تخت اور اس کی مملکت پر آج سے ابد تک حکمراں رہے گا۔ اور عدالت اور صداقت سے اسے قیام بخشے گا اور یہ کام رب الافواج کی قوت اور غیوری سے ہوگا'' ......(یسعیاہ' باب ۹' آیات 2 تا 7)

اس پیشگوئی میں 13' نقاط پائے جاتے ہیں جو سب کے سب ''عمانویل'' کی اصطلاح کی تفسیر ہیں اور نبی اکرمؐ کی ذات پر منطبق ہوتے ہیں' آیئے دیکھتے ہیں۔

(i) جو لوگ اندھیرے میں چلتے تھے انہوں نے بڑی روشنی دیکھ لی۔ ''وَاِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ فِي ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ'' ......سورۃ آل عمران آیت 164

(ii) وہ موت کے سایہ کے ملک میں رہتے تھے۔

(iii) ان پر نور چمک اٹھا۔

(iv) وہ اگرچہ تعداد میں کم تھے' مگر دشمن کو تین گنا تعداد میں نظر آرہے تھے' ان کے لیے یہ تعداد خدا نے بڑھائی تھی۔

(v) ان کی خوشی ان کسانوں کی مانند تھی جو ان پر فصل کی کمائی کے وقت طاری ہوتی ہے۔

(vi) لوگ غزوہ بدر میں کامیابی کے بعد مال غنیمت تقسیم کر رہے تھے اور اس پر انہیں

خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

(vii) ہم میں سے ایک بچہ پیدا ہوگا جس کے کاندھوں پر حکومت کی ذمہ داریاں ہوں گی اس کا نام عجیب (باکمال) مشیر ہوگا۔ وہ قدوس ہوگا۔ دائمی باپ اور امن کا شہزادہ (شہزادۂ اسلام) ہوگا۔

(viii) اس کے دورِ حکمرانی میں ہر طرف امن و سلامتی ہوگی۔

(ix) اس کی کوئی انتہاء نہیں ہوگی۔

(x) وہ تختِ داؤد کا فرمان روا ہوگا۔

(xi) وہ نظم و ضبط قائم کرے گا اور اس کے دوام کا اہتمام کرے گا۔

(xii) وہ ہمیشہ کیلئے عدل و انصاف قائم کرے گا۔

(xiii) اس کا حامی و مددگار اللہ تعالیٰ ہوگا۔

اب ہم صرف ایک اور نقطے کی وضاحت کریں گے اور وہ یہ کہ عمانوئیل کا سب سے بڑا کام یہ نہیں کہ وہ لوگوں کے ذہن میں اپنے بادشاہ ہونے اور ایک خدا کی موجودگی اور اس کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کا صرف تصور پیدا کرے بلکہ یہ ہے کہ وہ دنیا بھر کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں خدائے واحد کی صفات اجاگر کرے، اس کے نظام کی طرف توجہ دلائے، اور نظام کو نافذ بھی کرے۔ آیئے اس پر غزوۂ احزاب کے حوالہ سے غور کرتے ہیں۔

پیغمبر خدا نے مکہ سے ہجرت کرنے کے بعد دور دراز ایک جگہ مدینہ میں پناہ لی تھی۔ لیکن دشمن انہیں وہاں بھی امن سے نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔ واقعۂ ہجرت کے پانچ سال بعد مدینہ کے یہودیوں بنی نضیر اور بنی قریظہ نے مسلمانوں سے کئے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مشرکین مکہ کو مدینہ پر حملے کے لیے اکسایا اور انہیں یقین دلایا کہ وہ جب باہر سے زور دار حملہ کریں گے تو یہودی اندر سے بغاوت کر کے حملہ آوروں کو ہر قسم کی امداد فراہم کریں گے۔ اس طرح یہودیوں نے عرب کے تمام بت پرستوں میں ہلچل پیدا کر دی کہ وہ اپنے بتوں کے سب سے بڑے دشمن مذہب' اسلام کو جو کہ روز بروز قوت پکڑ رہا ہے اپنی

متحدہ طاقت کے ذریعہ بیخ و بن سے اکھاڑ دیں۔ چنانچہ مشرکین عرب نے یہودیوں کے سرگرم تعاون سے 15000 تربیت یافتہ افراد کا لشکر اکٹھا کر لیا جو ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس تھا۔ نبی اکرمؐ کو سراغ رسانوں کے ذریعہ یہ اطلاعات پہنچیں تو آپ دشمنوں کی اتنی بڑی تعداد کے مقابلہ کے لیے بہ مشکل 3000 'افراد اکٹھے کر سکے۔ یہودی غداروں نے عین وقت پر ان میں سے بھی اپنے 700 ' افراد واپس بلا لیے۔ پھر بھی آپؐ کو یقین تھا کہ آپ باقی ماندہ' یعنی 2300 ' کی قلیل تعداد کے ذریعہ 15,000 کا مقابلہ کر لیں گے۔ اس طرح اگرچہ مسلمانوں کا موت کے منہ میں چلے جانے کا معاملہ تھا لیکن آپ نے ہمت نہیں ہاری کیونکہ آپ ''انّ اللّٰہ معَنا'' کے کلمے سے سرشار تھے اور کسی وقت بھی اس احساس سے بیگانہ نہیں ہوتے تھے۔ حملہ آوروں کے مقابلے کی تیاریاں شروع ہو گئیں' مدینہ کے گرد حفاظتی خندق کھودی جانے لگی۔ اسے کھودتے کھودتے ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک ایسا سخت پتھر حائل تھا کہ باوجود کافی کوشش کے' توڑا نہ جا سکا' نبی اکرمؐ کو یہ رپورٹ دی گئی۔ آپؐ نے خود ایک بڑا ہتھوڑا لے کر اس پر ضرب لگائی تو اس میں آگ کا ایک شعلہ نکلا اور پتھر دو ٹکڑے ہو گیا' آپ نے فرمایا'' مجھے کسریٰ کا محل دکھایا گیا ہے''۔ یہ ایک مکاشفے کا نظارہ تھا۔ دوسری ضرب سے ایک اور ٹکڑا الگ ہو گیا۔ اور پھر ایک شعلہ نکلا' آپ نے فرمایا '' مجھے قیصر کے محلات دکھائے گئے ہیں''۔ تیسری ضرب سے پتھر بالکل پاش پاش ہو گیا اور پھر شعلہ نکلا' آپ نے فرمایا' یہ سارے محلات میرے پیروکاروں کے ہاتھ آ جائیں گے۔

قریش اور ان کے اتحادیوں کے 15000 کے لشکر نے مدینہ کے تمام راستے مسدود کر دیئے اور سارے شہر کو گھیرے میں لے لیا۔ دونوں اطراف سے ایک دوسرے پر تیروں کی بارش ہونے لگی۔ فوجی طاقت کے بھرپور مظاہرے شروع ہو گئے۔ محاصرہ ایک ماہ جاری رہا۔ لیکن اس دوران نہ تو دشمن مدینے کے اندر داخل ہو سکا اور نہ مسلمان خندق کو پار کر کے باہر نکل سکے۔ پھر خداوند تعالیٰ نے یہ بات ثابت کر دکھائی کہ وہ کس کے ساتھ ہے۔ ایک رات اچانک اتنے زور کی آندھی چلی کہ دشمن کے سارے خیمے اکھڑ گئے' ان کی طنابیں کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئیں' خیموں میں جو آگ جل رہی تھی بجھتے بجھتے وہ بھی کافی کام دکھا گئی' دشمن اتنا بدحواس ہوا کہ اس کے لیے بھاگنے کے سوائی چارہ نہیں تھا۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ آپؐ کی لحاظ

سے ''عمانوئیل'' تھے۔ یہودی جو خود کو ''لارڈ یہاواہ'' کے محبوب بیٹے سمجھتے تھے' سخت شرمندگی اور بے عزتی محسوس کرنے لگے۔ مشرکین نے حملے سے پہلے اپنے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اوران سے فتح کی دعائیں وصول کر کے ادھر قدم بڑھائے تھے' کہاں 15000 افراد مشتمل تربیت یافتہ فوجی سپاہ اور کہاں وہ چند سو مسلمان' جن کا انگلیوں پر بھی شمار ہو سکتا تھا!!۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کے دلوں میں ذرہ برابر اس بھاری دشمن کا خوف نہ تھا۔ کیونکہ وہ لذتِ ایمان سے سرشار تھے اور خدا نے آخری لمحوں میں اچانک ثبوت دے دیا کہ وہ ان کے ساتھ ہے۔ اور دشمن اس پورے ایک ماہ کی کوششوں کے باوجود انہیں نقصان پہنچائے بغیر پسپا ہو گیا۔

اگر یہودی دفاع مدینہ کے سلسلے میں مسلمانوں کے ساتھ کیئے ہوئے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے مشرکین کے اتحادی نہ بن جاتے تو اس حملے کی نوبت ہی نہ آتی اور نہ ہی مشرکین کے اندر اپنے طور پر کوئی دم خم تھا' یہودیوں ہی نے انہیں اکسایا اور اندر سے حمایت کرنے کا یقین دلا کر ان کا حوصلہ بڑھایا۔ یہودی یہ شیخی بھی بگھارا کرتے تھے کہ قریش فنِ حرب سے بالکل نا آشنا ہیں' انہوں نے کبھی ہم سے پنجہ آزمائی کی تو ہم انہیں خوب سبق سکھائیں گے اور یہ جنگ بھی ان کی معاہدہ شکنی کا نتیجہ تھی۔ بالآخر انہیں خود ہی یہ سبق سیکھنا پڑ گیا کہ ہم نے مسلمانوں کی طاقت کے اصل راز کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ یہاں یہودیوں کے اس زعم کا ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ وہ سمجھتے تھے کہ خداوند ''یہاواہ'' ان کے ساتھ ہے اور وہ صرف (Exclusivley) انہی کا خدا ہے۔ مزید برآں یہ کتاب استثناء (Deuteronomy) میں لکھا ہوا ہے:

''وہ نبی یا خواب دیکھنے والا قتل کیا جائے گا کیونکہ اس نے تم کو تمہارے خداوند خدا سے بغاوت کرنے کی ترغیب دی'' (5:13) اور پھر اسی کتاب کے باب 18' آیات 20-22 میں لکھا ہوا ہے۔ ''لیکن جو نبی گستاخی کرتے ہوئے کوئی ایسی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا' یا اور معبودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ جو بات خداوند نے نہیں کہی ہے' اسے ہم کیسے پہچانیں۔ تو پہچان یہ ہے کہ جب وہ خداوند

کے نام سے کچھ کہے اور اس کے کہے کے مطابق کچھ واقع پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں بلکہ اس نبی نے وہ بات خود گستاخ بن کر کہی ہے تو اس سے خوف نہ کرنا"

"ایسا نبی تلوار سے قتل کر دیا جائے گا"...... یرمیاہ باب 14: آیات 14' 15۔

یہودی' ان فیصلوں کی بنا پر' حضرت عیسیٰؑ کو صحیح نبی نہیں مانتے اور نہ ان کے کسی دعوے کو درست تسلیم کرتے ہیں' لیکن یہی فیصلے یا فرمان' یہودیوں کے لیے یہ دعوت ہیں کہ وہ حضرت محمدؐ پر ایمان لائیں اور انہیں سچا نبی تسلیم کریں' کیونکہ ان کی تمام خفیہ سازشیں جو آپؐ کو نقصان پہنچانے کے لیے تیار کی گئی تھیں' ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں اور نہ ہی جنگ میں یہاواہ نے ان کا ساتھ دیا اور نہ ان کی کوئی مدد کی۔ لیکن واقعات کی گواہی یہ ہے کہ خدا حضرت محمدؐ کے ساتھ تھا جو صحیح معنوں میں "عمانوئیلِ موعود" تھے اور یہودیوں کو پہلے مدینہ سے اور پھر جزیرہ نمائے عرب سے بھی بھاگ جانا پڑا۔

حضرت عیسیٰ نے نام لے کر پیشنگوئی کی

قرآن مجید نے حضرت محمدؐ کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ کی پیشگوئی ان الفاظ میں بیان کی ہے:

وَاِذْقَالَ عِیسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیلَ اِنِّی رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَابَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰاۃِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ فَلَمَّا جَآءَ ھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ وَھُوَ یُدْعٰٓی اِلَی الْاِسْلَامِ ط وَاللّٰہُ لَایَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔

(اور جب عیسیٰ ابن مریم نے یہ بات کہی تھی "اے بنی اسرائیل' میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں' تصدیق کرنے والا ہوں اس توراۃ کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں' ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام محمد۔ (تعریف کیا گیا) ہو گا۔ مگر جب وہ کھلی کھلی نشانیاں لے کر آ گیا تو انہوں نے کہا یہ تو صریح دھوکہ ہے۔ اب بھلا اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا

جو اللہ پر بہتان باندھے حالانکہ اسے اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا.....سورۃ الصف آیات 6-7)

ان آیات میں ذیل کے 15 نقاط ہیں۔

(1) ''اور جب''......ان واقعات کی اہمیت بتاتا ہے جب یہ الفاظ کہے گئے تھے۔

(2) ''عیسیٰ ابن مریم نے یہ بات کہی''......سے مراد یہ ہے کہ یہ بات جس نے کہی وہ عیسیٰ یعنی یسوع مسیح تھے جن سے تم بے حد محبت کرتے ہو اور بے پناہ احترام کرتے ہو۔

(3) ''ابن مریم'' کے معنی ہیں ایک صداقت شعار خاتون کا بیٹا۔

(4) ''اے بنی اسرائیل''......'یہاں بنی اسرائیل سے مراد ہے' راستباز اور سچے لوگ......

(5) ''میں خدا کی طرف بھیجا ہوا' اللہ کا رسول ہوں''......ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ پیغام کسی شخص کے ذاتی عقیدے کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے تمہاری طرف بھیجا ہوا پیغام ہے۔

(6) ''میں تمہاری طرف پہلے سے آئی ہوئی بات یا پیغام کی تصدیق کر رہا ہوں''......یہ پیغام پہلے آئے ہوئے ہر نبی کے پاس آچکا تھا' خواہ وہ دنیا کے جس خطے میں گزرا ہو۔

(7) ''میں تصدیق کر رہا ہوں......توراۃ کی''......تورات قسم کی تقریباً ہر کتاب میں خدا کا یہ پیغام ریکارڈ ہو چکا ہے۔

(8) ہمارا خدا صداقتِ مجسم ہے اور یہ پیغام اُس کی طرف سے بھیجی گئی اس ''روحِ حق'' (spirit of Truth) کی آمد کے بارے میں ہے۔

(9) یہ پیشنگوئی ایک' صداقتِ کامل ہے کیونکہ ہر عالمی معلّم نے پیغمبر اسلام کی آمد کی پیشنگوئی کی تھی۔

(10) ''اور ایک پیغمبر کے آنے کی بشارت''......یہ بشارت اس وقت دی گئی جب حضرت عیسیٰ اسرائیلیوں سے رخصت ہونے والے تھے۔ اور انہیں اپنے ساتھ پیش

آنے والے واقعات کا اندازہ غالباً ہو چکا تھا۔

(11) ''بشارت''......اس لفظ کے لیے سامی زبان کا مترادف لفظ بشریٰ ہے جس کے معنی ہیں اچھی چیز جو آنے والی ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ یسوع مسیح کے بعد سوائے ''محمدؐ'' کے' جن کے بارے میں تمام انبیاء نے وعدہ کیا تھا' کوئی پیغمبر نہیں آیا۔

(12) ''میرے بعد''......یہ الفاظ ایک بار پھر اس حقیقت پر زور دے رہے ہیں کہ یسوع مسیح کی آمد پر' علاقائی پیغمبری کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔

(13) ''میرے بعد'' کے الفاظ' یہ بھی بتاتے ہیں کہ یسوع مسیح کے بعد صرف اور صرف حضرت محمدؐ آ رہے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محمدؐ آخری نبی تھے جیسا کہ قرآن نے واضح طور پر کہا ہے (دیکھئے: سورۃ المآئدہ آیت 19)

(14) جس کا نام ''احمد'' ہے......''احمد'' کے معنی ہیں بہت تعریف کیا گیا شخص۔ حالات اور واقعات' اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ تمام تعریفوں کا مرکز آپ ہی کی ذات ہو سکتی ہے۔

(15) ''جب وہ کھلی کھلی نشانیاں لے کر آ گیا''......یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ وہی آیا' جس کی آمد کی سب انبیاء نے خوشخبری دے رکھی تھی۔ دنیا بھر کی مذہبی کتابوں نے جو جو اوصاف بتائے تھے' حضرت عیسیٰ نے ان کی بھی تصدیق کی اور نام لے کر بتایا کہ ان اوصاف کا حامل ''احمد'' ہے جو آ رہا ہے۔

بائبل میں بار بار حضورؐ کی بعثت کی پیشگوئی موجود ہے' توراۃ اور انجیل میں حسبِ ذیل مقامات پر آپؐ کی آمد کی متعلق اشارات موجود ہیں۔

استثناء باب 18' آیات 15 تا 19؛ متی باب 21 آیات 33 تا 46؛ یوحنا باب 1' آیات 10 تا 21؛ یوحنا باب 14 آیات 15 تا 17؛ یوحنا باب 15 آیات 25' 26؛ یوحنا باب 16 آیات 7 تا 15۔

انجیل یوحنا کی عبارات

اب وہ پیشگوئیاں دیکھئے جو انجیل یوحنا میں باب 14 سے باب 16 تک مسلسل منقول

ہوئی ہیں۔

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار (COMFORTER) بخشے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے' یعنی روحِ حق' جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ وہ اسے نہ دیکھتی ہے اور نہ جانتی ہے۔ تم اسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے اور تمہارے اندر ہے۔ (14:16-17)

"میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں' لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا' وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا" (14:25-26)

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں"...... (14:30)

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا روح' جو باپ سے صادر ہوتا ہے' تو وہ میری گواہی دے گا" (15:26)

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھا دے گا' اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا اس لیے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا" (16:12' 15)۔

انجیل کی زبان کے بارے میں ایک اہم نوٹ

ان عبارتوں میں وہ تسلسل اور وہ روانی نظر نہیں آتی جن سے عام اردو دان طبقہ مانوس ہے۔ اسی لیے ان کے معنی متعین کرنے میں بھی خاصی دشواری پیش آتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں اہلِ فلسطین کی عام زبان آرامی زبان کی وہ مخصوص بولی (Dialect) تھی جسے سریانی یا "سیریک" کہا جاتا تھا۔ ان سے تقریباً تین سو سال پہلے سلوقی (Selucide) کے زمانۂ اقتدار میں عبرانی زبان ختم ہو گئی تھی اور اس جگہ سریانی نے لے

لی تھی۔ اگر چہ سلوقی اور پھر رومی سلطنتوں کے اثر سے یونانی بھی اس علاقے میں پہنچ گئی تھی مگر وہ صرف اس طبقے تک محدود رہی جو سرکار دربار میں پہنچ کر' وہاں اثر و رسوخ پانے کی خواہش کی وجہ سے یونانیت زدہ ہو گیا تھا۔ فلسطین کے عام لوگ سریانی کی ایک خاص بولی بولتے تھے جس کے لہجے اور تلفظات اور محاورات دمشق کے علاقے میں بولی جانے والی سریانی سے مختلف تھے اور اس ملک کے عوام یونانی زبان سے اس قدر ناواقف تھے کہ جب 70 عیسوی میں رومی جنرل ٹائیٹس نے یروشلم پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے عوام سے یونانی زبان میں خطاب کیا تو اس کا ترجمہ سریانی زبان میں کرنا پڑا۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے شاگردوں سے جو کچھ کہا تھا' وہ لامحالہ سریانی زبان میں ہی ہوگا۔ دوسری اہم بات جو جاننا ضروری ہے یہ ہے کہ بائبل کی چاروں انجیلیں ان یونانی بولنے والے عیسائیوں نے لکھی ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد اس مذہب میں داخل ہوئے تھے۔ ان تک حضرت عیسیٰؑ کے اقوال کسی تحریری صورت میں نہیں بلکہ زبانی روایات کی شکل میں پہنچے تھے' ان روایات کو مصنفین نے پھر اپنی زبان میں ترجمہ کر کے اناجیل میں درج کیا۔ ان میں سے کوئی انجیل بھی 70 عیسوی سے پہلے کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ اور انجیل یوحنا تو حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی بعد ایشیائے کوچک کے شہر افسس میں لکھی گئی۔ مزید برآں ان انجیلوں کا کوئی بھی نسخہ اس یونانی زبان میں محفوظ نہیں ہے جس میں یہ ابتداءً لکھی گئی تھیں۔ پرنٹنگ کا دور شروع ہونے سے پہلے کے جتنے یونانی مسودات جگہ جگہ سے تلاش کر کے جمع کیے گئے ان میں سے کوئی بھی چوتھی صدی سے پہلے کا نہیں۔ اس لیے یہ کتنا مشکل ہے کہ تین صدیوں کے دوران ان کے اندر کیا کچھ ردو بدل ہوا ہوگا۔ اس معاملے کو جو چیز خاص طور پر مشتبہ بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ عیسائی اپنی انجیلوں میں اپنی پسند کے مطابق دانستہ تغیر و تبدل کرنے کو بالکل جائز سمجھتے رہے ہیں انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کے مضمون بائبل کا مصنف لکھتا ہے:۔

''اناجیل میں ایسے نمایاں تغیرات دانستہ کیے گئے ہیں جیسے مثلاً بعض پوری کی پوری عبارتوں کو کسی دوسرے ماخذ سے لے کر شامل کر دینا...... یہ تغیرات صریحاً کچھ ایسے لوگوں نے قصداً کیے ہیں جنہیں اصل کتاب کے اندر شامل کرنے کے لیے کہیں سے کوئی مواد مل گیا اور وہ اپنے آپ کو اس کا مجاز سمجھتے رہے کہ کتاب کو بہتر یا مفید

بنانے کے لیے اس کے اندر اس کا مواد کا اضافہ کر دیں.....ایسے بہت سے اضافے دوسری صدی ہی میں ہو گئے تھے اور کچھ نہیں معلوم کہ ان کا ماخذ کیا تھا۔"

اس صورت حال میں قطعی طور پر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انجیلوں میں حضرت عیسیٰؑ کے جو اقوال ملتے ہیں وہ بالکل ٹھیک نقل ہوئے ہیں اور ان کے اندر کوئی ردوبدل نہیں ہوا۔

دنیا کا سردار / فارقلیط یا منحمنا

مندرجہ بالا تاریخی حقائق کو نگاہ میں رکھنے کے بعد انجیل یوحنا کی متذکرہ عبارات میں حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے سنائی گئی اپنے بعد آنے والے ''ایک'' کی خبر پر غور کیجئے جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ ''دنیا کا سردار'' ہو گا' ''ابد تک'' رہے گا' ''سچائی کی تمام راہیں دکھائے گا'' اور خود ان کی (یعنی حضرت عیسیٰؑ) گواہی دے گا۔ یوحنا کی ان عبارتوں میں ''روح القدس'' (HOLY GHOST) اور ''سچائی کی روح'' (SPIRTI OF TRUTH) وغیرہ الفاظ شامل کر کے مدعا خبط کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے مگر اس کے باوجود ان سب عبارتوں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس آنے والے کی خبر دی گئی ہے وہ کوئی روح نہیں بلکہ کوئی انسان اور خاص شخص ہے جس کی تعلیم عالمگیر' ہمہ گیر اور قیامت تک رہنے والی ہو گی۔ اس شخص خاص کے لیے اردو ترجمے میں ''مددگار'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یوحنا کی اصل انجیل میں یونانی زبان کا جو لفظ استعمال کیا گیا تھا اس کے بارے میں عیسائیوں کا اصرار ہے کہ وہ فارقلیط (Paracletos) تھا مگر اس کے معنی متعین کرنے میں خود عیسائی علما کو سخت زحمت پیش آئی ہے۔ اصل یونانی زبان میں ''Paraclete'' کے کئی معنی ہیں۔ کسی جگہ کی طرف بلانا' ڈرانا' تنبیہ کرنا' ترغیب دنیا' اکسانا' التجا کرنا دعا مانگنا' تسلی دینا' تسکین بخشنا اور ہمت افزائی کرنا۔ بعض لوگوں نے ٹیچر' بعض نے وکیل اور بعض نے مددگار معنی کیے ہیں۔ (ملاحظہ ہو سائیکلو پیڈیا آف ببلیکل لٹریچر میں لفظ پیراکلیٹس) مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ یونانی زبان ہی میں ایک دوسرا لفظ ''Periclytos'' موجود ہے جس کے معنی ہیں ''تعریف کیا ہوا'' یہ لفظ بالکل ''محمد'' کا ہم معنی ہے اور تلفظ میں اس کے اور ''Paracletus'' کے درمیان بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ کیا بعید ہے کہ جو مسیحی حضرات اپنی مذہبی کتابوں میں اپنی مرضی اور پسند کے مطابق

بے تکلف ردو بدل کر لینے کے عادی رہے ہیں' انہوں نے یوحنا کی نقل کردہ پیش گوئی کے اس لفظ کو اپنے عقیدے کے خلاف پڑتا دیکھ کر اس کی املا میں یہ ذرا سا تغیر کر دیا۔ اس کی پڑتال کرنے کے لیے یوحنا کی لکھی ہوئی ابتدائی یونانی انجیل کہیں بھی موجود نہیں ہے جس سے یہ تحقیق کی جا سکے کہ وہاں دونوں الفاظ میں سے دراصل کونسا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔

منحمنا:

مگر فیصلہ اس سے نہیں ہو سکتا کہ یوحنا نے یونانی زبان کا کون سا لفظ استعمال کیا تھا' کیونکہ وہ بھی بہر حال ترجمہ ہی تھا جو حضرت مسیحؑ کی' فلسطین کی سریانی زبان تھی' اس لیے انہوں نے اپنی بشارت میں جو لفظ استعمال کیا ہو گا وہ لامحالہ سریانی لفظ ہی ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے وہ سریانی لفظ ہمیں ابن ہشام کی ''سیرت'' میں مل جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی اسی کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ہم معنی یونانی لفظ کیا ہے۔ محمد بن اسحاق کے حوالہ سے ابن ہشام نے یُحنّس (یوحنا) کی انجیل کے باب 15' آیات 23 تا 27 اور باب 16' آیت نمبر ا کا پورا ترجمہ نقل کیا ہے اور اس میں یونانی ''فارقلیط'' کی بجائے سریانی زبان کا لفظ ''منحمنا'' استعمال کیا گیا ہے۔ پھر ابن اسحاق یا ابن ہشام نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ ''منحمنا'' کے معنی سریانی میں ''محمد'' اور یونانی میں ''برقلیطس'' ہیں۔ (ابن ہشام جلد اول 248) یہ صورت حال سامنے آ جانے سے اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حضرت عیسیٰؑ نے حضورؐ کا نام مبارک لے کر ہی آپؐ کے آنے کی بشارت دی تھی اور ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یوحنا کی انجیل میں دراصل ''لفظ ''PERICLYTOS'' استعمال ہوا تھا جسے مسیحی حضرات نے بعد میں کسی وقت ''PARACLETUS'' سے بدل دیا۔

شاہ حبشہ کی شہادت:

مسلمانوں نے اپنی پہلی ہجرت حبشہ کی طرف کی تھی' پیچھے قریش کا وفد بھی ان کا تعاقب کرتا ہوا وہاں جا پہنچا اور اس نے ان کے لیے وہاں پریشانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نجاشی' شاہ حبشہ نے دونوں فریقوں کو بلایا اور ان کا موقف سنا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی

روایت ہے کہ جب نجاشی نے حضرت جعفر بن ابی طالب سے رسول اللہ کی تعلیمات سُنیں تو اس نے کہا..... ''مرحبا تم کو اور اس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہ وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں اور وہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ ابن مریم نے دی تھی۔'' اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں نجاشی کو یہ معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰؑ ایک نبی کی پیشین گوئی کر گئے ہیں بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس نبی کی ایسی صاف نشاندہی انجیل میں موجود تھی جس کی وجہ سے نجاشی کو یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا کہ محمد ﷺ ہی وہ نبی ہیں۔ البتہ اس روایت سے یہ معلوم ہوتا کہ حضرت عیسیٰؑ کی اس بشارت کا ذریعہ معلومات یہی انجیلِ یوحنا تھی یا کوئی اور ذریعہ بھی اس کو جاننے کا اس وقت موجود تھا۔

انجیل برنباس

نبی اکرمؐ کے بارے میں پیشین گوئیوں کے سلسلہ میں انجیل برنباس کی شہادت پیش کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے برنباس کا تعارف کرا دیا جائے۔ تاکہ اس کی لکھی ہوئی انجیل کی اہمیت معلوم ہو جائے اور اس سے عیسائی حضرات کی ناراضگی کی وجہ بھی معلوم ہو جائے۔

بائبل میں جو چار انجیلیں معتبر اور قانونی (Canonical Gospels) قرار دے کر شامل کی گئی ہیں ان میں سے کسی کا لکھنے والا بھی حضرت عیسیٰؑ کا صحابی نہ تھا اور ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا کہ اس نے حضرت عیسیٰؑ کے صحابیوں سے حاصل کردہ معلومات اپنی انجیل میں درج کی ہیں اور جن ذرائع سے انہوں نے معلومات حاصل کی ہیں ان کا بھی کوئی حوالہ نہیں دیا جس سے پتہ چل سکے کہ راوی نے آیا خود وہ واقعات دیکھے اور اقوال سنے ہیں جنہیں وہ بیان کر رہا ہے یا ایک یا چند واسطوں سے اس تک یہ باتیں پہنچی ہیں۔ اس کے برعکس انجیل برنباس کا مصنف کہتا ہے کہ میں مسیح کے اوّلین بارہ حواریوں میں سے ایک ہوں' شروع سے آخر تک مسیحؑ کے ساتھ رہا ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھے واقعات اور کانوں سنے اقوال اس کتاب میں درج کر رہا ہوں۔ بات یہیں تک نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں وہ کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت خود مجھ سے فرمایا تھا کہ میرے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں ان کو صاف کرنا اور دنیا کے سامنے صحیح حالات لانا تیری ذمہ داری ہے۔

جن چار اناجیل کو معتبر اور قانونی قرار دیا گیا ہے ان کی بے ربط داستانوں کے مقابلے میں برنباس کی انجیل کہیں زیادہ مربوط ہے اور اس میں حضرت عیسیٰؑ کے حالات اور تعلیمات بہت مفصل اور موثر طریقے سے بیان کی گئی ہیں۔ توحید کی تعلیم' شرک کی تردید'

صفاتِ باری تعالیٰ' عبادات کی روح اور اخلاقِ فاضلہ کے مضامین بڑے ہی پُر زور اور مدلّل طریقے سے بیان کیے گئے ہیں۔ واقعات اتنے صحیح انداز میں لکھے گئے ہیں کہ ان میں اُن تضادات کا نام ونشان تک نہیں ہے جو اناجیل اربعہ میں بہت نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

کلیسا نے پہلے تو اسے مشکوک الصحت قرار دیا اور پھر اسے چھپانے کا اتنا بڑا اہتمام کیا کہ یہ صدیوں ناپید رہی۔ سولھویں صدی میں اس کے اطالوی ترجمے کا صرف ایک نسخہ پوپ سکسٹس (Sixtus) کی لائبریری میں پایا جاتا تھا اور کسی کو اس کو پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں وہ ایک شخص جان ٹولینڈ کے ہاتھ لگا' پھر مختلف ہاتھوں میں گشت کرتا ہوا 1738ء میں دی آنا کی امپیریل لائبریری میں پہنچ گیا۔ اِدھر 1907ء میں اسی نسخے کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ کے کلیرنڈن پریس سے شائع ہوگیا تھا۔ مگر اس کی اشاعت کے بعد فوراً ہی عیسائی دنیا میں یہ احساس پیدا ہوگیا کہ یہ کتاب تو اس مذہب کی جڑ کاٹے دے رہی ہے جسے حضرت عیسیٰؑ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے مطبوعہ نسخے کسی تدبیر سے غائب کر دیئے گئے اور پھر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ دوسرا ایک نسخہ اسی اطالوی ترجمہ سے اسپینی زبان میں منتقل کیا ہوا اٹھارویں صدی میں پایا جاتا تھا جس کا ذکر جارج سیل نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے مقدمے کیا ہے مگر وہ بھی کہیں غائب کر دیا گیا۔ اور آج بھی اس کا کوئی نام ونشان نہیں ملتا۔ مسیحی لٹریچر میں جہاں کہیں اس کا ذکر آتا ہے اُسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برناباس سے منسوب کر دیا ہے لیکن یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جو صرف اس بنا پر بول دیا جاتا ہے کہ اس میں جگہ جگہ بڑی صراحت سے نبی اکرمؐ کے متعلق پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔ اوّل تو اس انجیل کو پڑھنے ہی سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کسی مسلمان کی تصنیف کردہ نہیں ہو سکتی' دوسرے اگر یہ مسلمان نے لکھی ہوتی تو مسلمانوں میں بکثرت پھیلی ہوئی ہوتی۔ اور علمائے اسلام میں کی تصانیف میں اس کا اکثر ذکر ملتا۔ مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ جارج سیل کے انگریزی ترجمہ قرآن کے مقدمے سے پہلے مسلمانوں کو سرے سے اس کے وجود تک کا علم نہ تھا۔

طبری' یعقوبی' مسعودی' البیرونی' ابن حزم' ابن تیمیہ اور دوسرے مصنفین جو

مسلمانوں میں مسیحی لٹریچر پر وسیع اطلاع رکھتے تھے' ان میں سے کسی کے ہاں بھی عیسائیت پر بحث کرتے ہوئے انجیل برنباس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ دنیائے اسلام کے کتب خانوں میں جو کتابیں پائی جاتی تھیں ان کی بہترین فہرستیں (Catalogues) ابن ندیم کی ''الفھرست'' اور حاجی خلیفہ کی ''کشف الظنون'' ہیں وہ بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے کسی مسلمان عالم نے انجیل برنباس کا نام تک نہیں لیا۔ اس بات کے جھوٹ ہونے کی تیسری اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ نبیؐ کی پیدائش سے بھی پچھتر سال پہلے پوپ گلاسئیس اول کے زمانے میں بدعقیدہ اور گمراہ کتابوں کی جو فہرست مرتب کی گئی تھی اور ایک پاپائی فتوے کے ذریعہ جن کا پڑھنا ممنوع قرار دیدیا گیا تھا ان میں انجیل برنباس بھی شامل تھی۔ اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت کونسا مسلمان موجود تھا جس نے یہ جعلی انجیل لکھ ماری تھی؟۔

انجیل برنباس تمام پچھلے انبیاء اور کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور صاف کہتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے سوا معرفتِ حق کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے اور جو کوئی انبیاء کو چھوڑتا ہے وہ دراصل خدا کو چھوڑتا ہے' یہ توحید' رسالت اور آخرت کے ٹھیک وہی عقائد پیش کرتی ہے جن کی تعلیم تمام انبیاء نے دی ہے۔

انجیل برنباس نے یہودیوں اور عیسائیوں کی اس غلطی کو بھی درست کیا ہے کہ انہوں نے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کو انبیاء کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے اور حضرت اسماعیل کی بجائے زبردستی کھینچ تان کر حضرت اسحاقؑ کو ذبیح قرار دیا ہوا ہے۔ اس انجیل کو غیر مسلّم کتابوں میں اس لئے شامل کیا گیا ہے کہ اس کا مصنف کتاب کے آغاز ہی سے اپنا مقصد تصنیف یہ بیان کرتا ہے کہ ''ان لوگوں کے خیالات کی اصلاح کی جائے جو شیطان کے دھوکے میں آکر یسوع کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں' ختنہ کو غیر ضروری ٹھہراتے ہیں اور حرام کھانوں کو حلال کر دیتے ہیں۔

حضرت محمدؐ کے بارے میں بشارت

رسول ﷺ کے بارے میں برنباس نے حضرت عیسیٰؑ کی جو بشارتیں بیان کی ہیں

ان میں کہیں حضرت عیسیٰؑ حضور اکرمؐ کا نام لیتے ہیں اور کہیں "رسول اللہ" کہتے ہیں۔ کہیں آپؐ کے لئے "مسیح" کا لفظ استعمال کرتے ہیں کہیں "قابل تعریف" (Admirable) کہتے ہیں۔ کہیں صاف صاف ایسے فقرے ارشاد فرماتے ہیں جو کہ بالکل لا إلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ہم معنے ہیں۔ ایک جگہ حضرت عیسیٰؑ کا یہ ارشاد دیا گیا ہے:

"تمام انبیاء جن کو خدا نے دنیا میں بھیجا' جن کی تعداد ایک لاکھ 44 ہزار تھی۔ انہوں نے الہام کے ساتھ بات کی مگر میرے بعد تمام انبیاء اور مقدس ہستیوں کا نور آئے گا جو انبیاء کی کہی ہوئی باتوں کے اندھیرے پر روشنی ڈال دے گا کیونکہ وہ خدا کا رسول ہے" (باب 17)

برناباس لکھتا ہے کہ ایک موقع پر شاگردوں کے سامنے حضرت عیسیٰؑ نے بتایا کہ میرے ہی شاگردوں میں سے ایک (جو بعد میں یہوداہ سکروتی نکلا) مجھے تیس سکوں کے عوض دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر دے گا پھر فرمایا:۔

اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ جو مجھے بیچے گا وہی میرے نام سے مارا جائے گا' کیونکہ خدا مجھے زمین پر سے اوپر اٹھا لے گا اور اس غدّار کی صورت ایسی بدل دے گا کہ ہر شخص یہ سمجھے گا کہ وہ میں ہی ہوں تاہم جب وہ ایک بُری موت مرے گا تو ایک مدت تک میری تذلیل ہوتی رہے گی۔ مگر جب محمدؐ، خدا کا مقدس رسول آئے گا تو میری وہ بدنامی دور کر دی جائے گی اور خدا یہ اس لئے کرے گا کہ میں نے اس مسیح کی صداقت کا اقرار کیا ہے' وہ مجھے اس کا یہ انعام دے گا کہ لوگ یہ جان لیں گے کہ میں زندہ ہوں اور اس ذلت کی موت سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے (باب 113)

"شاگردوں سے حضرت عیسیٰؑ نے کہا' بے شک میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر موسیٰؑ کی کتاب میں سے صداقت مسخ نہ کر دی گئی ہوتی تو خدا ہمارے باپ کو ایک دوسری کتاب نہ دیتا۔ اور اگر داؤد کی کتاب میں تحریف نہ کی گئی ہوتی تو خدا مجھے انجیل نہ دیتا۔ کیونکہ خداوند ہمارا خدا بدلنے والا نہیں ہے اور اس نے سب انسانوں کو ایک

ہی پیغام دیا ہے۔لہٰذا جب اللہ کا رسول آئے گا تو وہ اس لئے آئے گا کہ ان ساری چیزوں کو صاف کر دے اور جن سے بے خدا لوگوں نے میری کتاب کو آلودہ کر دیا ہے......(باب 124)

Nigarshat Best Sellers

کتاب کے بارے میں

قارئین! یہ کوئی معمولی کتاب نہیں بلکہ قرآن حکیم کی اس آیت کی عملی تفسیر ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے آخری نبی حضرت محمدؐ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: ''ہم نے تیرے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا ہے''۔ اس کتاب کا موضوع یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کے مطابق ذکرِ محمدؐ کا آوازہ کہاں کہاں اور کیسے کیسے بلند کیا۔ اگرچہ رحمۃ اللعالمینؐ کی شان کو بیان کر پانا انسانی استطاعت کے دائرے سے باہر ہے لیکن وہ عشق ہی کیا جو مجبوری و معذوری کو پاؤں کی زنجیر مان لے لہٰذا اس کتاب کا ہر صفحہ گواہی دیتا ہے کہ معروف مترجم و مؤلف محمد یحییٰ خان نے عشقِ رسولؐ کے جذبے سے سرشار ہو کر متعدد کتبِ سیرتؐ کے ہزاروں صفحات کھنگال کر تمام زمینی و آسمانی کتابوں اور صحائف میں پیغمبرِ آخر الزماںؐ کی ولادت و بعثت کی شہادتوں کو نہایت عرق ریزی سے یکجا و مربوط کر دیا ہے۔ اس تالیفی کارنامے کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے شاستر، یہودیوں کے صحیفے، عیسائیوں کی مذہبی کتب اور دیگر تمام عالمی مذاہب و مسالک کا تحریری مواد ایک عدیم النظیر اور کامل ترین ہستی کے ظہور کی بشارتیں جا بجا فراہم کرتا ہے جس کی بدولت انسانی اخلاق و حیات کو سنوارنا خالق کون و مکاں کی طرف سے مقدر ہو چکا تھا۔

جب عرب کی سرزمین پر خدا کے وعدے کے عین مطابق انسانیت کا انتظار ختم ہوا تو منظر بھی بدل گئے اور پس منظر بھی۔ شبلی نے کہا: ''توحید کا غلغلہ اٹھا، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اٹھا اور چمنستانِ سعادت میں بہار آ گئی''۔ ابوالکلام آزاد بولے: ''وہ خداوندِ قدوس جس نے سینا کی چوٹیوں پر کہا تھا کہ میں اپنی قدرت کی بدلیوں کے اندر آتشیں بجلیوں کے ساتھ آؤں گا اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ میرے جاہ و جلالِ الٰہی کی نمود ہوگی، بالآخر وہ آ گیا اور سعیر و فاران کی چوٹیوں پر اس کے ابرِ کرم کی بوندیں پڑنے لگیں۔ یہ سلسلۂ ترسیل و نزولِ صحف کا اختتام تھا۔ یہ سعادتِ بشری کا آخری پیغام تھا۔ یہ وراثتِ ارضی کی آخری بخشش تھی۔ یہ ختم المرسلین، رحمۃ اللعالمین محمدؐ بن عبداللہ کی ولادتِ باسعادت تھی''۔

امید ہے کہ قارئین اس عظیم اور شاندار کتاب کو پسند فرمائیں گے اور اچھوتے موضوعات پر معیاری کتب کی اشاعت کے ادارہ ''نگارشات'' کے قائم کردہ رجحان کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کریں گے۔ (ادارہ)

24 مزنگ روڈ، لاہور۔ پاکستان
Ph:0092-42-7322892 Fax:7354205
E-mail:nigarshat@yahoo.com